لسانی زاویے

پروفیسر غازی علم الدین

پروفیسر غازی علم الدین نے ایک ماہرِ لسانیات کی منطقی عقل کو استعمال میں لا کر اردو زبان کے متعدد لسانی زاویوں کو اس غرض سے مرکزِ توجہ بنایا ہے کہ اس کا عصری استعمال اظہاری اغلاط سے پاک ہو سکے۔ ان کے اس تحقیقی کام کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ اس کے زیرِ اثر نئے لکھنے والے ان غلطیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو مروجہ زبان کے ساتھ اکثر تحریروں میں عکس پذیر ہوئی ہیں۔ وحید الدین سلیم پانی پتی نے افاداتِ سلیم میں اردو زبان کی عصری ترقی کے لیے جو تجاویز دی تھیں ان کے نتیجے میں اسے لسانی امارت اور خود مختاری مل سکتی تھی۔ تاہم اردو زبان کے اجارہ داران کی اصلاحوں سے متفق نہ ہوئے اور دہلوی لکھنوی لسانی کھیل جاری و ساری رہا اور نیاز مندانِ لاہور بھی اس کھیل کا اٹوٹ حصہ بنے رہے۔ انھیں اپنی زبان لکھنے کے بجائے اہلِ زبان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو ازسرِ نو جوڑنا زیادہ مرغوب رہا۔ اہلِ زبان نے انھیں مانا کہ نہیں مانا لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ وہ بڑے زعموں سے منوائے گئے ہیں۔ پنجابی لکھنویت اور پنجابی دہلویت کے سلسلے اگر نمو پذیر ہوتے تو اردو زبان کو پنجابی زبان کی لوک دانش اور لوک لسانی روایت سے کھل کر استفادے کا موقع ملتا۔ یوں یہ زبان اپنی صدیوں پرانی پنجابی روایت سے ازسرِ نو جڑ جاتی۔ زندہ دلانِ لاہور نے اردو زبان کی لکھنوی اور دہلوی ماؤں کی گود میں سر رکھ کر سونے کی عادت سے انحراف نہ کیا۔ اکتسابِ زبان کے لیے زبان کے قاعدے کلیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کی مدد سے زبانی انجماد کو فروغ ملتا ہے۔ زندہ زبانیں ایک دوسرے کی رینج میں آنے والی مختلف زبانوں کی گرامر اور لفظیات سے متواتر استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ ابتدا ہی سے اردو زبان میں قاعدہ اختیاری اور لفظی تصرف کے بیش قیمت سلسلے رائج رہے ہیں۔ ان کی بدولت اس زبان نے ترقی اور بلندی کی اہم منزلیں طے کی ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین ایک درد مند دل رکھنے والے ماہرِ لسانیات ہیں۔ انھوں نے اردو کو صاف اور اجلا کرنے کے لیے جس محنت اور لگن کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔ انھوں نے سارے جہاں میں دھوم مچانے والی اردو کے لسانی تحفظ کا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید

پروفیسر غازی علم الدین

لسانی زاویے

پروفیسر غازی علم الدین

اشاعت : 2021

کتاب : لسانی زاویے

مصنّف : پروفیسر غازی علم الدین

ناشر : محمد عابد

تزئین : رانا رضوان

قیمت : 1000 روپے

مطبع : سلیم نواز پرنٹنگ پریس

Lisani Zaviey

By:

Prof. Ghazi Ilm-ud-deen

Cell: 0345-9722331

Edition - 2021

اهتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد

+92-41-2615359, 2643841, Cell:0300-6668284

E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم

صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

والدین مرحومین

کے نام

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا (القرآن:۱۷:۲۴)

(اے میرے پروردگار! ان پر رحمت فرما جیسا کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا)

Hasnain Sialvi

فہرست

لسانی زاویے

زبان کائنات کے اسرار میں سے ایک ہے۔اس کی تشکیل، ترویج اور ارتقا کے تمام پہلو کسی اَن دیکھے مگر مربوط نظام کے تحت نظر آتے ہیں۔ زبان کے اس داخلی اور مجرد نظام کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کی تشکیل کیسے ہوئی اور اس میں مرحلہ وار تبدیلیاں کیوں کر رونما ہوئیں؛ ان سب باتوں کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کے بارے میں یہ سب باتیں اندازوں اور قیاس پر مبنی ہیں کیوں کہ یہ تاریخ کے دھندلکوں میں پوشیدہ ہیں۔ البتہ ایک بات ہم سب دیکھ سکتے ہیں کہ ارتقا کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہر زبان ایک ٹھوس صورت اختیار کر لیتی ہے۔ زبان جو دراصل مختلف آوازوں کے مجموعے پر مشتمل ہوتی ہے، اپنی ٹھوس صورت میں حروف کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ زبان کے حروف، جنھیں ہم حروفِ تہجی بھی کہتے ہیں، کسی زبان کی آوازوں کی علامتی صورت ہوتے ہیں۔ یہی حروف زبان کے تجریدی نظام کو ایک ٹھوس شکل دیتے ہیں اور انھی کی مدد سے ہم زبان کو پہچانتے ہیں۔ انھی حروف کے ملاپ سے الفاظ اور الفاظ کے ملاپ سے جملے بناتے ہیں جو ہمارے مطمحِ نظر یا معنی کی ترسیل کرتے ہیں۔ زبان کی یہ صورت ہمیں کاغذ، سکرین یا کسی بھی سطح پر بصارت کی مدد سے دکھائی دیتی ہے اور زبان کی ایک ٹھوس شکل کا یقین دلاتی ہے۔

ایک عام آدمی شاید زبان کو اسی ٹھوس صورت میں دیکھتا اور سمجھتا ہے اور سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے دوران میں اس کی مختلف نوعیّتوں سے بھی واقف ہوتا ہے لیکن ایک ماہر زبان بہ خوبی جانتا ہے کہ زبان حروف کے مجموعے سے کہیں زیادہ ہے۔ زبان کا استعمال ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے۔ کسی بھی زبان کے الفاظ محض پیالے نہیں ہیں جو معنی کا شربت اٹھائے ہوئے ہیں اور ہر پینے والے کو یکساں سیراب کرتے چلے جاتے ہیں۔ معنی الفاظ کے اندر موجود کسی مستقل وجود کا نام نہیں ہے بلکہ ہر زبان کے الفاظ جتنی مرتبہ

بھی استعمال ہوتے ہیں، ہر مرتبہ معنی کو نئے سرے سے خلق کرتے ہیں۔ اس عمل میں صرف بولنے یا لکھنے والا ہی نہیں، بلکہ سننے یا پڑھنے والا بھی شامل ہوتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ صورتِ حال، ماحول اور موجود سیاق وسباق بلکہ تاریخی تناظر بھی معنی پیدا کرنے یا اخذ کرنے میں شامل ہوتے ہیں۔

معنی کی تخلیق کا یہ عمل اتنے تسلسل اور خاموشی سے ہوتا ہے جیسے گلاب کے پودے پر گلاب کا کھلنا۔ گلاب کے پودے پر ہر بار گلاب ہی کھلتا ہے مگر کون کہ سکتا ہے کہ یہ وہی بالکل وہی گلاب ہے جو اس سے پہلے کِھل چکا ہے۔ ہر پھول گلاب ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتا ہے اور ہر دیکھنے والے کے لیے ایک مختلف تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب بھی ہم کوئی لفظ دوسری، تیسری یا چوتھی بار استعمال کرتے ہیں تو ہر بار اس کے معنی وہی ہونے کے باوجود بالکل وہی اور اتنے نہیں ہوتے جتنے پہلے تھے۔ مخاطَب، معروضی حالات، داخلی کیفیات اور مقاصد و مدعا کے اعتبار سے اس معنی میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔

یوں ہم کہ سکتے ہیں کہ ہم زبان کو اس کی اوسط سطح پر رکھ کر دیکھتے اور اس کے بارے میں تعمیمی کلیے قائم کرتے ہیں۔ یہ عمل بھی انتہائی ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر ہم زبان سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان تعمیمی کلیوں کو زبان کے قواعد کہتے ہیں جن پر عمل درآمد کے نتیجے میں زبان کا ایک معیاری ڈھانچا قائم ہو جاتا ہے۔ معیار بندی کا یہ کام زبان استعمال کرنے والے عام لوگ، جو دراصل زبان تخلیق بھی کرتے ہیں، نہیں کرتے۔ یہ کام ماہرینِ زبان سرانجام دیتے ہیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ معیار بندی کرتے ہوئے بولی جانے والی زبان لکھی گئی زبان پر فوقیت رکھتی ہے۔

ماہرینِ زبان نہ صرف زبان کی معیار بندی کرتے ہیں بلکہ یہ معیار قائم رکھنے کے لیے اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ قائم ہو جانے والے لسانی ڈھانچے کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور زبان کو مسخ ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف وقت، حالات اور سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی تبدیلیوں کے نتیجے میں زبان کے استعمال میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں، وہ ان پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ زبان کا معیاری ڈھانچا کمزور نہ ہو اور فطری تبدیلیوں اور اور زبان کے معیاری ڈھانچے کے قیام میں توازن قائم رہے تاکہ زبان اپنی لسانی روایت سے منقطع نہ ہونے پائے۔

غازی علم الدین کا شمار بھی ایسے ہی ماہرین زبان میں ہوتا ہے جو زبان کے معیاری ڈھانچے کی حفاظت اور اسے مسخ کرنے والی تبدیلیوں کی نشان دہی کرنے پر مامور ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''لسانی زاویے''

ان کی ایسی ہی کوششوں پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین پاکستان اور بھارت کے معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اہلِ علم سے داد و تحسین پاتے رہے ہیں۔ اگر چہ یہ مضامین مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں مگر ان سب مضامین کی روح اور ان کا مقصد و مدعا ایک ہی ہے: زبان کی اصلاح اور اس کے غلط استعمال کی حوصلہ شکنی۔

اس مجموعے میں شامل تیس مضامین گذشتہ چند برسوں کے دوران میں لکھے گئے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر مضامین میں ان عام اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے جو ہماری روزمرہ بول چال ہی میں نہیں بلکہ رسمی تحریر و تقریر، حتیٰ کہ اردو نصابات تک میں راہ پا چکی ہیں اور ان میں سے کچھ تو اس طرح زبان و بیان میں رچ بس گئی ہیں کہ انھیں غلط ثابت کرنے کے باوجود زبان سے خارج کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان کا ذخیرۂ الفاظ بڑی حد تک عربی، فارسی اور ہندی جیسی زبانوں سے آیا ہے جن کا اثر ایک طویل عرصے تک اردو زبان پر ہوتا رہا ہے۔ اگر چہ ان تینوں کے علاوہ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اس میں شامل ہیں، مگر ان تین زبانوں کے الفاظ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ کئی لوگ اس بات پر اردو کو مطعون بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک مکمل اور خود مکتفی زبان نہیں ہے بلکہ محض دیگر زبانوں کے الفاظ کا مجموعہ ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک دیگر زبانوں کے الفاظ کا تعلق ہے تو اس سے دنیا کی کوئی بھی زبان پاک نہیں۔ انگریزی ہی کو دیکھ لیجیے۔ اس میں دخیل یعنی دوسری زبانوں سے مستعار لیے گئے الفاظ کی تعداد حیران کُن حد تک زیادہ ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، انگریزی کے تقریباً نصف الفاظ لاطینی زبان سے لیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ الفاظ براہِ راست لاطینی زبان سے آئے ہیں اور کچھ بالواسطہ طور پر فرانسیسی، المانی، اطالوی، ہسپانوی، یونانی اور پرتگالی سے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خود ان زبانوں کے کئی الفاظ بھی انگریزی میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی کے اپنے خاندان کی دیگر زبانوں سے آنے والے بہت سے الفاظ انگریزی کا حصہ بنتے ہیں۔ ان میں ولندیزی اور شمالی یورپ یعنی سکینڈے نیویائی ممالک مثلاً ڈینمارک، سویڈن اور ناروے میں بولی جانے والی زبانیں شامل ہیں۔ اس معاملے میں مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی دیگر زبانیں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں بلکہ روسی، عربی، فارسی، ہندی، اردو، بنگالی، ملاوی، چینی، مغربی افریقی، جاوائی، برازیلی، ہنگروی اور تاہیتی زبانوں کے کئی الفاظ انگریزی کا حصہ بن چکے ہیں اور مسلسل بنتے چلے جا رہے ہیں۔[1]

1- Albert C. Baugh, A History of the English Language (New York: Appleton Century-Crofts, 1963), P:9-10

انگریزی نے ان دخیل الفاظ کو قبول کرتے ہوئے ان کے تلفظ اور استعمال کی صورتوں میں ایسا تصرف کرلیا ہے کہ اب وہ الفاظ انگریزی ہی کے معلوم ہوتے ہیں اور انگریزی زبان کے قواعد کے پابند ہیں۔

اس معاملے میں ابھی اردو کے تمام علمائے زبان کو شرح صدر نہیں ہے کہ دیگر زبانوں کے الفاظ کو قبول کرتے ہوئے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ کچھ علما اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ جس زبان سے وہ الفاظ لیے گئے ہیں، اسی زبان کے قواعد کا اطلاق کیا جائے۔ یہ بات خاص طور پر عربی اور فارسی کے متعلق بڑے زور و شور سے کہی جاتی ہے کہ اردو میں آنے والے الفاظ و تراکیب جو اصلاً عربی یا فارسی سے تعلق رکھتے ہیں، انھیں عربی یا فارسی الفاظ سمجھتے ہوئے انھی زبانوں کے قواعد کے مطابق استعمال کیا جائے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل کے ہندوستان میں عربی اور فارسی زبانیں نہ صرف مقبول رہی ہیں بلکہ رسمی درس و تدریس سے لے کر تصنیف و تالیف تک عام استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ فارسی تو خیر انیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستان کی مرکزی سرکاری یا درباری زبان رہی ہے اور اردو پر اس کے اثرات عربی سے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔

۱۸۳۷ء میں انگریز سرکار نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت دی تو ہندوستان میں فارسی کے زوال کا عمل تیزی سے شروع ہوگیا اور فارسی کی جگہ بالائی سطح پر انگریزی اور نچلی سطح پر اردو زبان اہمیت حاصل کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف انتقام اور غیظ و غضب کی جو آگ حکم ران طبقے یعنی انگریز سرکار کے دل میں بھڑک رہی تھی، اس کا نشانہ وہ مکاتب اور مدارس بھی بنے جن میں عربی زبان ذریعۂ تعلیم تھی اور جہاں مسلمانوں کے روایتی علوم کی تدریس کی جاتی تھی۔ اس پورے عمل کے سیاسی و سماجی محرکات اور نتائج جو بھی ہوں، لسانی سطح پر ہندوستان میں عربی اور فارسی زبانوں سے بے اعتنائی کا رویہ عام ہوگیا جو بیسویں صدی میں اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی داخلی صورتِ حال کے تقاضے کچھ اور تھے چناں چہ فارسی اور عربی زبانیں پہلے کی سی حیثیت دوبارہ کبھی حاصل نہ کر پائیں۔ پنجاب میں ستّر کی دہائی تک چھٹی سے آٹھویں جماعت تک فارسی بطور لازمی مضمون پڑھائی جاتی تھی جس سے طلبہ فارسی زبان کے بنیادی قواعد سے بخوبی واقف ہوجاتے تھے اور فارسی اور اردو کے رشتے کو بھی سمجھنے کے لائق ہو جاتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے فارسی کو ختم کر کے عربی کو لازمی مضمون قرار دے دیا مگر عربی کے نصابات زبان کی تدریس سے زیادہ عربی ذخیرۂ الفاظ کی تعلیم تک محدود رہے اور طلبہ اردو اور عربی کے درمیان موجود لسانی رشتوں کی شناخت سے قاصر ہی رہے۔

اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ہر نئی آنے والی نسل، اردو زبان میں شامل عربی اور فارسی الفاظ کے لسانی پس منظر سے کلیتاً ناواقف ہوتی چلی گئی۔ یہی کلیہ سنسکرت الفاظ پر بھی لاگو ہوتا ہے لیکن چوں کہ نسبتاً سنسکرت الفاظ تعداد میں عربی اور فارسی الفاظ سے کم ہیں، اس لیے اس کا احساس بھی کم ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان میں اردو سیکھنے والے اس ''ذوقِ سلیم'' سے محروم ہو چکے ہیں جس کا غم زیرِ نظر کتاب میں جا بجا نظر آتا ہے۔

اگرچہ لسانیات کے جدید اصولوں کے مطابق دخیل الفاظ جس زبان کا حصہ بنتے ہیں، اسی کے قواعد کے تابع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کسی بھی زبان کے استعمال کرنے والوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تمام ماخذ زبانوں کے مزاج کو سمجھ کر دخیل الفاظ کو ماخذ زبانوں کے اصول کے مطابق استعمال کریں لیکن اگر انھیں ماخذ زبانوں کے بارے میں کچھ بنیادی علم ہو تو زبان کے استعمال میں وسعت، گہرائی اور لطف و انبساط کے ایسے ایسے پہلو منکشف ہو سکتے ہیں جو ماخذ زبانوں کو سمجھے بغیر کبھی محسوس نہیں ہو سکتے۔ افسوس کہ اردو بولنے والے اب فارسی، عربی اور سنسکرت جیسی زبانوں کے مزاج اور انفرادی پہلوؤں سے بالکل ناواقف ہیں۔

تاہم اردو کی اس زبوں حالی کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ حکومتی ترجیحات میں زبان کے مسئلے کو اہمیت نہ دینا، صوبائی سیاست، نسلی اور علاقائی تعصّبات اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں کی کثرت، جو سب کی سب بلاشبہ پاکستانی زبانیں ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر بہت اہمیت کی حامل ہیں مگر کسی ایک قومی زبان کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتیں، ان اسباب میں سے چند ایک ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کی ترقی اور گذشتہ چند برس میں سوشل میڈیا کی یلغار نے بھی زبان کی معیار بندی کو جس شدت سے متاثر کیا ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ اردو کا معیاری اور روایتی ڈھانچا تیزی سے بکھرتا نظر آ رہا ہے لیکن یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ کسی ایک ڈھانچے کے بکھر جانے سے زبان ختم نہیں ہو جاتی۔ پاکستان میں اردو کی اہمیت کم ہونے کے بجائے بڑھتی نظر آتی ہے۔ انگریزی کے ٹیلی ویژن چینل جس طرح دیکھتے ہی دیکھتے اردو چینل میں بدل جاتے رہے ہیں، یہ اس امر کی گواہی ہے کہ پاکستان کے عوام آج بھی اردو ہی کو باہمی رابطے اور عوامی اظہار کی زبان سمجھتے ہیں۔ اب سنا ہے کہ اعلیٰ سطحی یعنی مقابلے کے امتحانات بھی اردو میں لیے جانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور اردو کو پہلی سے بارھویں تک مکمل طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ اگر ان اعلانات پر عمل ہو جاتا ہے تو امید کی جانی چاہیے کہ جلد ہی اردو کی بہ حیثیت زبانِ تدریس کو وہ اہمیت ملنے لگے گی جس کی وہ حق دار ہے

اور اردو کے استعمال میں لاپروائی اور غفلت کا جو رویہ ان دنوں عام نظر آتا ہے، اس میں بھی بہتری پیدا ہونے کا امکان نظر آئے گا۔

پروفیسر غازی علم الدین نے اپنے ان مضامین میں اسی لاپروائی اور غفلت کی نشان دہی کی ہے اور کوشش کی ہے کہ اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی توجہ ان کوتاہیوں کی طرف مبذول کروائیں جو زبان کے استعمال میں بگاڑ پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو اب اس طرح زبان کا حصہ بن گئی ہیں کہ عام لوگ یا طالب علم ہی نہیں، جید اساتذہ اور علما کی تحریریں بھی ان سے خالی نہیں۔ ایسی غلطیاں جو نہ صرف ادبی و علمی بلکہ نصابی کتب میں بھی راہ پا لیں، ایک طرح سے زبان کا حصہ ہی بن جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ لغات میں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں ایسی کئی فاش اغلاط کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو بے معنی الفاظ پر مشتمل ہیں اور کبھی سہو کتابت تو کبھی محض لاپروائی سے زبان میں داخل ہو کر راہ پا گئی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ایسی اغلاط کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ ان کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے غلط استعمال کے اسباب اور نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ وہ زبان کے زوال اور انحطاط پر دکھی نظر آتے ہیں اور اردو سے محبت کرنے والے ہر شخص کی طرح دل سے چاہتے ہیں کہ نئی نسل اردو کے اس نفیس و شائستہ اسلوب سے آشنا ہو سکے جس میں ہر لفظ اپنے اندر تاریخی و ثقافتی تلازمات کا ایک جہان آباد کیے ہوئے نظر آتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں اس ''ذوقِ سلیم'' سے بھی بہرہ مند ہوں جو الفاظ میں پوشیدہ جہانِ معنی سے لطف اٹھانے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔

میرے خیال میں یہ کتاب اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اردو کی معیار بندی کی میزان فراہم کرتی ہے اور قواعد و ماخذ کے اعتبار سے زبان کے درست استعمال پر اصرار کرتی ہے۔ جہاں زبانوں کے ارتقا کے لیے ان میں آنے والی تبدیلیاں فطری ہوتی ہیں، وہاں معیاری زبان کے استعمال پر زور دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں قوتوں کے متوازن عمل ہی سے زبانیں فروغ اور ارتقا کا راستہ طے کرتی ہیں۔

ان مضامین کی زبان نہ صرف آسان اور عام فہم ہے بلکہ ادبیت کی حامل بھی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسے اقتباس ملتے ہیں جو ذہن کے پردے پر ایک متحرک اور رنگ رنگیلی تصویر بنا دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

''کسی ہفت رنگ ہیرے کو سورج کے سامنے کیا جائے اور بدل بدل کر اس کا ہر کونا،

شعاعوں کے برابر لایا جائے تو ہر رنگ اپنی بہار دیتا ہے۔ کہیں سے ارغوانی، کہیں سے عنّابی، کہیں سے سنہری، کہیں سے ازرقوانی، کہیں سے حنائی، کہیں سے بلّوریں اور کہیں سے احمریں عکس جھلکتا ہے۔ اسی طرح پیکرِ الفاظ بھی جہانِ معنی رکھتے ہیں۔ انھیں مختلف زاویوں اور جہتوں سے دیکھا اور پرکھا جائے تو رنگا رنگ معانی اور مفاہیم کا تنوع نظر آتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ دیکھنے والی نظر، لفظ کی گہرائی، اس کے مادے اور اشتقاق میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ الفاظ جو معنوی تنوع اور لطافت و نزاکت کا خزانہ ہوتے ہیں، نباتات و حیوانات کی طرح ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ پھولتے پھلتے ہیں اور گروہِ خاندانی بناتے ہیں۔''[۲]

اس اقتباس میں نہ صرف ادبی چاشنی پائی جاتی ہے بلکہ تمثیلی انداز میں ایک گہری حقیقت کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ الفاظ بھی ایک نامیاتی وجود کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے درمیان بھی باہمی ربط کی ایسی صورتیں نظر آتی ہیں جنھیں ایک گروہ یا خاندان کی صورت میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب میں املا، تلفظ، تراکیب اور محل استعمال کی جتنی اغلاط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر اس کتاب کو کسی نصاب کا حصہ بنا دیا جائے تو اردو کی معیار بندی کا یہ مشکل مرحلہ، جس سے ہماری قوم کئی دہائیوں سے نبرد آزما ہے، چند برسوں میں حل ہو جائے گا۔ میں اسے ایک طرح سے فرض کفایہ سمجھتی ہوں جو پروفیسر غازی علم الدین نے اردو کے تمام اساتذہ اور علما کی طرف سے سرانجام دیا ہے اور اس کاوش پر وہ نہ صرف داد و تحسین، بلکہ ہم سب کے شکریے کے بھی مستحق ہیں اور کم از کم میں یہ وعدہ ضرور کرتی ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اسے اپنی جامعہ کے زبان سے متعلق نصابات کا حصہ بنانے کی ضرور سفارش کروں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
ڈین کلیۂ زبان و ادب
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد
۲۹ مئی، ۲۰۲۱ء
۱۷ شوال، ۱۴۴۲ ہجری

۲۔ ''لاحقۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' کے جمالیاتی رنگ (لسانی تناظر میں)''، ص ۲۱۹

ایک صاحبِ بصیرت محقق کا لسانی معرکہ

پروفیسر غازی علم الدین کی تحقیقی بصیرت، اہلِ دانش و بینش کے لیے قابلِ صد تحسین ہے۔ انھوں نے زبان وادب کے متعدد مستور و کم بیں گوشوں کی نشان دہی بطریقِ احسن کی ہے۔ ان کا شمار ہمارے عہد کے محنتی اور جانفشاں دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین کی علمی و تحقیقی اپروچ کی بدولت کئی تشنگانِ علم وادب کی رہنمائی ہوئی ہے۔ وہ جس بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کی گہرائی و گیرائی ان کی گرفت میں رہتی ہے۔ ہماری ملی اور قومی ثقافت سے ان کی گہری دلچسپی ہے۔ انھوں نے بطور پاکستانی، اپنی ثقافتی شناخت کی بازیافت کے لیے چند اہم مقالے سپردِ قلم کیے ہیں۔ پاکستان کی مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی بنیادوں کی تفہیم و توضیح ان کا مرغوب موضوع رہا ہے۔ اردو زبان پاکستانی قوم کی شناخت کا ایک اہم مرکز ہے۔ اس کے تناظر میں ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کی ستائش ہوتی رہتی ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین نے اپنی کتاب کے جوہر کو ذیل کے الفاظ میں سمو دیا ہے:

> ''زبان، انسان کی سوچ اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ الفاظ ہماری آواز ہی نہیں ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات کی روح بھی ہوتے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے دوسروں تک اپنے دل کی دھڑکنیں پہنچاتے ہیں۔ ہر زمانے میں فُصحا و بُلَغا اور شُعَرا و اُدَبا کی ایک جماعت، معیاری اور غیر معیاری زبان میں فرق کرتی رہی ہے۔ فصیح و بلیغ اور شُستہ و شائستہ زبان کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اِس جماعت نے ہر دور میں، اپنی لسانی قابلیت اور ادبی صلاحیتوں کے ذریعے، اپنی اپنی زبانوں کا معیار بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ہمارے آج کے اُردو اساتذہ، شُعَراء، اہلِ نقد اور اُدَباء میں سے آٹے میں نمک کے برابر لوگ ہیں جو بے عیب

زبان لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں۔ بات سچ اور کڑوی ہے مگر سچ بات یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔‘‘

پروفیسر غازی علم الدین کے صائب خیالات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسلام، پاکستان اور اردو زبان سے جڑے افکار و تصورات کو نہ صرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ اپنے دائرۂ احباب میں اپنے ہم خیال افراد سے بھی قلبی اُنس رکھتے ہیں۔ اس دور میں جدید و مابعد جدید ہونے کے رسیا دانشوروں کی آزاد خیالی اور انتہا پسندی کی دھومیں مچی ہوئی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں ہر کس و ناکس ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے مغربی فکر و فلسفے کے عصری حوالوں کو جا و بے جا استعمال کرنے کو اپنا مطمحِ نظر بنا رہا ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین نے اس فیشنی اپروچ کی بے سود حقیقت کو جان کر اس راہِ پُرخار کو اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ انھوں نے مشرقی علوم و فنون کے قابلِ تقلید رستوں کو اپنانے کی دانستہ کاوشیں کی ہیں۔ جدیدیت کو حسن عسکری سے پہلے بھی بہت سے دانشوروں نے اپنی ملی اور قومی شناخت کے رستے میں حائل رکاوٹ کے بطور دیکھا ہے اور اس کے زیرِ اثر نمو پانے والی بگٹٹ آزادہ روی کو عقلی اور منطقی بنیادوں پر رد کیا ہے اور مشرقی فکر و فلسفہ کی روشنی میں اپنے تصورات و خیالات کے تانے بانے بنے ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین نے بھی اپنے اکابرین کی دکھائی ہوئی منزلوں کو اپنے لیے سودمند جانا ہے۔

اپنی زبان سے پیار اقوامِ عالم کا عمومی رجحان ہے۔ کوئی قوم اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ مقامی باشندے یا اجنبی ان کی السنہ کو بگاڑیں۔ اپنی السنہ کی حفاظت کے لیے پرانے زمانوں میں کئی نوع کے طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ ان کے بچے ان کی زبان کا درست استعمال کریں۔ وہ انھیں غلط اور صحیح کے دستور اور ضابطے بتاتے تھے۔ نئے دور میں بڑی زبانوں کے درست استعمال کے لیے ایسے سافٹ ویئر تیار ہو چکے ہیں کہ جو لفظوں اور جملوں کی مستند قواعدی حیثیت کے اشارہ کناں ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اردو زبان کے سلسلے میں ہمارے اساتذہ بہت حساس تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے طلبا غلط اردو لکھیں یا بولیں۔ پرائمری سے لے کر کم از کم میٹرک تک وہ طالبِ علموں کو دوٹوک انداز سے بتایا کرتے تھے کہ وہ زبان کے استعمال میں کیا غلطیاں کر رہے ہیں۔ افسوس! کہ اُردو زبان سے پیار کرنے والے ایسے محنتی اساتذہ اب کمیاب ہیں۔ کسی زبان کی خالص شکل کی وضاحت کے لیے غلط اور صحیح کے تناظر میں امتحانی پرچوں میں سوالات پوچھے جاتے تھے۔ اس لسانی صاف سازی کے نتیجے میں اعلیٰ اردو لکھی اور بولی جاتی تھی۔ پروفیسر غازی علم الدین نے درست اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے

کئی تحقیقی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ انھوں نے یہ مضامین کتابی شکل میں جمع کیے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اُردو زبان کی ان عمومی اور خصوصی غلطیوں کی نشان دہی ہوتی ہے جن کی وجہ سے اُردو کے عصری اظہاریئے مستند زبان سے معرّیٰ ہوتے جا رہے ہیں۔

کسی زبان کی درست تفہیم وتعبیر کے معاملات کی حد بندی جس نوع کی تحقیق کی متقاضی ہے اسے سائنسی تحقیق کا نام دیا گیا ہے۔ اس نوع کی تحقیق اس زبان کے قواعدی نظام کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ زبانی یعنی فلالوجیکل مطالعوں کو لسانی یعنی لینگوسٹک مطالعوں میں منتقل کرنے والے علم کو لسانیات کے علم کا نام دیا گیا ہے۔ لسانیات زبان کے قواعدی، صوتی، معنوی اور لفظی نظام کی منطقی، عقلی اور تجرباتی توضیح وتوجیہ سے گہرے طور پر مربوط علم کا نام ہے۔ زبان کے صوتی ومعنوی نظام کی پہچان کے بغیر اس کا صحیح روپ سامنے نہیں آتا۔ اردو زبان نے اپنے ارتقا کا عمل دیگر زبانوں کے شانہ بشانہ طے کیا ہے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد اردو زبان کے قواعد کو مرتب کرنے کا کام اس لیے بڑی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ اپنے سرکاری کارندوں کو مقامی زبانوں سے مانوس کرنا چاہتے تھے۔ اردو زبان کی ابتدائی قواعدی کتب ہی سے صحیح اور غلط کی پہچان کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس زبان کی موجودہ صورت، اسے صاف و شستہ کرنے کی کئی اصلاحی تحریکوں کی رہینِ منت ہے۔ اصلاحِ زبان کے مقدمے کی گہری رمزیں ہوں یا زبان کے درست استعمال کے قضیے کی جہتیں، ان کا اِحاطہ کرنے والے محقق اگر علمی عرق ریزی اور تجسسی جانفشانی سے کام نہ لیں تو لسانی قواعد کی صحیح صورتیں سامنے نہ آئیں۔

اردو زبان کی ادبی عمر چار پانچ صدیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں نے کثیر اللسانی سلاسل کی مدد سے حسب مقدور اپنے قواعد وضوابط کی حد بندیاں کرنے کا کام کیا ہے۔ ایسے میں غلط العوام اور غلط الخواص کے خود رو معاملوں کی اِفادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں اس زبان پر عربی، ترکی، فارسی، انگریزی، پرتگالی، فرانسیسی، ہندی، ماگدھی، ہریانوی، پنجابی، بنگالی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی اور کئی دوسری السنہ کے اثرات نے اسے بڑی تیزی سے ارتقا کی بالیدہ منزلوں پر لا کھڑا کیا ہے۔ عین الحق فرید کوٹی نے اردو زبان کے ڈانڈے قدیم دراوڑی زبانوں سے ملائے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اسے سنسکرت کے اثرات کے تحت وجود پانے والی زبانوں کا حاصلِ جمع سمجھا ہے۔ اردو کو پراکرتوں اور کھڑی بولی سے نمو پانے والی زبان بھی قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندہ زبانیں ہمہ وقت ارتقا کے عالم میں رہتی ہیں۔ ان کی مستند حیثیت کا تعین ان میں لکھے جانے والے ادب پاروں کا رہینِ منت ہے۔ اس امر سے مفر ممکن نہیں ہے کہ زمانی ومکانی لحاظ سے شعر وادب کے معاملے

انجماد سے ماورا ہوتے ہیں۔ان کی نمو میں حرکت کے اصول کا بڑا عمل دخل ہے۔'سب رس' سے لے کر 'آبِ گم' تک اردو زبان کے سیالی ارتقا کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔سلیمان ندوی نے خالص عربی زبان کے تحفظ کی بسیار کوششوں کے باوجود اس میں غیر ملکی لسانی اثرات کی نفی نہیں کی۔

پروفیسر غازی علم الدین نے ایک ماہر لسانیات کی منطقی عقل کو استعمال میں لا کر اردو زبان کے متعدد لسانی زاویوں کو اس غرض سے مرکزِ توجہ بنایا ہے کہ اس کا عصری استعمال اظہاری اغلاط سے پاک ہو سکے۔ان کے اس تحقیقی کام کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ اس کے زیرِ اثر نئے لکھنے والے ان غلطیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو مرورِ زماں کے ساتھ اکثر تحریروں میں عکس پذیر ہوئی ہیں۔وحیدالدین سلیم پانی پتی نے افاداتِ سلیم میں اردو زبان کی عصری ترقی کے لیے جو تجاویز دی تھیں ان کے نتیجے میں اسے لسانی امارت اور خودمختاری مل سکتی تھی۔تاہم اردو زبان کے اِجارہ داران کی اصلاحوں سے متفق نہ ہوئے اور دہلوی لکھنوی لسانی کھیل جاری وساری رہا اور نیازمندانِ لاہور بھی اس کھیل کا اٹوٹ حصہ بنے رہے۔اُنھیں اپنی زبان لکھنے کے بجائے اہلِ زبان کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو ازسرِ نو چچوڑنا زیادہ مرغوب رہا۔اہلِ زبان نے انہیں مانا کہ نہیں مانا لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ وہ بڑے زوروں سے منوائے گئے ہیں۔ پنجابی لکھنویت اور پنجابی دہلویت کے سلسلے اگر نمو پذیر ہوتے تو اردو زبان کو پنجابی زبان کی لوک دانش اور لوک لسانی روایت سے کھل کر استفادے کا موقع ملتا۔یوں یہ زبان اپنی صدیوں پرانی پنجابی روایت سے ازسرِ نو جڑ جاتی۔زندہ دِلانِ لاہور نے اردو زبان کی لکھنوی اور دہلوی ماؤں کی گود میں سر رکھ کر سونے کی عادت سے انحراف نہ کیا۔

اکتسابِ زبان کے لیے زبان کے قاعدے کلیے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کی مدد سے زبانی انجماد کو فروغ ملتا ہے۔زندہ زبانیں ایک دوسرے کی رینج میں آنے والی مختلف زبانوں کی گرامر اور لفظیات سے متواتر استفادہ کرتی رہتی ہیں۔ابتدا ہی سے اردو زبان میں قاعدہ اختیاری اور لفظی تصرف کے بیش قیمت سلسلے رائج رہے ہیں۔ان کی بدولت اس زبان نے ترقی اور بلندی کی اہم منزلیں طے کی ہیں۔پروفیسر غازی علم الدین ایک دردمند دل رکھنے والے ماہرِ لسانیات ہیں۔انھوں نے اُردو کو صاف اور اجلا کرنے کے لیے جس محنت اور لگن کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔انھوں نے سارے جہاں میں دھومنے والی اردو کے لسانی تحفظ کا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

اردو زبان میں موجود روزمرے اور محاورے زبان کو مجاز اور حقیقت کے درمیان رکھے ہوئے ہیں۔مرورِ زماں کے ساتھ ساتھ نئے محاورے اور روزمرے زبان میں شامل ہوتے رہنے چاہئیں۔اگر

ایسا نہیں ہوگا تو زبان محدود ہو کر رہ جائے گی۔ جس ادیب نے تلاش کرنا کی جگہ تلاشنا کا لفظ استعمال کرنے کا کام کیا تھا اس نے زبان میں مصدری اختصار کا رستہ کھولا تھا۔ لسانی جدتوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے سے زبان کے ان اصولوں کی نفی ہوتی ہے کہ جن کی بدولت زبان ارتقا کی منزلیں مارتی رہتی ہے۔ ویسے میرے خیال میں ''ارتقاتی ہے'' لکھنے سے میرے جملے میں ایسا اختصار پیدا ہوسکتا ہے کہ جس سے مانوس ہونے کے لیے نئی مصدر سازی کی متواتر کوششیں کارآمد ہوں گی۔ اس نوع کا کام لسانی تشکیلات کے زمرے میں راقم الحروف نے اپنی تخلیقات میں تسلسل کے ساتھ کیا ہے۔

نئی ٹیکنالوجی کی آمد سے نئے روزمرے اور محاورے وجود میں آرہے ہیں اور لوگ ان کا بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ تاہم ان میں کسی حد تک زبان کی مروّجہ مانوسی صوتی سانچوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ سیلفی لینا، فون کرنا، ڈرائیو کرنا، بریک لگانا، سپیڈ بڑھانا، لنچ کرنا، ڈنر کرنا، بریک فاسٹ کرنا اور اسی طرح کے لاتعداد الفاظ، مصادر، روزمرے اور محاورے اردو زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ تاہم سیلفیانا، فوننا، کالنا، ڈرائیونا، بریکنا، سپیڈنا، لنچنا، ڈنرنا، بریک فاسٹنا وغیرہ تاحال نامانوسیت کی بدولت رائج ہونے سے عاری ہیں اور شاید تادیر عاری رہیں۔ سیٹ چھوڑنا، ریزائن کرنا، سلیکٹ ہونا، میرٹ پر آنا، رپورٹ لکھنا، کیک کاٹنا، گیٹ کھولنا، موٹروے کا کھلنا یا بند ہونا، واک آوٹ کرنا، سپیکر آن کرنا، ڈائس پر آنا، مائیک سنبھالنا اور اسی نوع کے نئے اظہاریئے ہمارے میڈیا کی زینت بن چکے ہیں۔ نوجوان نسل سے میں نے ایسے محاورے سنے ہیں کہ جن کو بولنے کی جرأت کسی شریف آدمی میں نہیں ہے مثلاً وڑ گئے، وغیرہ۔ اسی طرح دھبڑ دوس کرنا یا ہونا، فالو کرنا، ٹوئیٹ کرنا، نیٹ ورک کرنا، پوسٹنگ کرنا، سرچ کرنا، فالوور ہونا، فلیش کرنا، ہارٹ اٹیک ہونا، مائنڈ آؤٹ ہونا، کرونا ہونا، ڈوز لینا، ویکسین کروانا، ماسک پہننا، ہینڈ یا ماؤتھ واش کرنا، جم جانا، کپ پینا، لپ اسٹک لگانا، بٹرنگ کرنا، انسٹرٹ کرنا، فارمیٹ کرنا، ایڈٹ کرنا، فائل کھولنا، ونڈ واوپن کرنا جیسے الفاظ و مرکبات ہمارے عمومی استعمال میں آرہے ہیں۔

پروفیسر غازی علم الدین نے اردو زبان کے مانوس حوالوں کی بنیاد پر اپنی کتاب کی علمی بنیادوں کو استوار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو کی شکل بگاڑنے کا مذموم عمل، تیز تر ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں، ٹیلی وژن کے درجنوں اُردو چینلز اور سوشل میڈیا کے گھناؤنے کردار کو زیرِ بحث لانا، وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اِن کے سُدھار کی، کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ صاحبِ نظر اور سنجیدہ فکر لوگوں کو تشویش لاحق ہے کہ اخبارات میں برتی جانے والی

اُردو کا معیار نہایت پست ہو چکا ہے حتیٰ کہ ادارتی صفحوں پر شائع ہونے والے مضامین بھی، املا اور قواعد کی غلطیوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اُردو کے فروغ میں علمی اور ادبی رسائل و جرائد کا کردار بھرپور اور توانا رہا ہے مگر بد قسمتی سے آج کل اکثر رسائل میں اُردو غلط لکھی جاتی ہے جس سے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اُردو کے نام پر، شہر شہر اور نگر نگر تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ اُردو کانفرنسیں، ثقافتی اجتماع اور بڑے بڑے کتاب میلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اِن سرگرمیوں میں بظاہر اُردو کا نام نمایاں ہے لیکن افسوس! اُردو کے اصل مسئلوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ لسانی بگاڑ عفریت کی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کے مداوے کی کوئی بات نہیں کرتا۔ لوگ خدا جانے کہاں کہاں سے کیسی کیسی ترکیبیں، روزمرہ اور محاورے اٹھا کر لا رہے ہیں۔ غلط تلفظ، غلط محاورے اور نت نئی اختراعاتِ بدرواج پذیر ہو رہی ہیں جن میں ایک لفظ و معنیٰ کے غلط اور بے جا تکرار کا عیب ہے جو ذوقِ سلیم رکھنے والوں پر گراں گزرتا ہے۔ یہ عمل عبارت اور گفتگو کے حسن کو گہنا دیتا ہے۔''

پروفیسر غازی علم الدین 'اِضافت مقلوب اور ہماری نافہمی''، ''علاوہ' کی ذُو معنویت اور اِبہام واِہمال''، ''لفظ اور معنی کی تکرار کا عیب''، ''اُردو کا عددی نظام (لسانی تناظر میں)''، '''یت'' کا لاحقہ کس حد تک جائز؟ (ایک لسانی مطالعہ)''، ''اُردو میں اِمالہ ایک مطالعہ (لسانی تناظر میں)''، ''کلمۂ ربط ''سے'' کی معنوی جہتیں''، ''نام رکھنے، لکھنے اور پکارنے کی مشکلات (ایک لسانی مطالعہ)''، ''لاحقۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' کے جمالیاتی رنگ (لِسانی تناظر میں)''، ''ہندی الاصل مصادِر سے مشتق ''نون'' پر ختم ہونے والے الفاظ (لِسانی تناظر میں)''، ''جمع کے تعلق سے بعض لِسانی مُغالطے''، ''یہ ترکیبیں مروّج ہیں مگر۔ (ایک لسانی نقطۂ نظر)''، ''فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک''، ''اُردو، ہندی اور ''ہندوستانی''۔۔۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کا نقطۂ نظر (غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)''، ''''کے حوالے سے'' کا غلط استعمال''، ''اسم فاعل کے آخری حرف کی ''یا'' میں تبدیلی''، ''تعقیدِ لفظی کا عیب''، ''حرفِ عطف کا غلط استعمال''، ''حکمتِ عملی کا غلط استعمال''، ''''مجھے''۔۔۔ فاعل کا نہیں، مفعول کا حرف ہے''، ''برقی ذرائع اِبلاغ کی ایک انوکھی اِختراع''، ''بہنا، سہنا اور کہنا سے فعل امر کا غلط اِملا''، ''خُوب صُورت'' کا بے جا اِستعمال''، ''مصدرِ میمی 'محبت'' وغیرہ کا تلفظ''، ''نبات اور نَبات میں فرق''، ''غلطی ہائے مضامین'' جیسے موضوعات پر تحقیقی و علمی کام کر کے اردو

زبان وادب کی قابلِ صد ستائش خدمت کی ہے۔ان کی زیرِ نظر کتاب اردو زبان کی اصلاحی تحریکوں کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ثابت ہوگی۔ان مضامین اور بعض اختصاری بیانیوں میں جن اغلاط کی نشاندہی ہوئی ہے وہ حقیقتاً ہمارے لیے لسانی اصلاح کے ایسے دروازے کھول رہی ہیں کہ جو فصاحت و بلاغت کے معاییر اور قواعد سے آراستہ ہیں۔اس کتاب میں متعلقہ کتابوں کے حوالے اور وضاحتی حواشی کی فراوانی سے جہاں مصنف کے تجزیاتی ذہن کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کی علمی تلاش کے وصفِ خاص کا سراغ بھی ملتا ہے۔

زبان کو ہیڈ یگر نے ایک پُر اسرار عمل سے تعبیر کیا ہے۔اس کی خود رو نشونما سیل رواں کی صورت ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین نے بھی زبان کے معاملہ کو عجیب وغریب کہا ہے۔اسے ایسا دریا کہا ہے جس کو بند باندھ کر کناروں کے اندر نہیں رکھا جا سکتا۔ان کا خیال ہے" زبان میں تغیر کے عمل کو روکنا ممکن نہیں۔ پہاڑوں سے اُترتے ہوئے دریا کا پانی، اپنے اندر قیمتی کیمیائی اجزاء جذب کرتا جاتا ہے۔میدانی علاقوں میں پہنچ کر، کناروں پر اُگی جڑی بوٹیوں کا رس بھی اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔'' انھوں نے اپنی صائب سوچ کو بروئے کار لا کر ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو زبان کو خراب کرتی رہتی ہیں۔ ''سرگزشت الفاظ'' کے مصنف احمد دین نے الفاظ پر ہونے والے سماجی اور ثقافتی اثرات کی بخوبی نشاندہی کی ہے۔اسی طرح ''افاداتِ سلیم'' میں وحید الدین سلیم پانی پتی نے زبان میں دانستہ تبدیلیوں کی جانب کھل کر توجہ دلائی ہے:

> ''ہر زندہ زبان تغیر آشنا ہوتی ہے اور یہی تبدیلی اُس کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ زبان میں تبدیلی کی وجوہ میں سے ایک وجہ ''لاعلمی'' بھی ہے۔بتقاضائے جہالت، بعض اوقات زبان میں عجیب وغریب تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر وہ لگاتار استعمال میں آتی رہیں تو وہی جہالت اور لاعلمی زبان کا حصہ بن جاتی ہے اور زبان کی تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔''

پروفیسر غازی علم الدین کی یہ رائے ان کی اس کتاب کی معنویت کو اجاگر کرنے میں مدومعاون ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید
ممتاز پروفیسر جی سی یونیورسٹی لاہور

ہم اور ہماری لفّاظی!

کوئی نو دس برس اُدھر کی بات ہوگی جب اِنٹرنیٹ کی کسی شاخ پر ہم نے پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب ''لسانی مطالعے'' کی اِک جھلک دیکھی۔ چونکہ زبان اوراس کی جزئیات سے ہمیں شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے تو اس کتاب کے تعلق سے ہمارے ہاں ایک تجسس کا پیدا ہونا عجب نہیں تھا۔ کسی طور غازی علم الدین صاحب سے رابطہ بھی ہوگیا اور پھر یہ کتاب اُن کی طرف سے ہمیں موصول ہوئی، ہم نے اپنے اخبار روزنامہ اُردو ٹائمز (ممبئی) میں خاصی تفصیل سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔ اس کتاب میں غازی موصوف نے جس طرح سے لفظ شناسی کا مظاہرہ کیا وہ دورِ حاضر میں ایک جہاد سے کم نہیں کیونکہ اب ہماری درس گاہوں میں زبان اوراس کے قواعد پر تدریس کا کوئی خاطر خواہ نظم نہیں رہ گیا۔

اسی دوران حضرتِ دتاتریہ کیفی کی ''کیفیہ'' بھی نظر نواز ہوئی۔ 'کیفیہ' کو جتنا پڑھ سکے تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے ذاتی مطالعہ ہی کافی نہ ہوگا، اس کے لیے تو کسی اُستاد کی رہنمائی بھی درکار ہوگی۔ زبان کا علم اوراس کا نظام کسی کے لیے بہت مشکل نہ سہی مگر اتنا آسان بھی نہیں۔ اس دَور میں لوگ ڈگری کے حصول کے لیے تو سرگرداں نظر آتے ہیں مگر 'علم' ان کا منہ تکتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ہماری درس گاہوں میں عالموں کی تو بہتات ضرور ہے مگر علم کبھی اور کہیں مل جاتا ہے۔ اس کی زندہ مثال غازی علم الدین صاحب ہیں جو ایک کالج کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہیں۔ موصوف نہ تو دہلی سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ ہی لکھنؤ والوں سے ان کا کوئی تعلق ہے بلکہ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ پنجاب کی 'خاکِ قصور' سے اُٹھے ہیں جہاں ایک سے ایک اہلِ علم و باکمال شخص پیدا ہوا۔ وہ پنجاب جیسی زرخیز سرزمین سے تعلق رکھنے کے باوجود اُردو زبان سے صرف محبت کا دَم نہیں بھرتے بلکہ عملاً بھی اس کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

یقیناً اُردو زبان سے محبت کرنے والے پنجابیوں میں غازی علم الدین صاحب پہلے شخص نہیں ہیں مگر اُردو کے حسن اور اپنے ملک کی قومی زبان ہونے کے ناتے، انھیں جو محبت اس زبان سے ہونی چاہیے وہ ہے اور بجا ہے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنی علاقائی یا مادری زبان سے خائف ہیں البتہ وہ علاقائیت سے پرے اپنی قوم، قومی تشخص اور قومی زبان کے معاملے میں کسی سمجھوتے پر آمادہ نہیں۔ ان کا یہ موقف یقیناً قابلِ قدر وستائش ہے اور اس کی تبلیغ و ترویج پر وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہیں۔ ''لسانی مطالعے'' جیسی کتاب ان کی سنجیدگی کا بین ثبوت ہے، انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا، اس کے بعد بھی اس موضوع پر ان کے مضامین پاکستان کے مقتدر جرائد میں اہتمام سے شائع ہوتے رہے ہیں بلکہ ان مضامین کی ہندستان میں بھی قدر کی گئی یہاں کے اکثر رسائل و اخبار میں انھیں شائع کیا گیا۔ ''لسانی مطالعے'' کو اُردو کے موٴقر ادارے مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد نے بہت اہتمام سے شائع کیا جو اپنے آپ میں ایک اہم بات ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن ہندستان میں بھی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) والوں نے طبع کیا۔ ''لسانی مطالعے'' کی ایک 'خاص' بات یہ بھی رہی کہ اس کتاب کے بطن سے یہاں کے ایک حضرت کی ایک کتاب بھی تولُّد ہوگئی اور اسے جنابِ غازی علم الدین کی شرافتِ نفسی کہیے کہ انھوں نے 'لسانی مطالعے' کے بطن سے پیدا ہونے والی کتاب کی ولدیت کے بارے میں کوئی واویلہ یا کوئی شور بلند نہیں کیا۔ دراصل علم کی ایک بنیادی صفت 'حلم' بھی ہوتی ہے وہ غازی علم الدین کے ہاں قدرت نے وافر مقدار میں ودیعت کر رکھی ہے۔ ایسے لوگ بہر طور توانا و قوی ہوتے ہیں اور اُن کا کام کہیں اور کبھی معدوم بھی نہیں ہوتا۔

ہم نے ''لسانی مطالعے'' کے تذکرے میں لکھا تھا:

''ہمارے نزدیک یہ کتاب لغت تو نہیں مگر لغت ہی کے قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ علمِ زبان کے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اچھے اُستاد کی مانند ہے جس میں لفظ و معنیٰ کے حوالے سے ہمارے ہاں جو بوالعجبی عام ہے، اُس پر تنقید بھی ہے اور تحقیق کے دَر بھی وا کیے گئے ہیں۔ جلیل القدر پیغمبر حضرتِ لوط علیہ السلام، صحابہ کرامؓ اور اللہ والوں کے تعلق سے کچھ ایسی منفی اصطلاحیں اور بعض باتیں جو عام کر دی گئی ہیں ان پر بھی پروفیسر موصوف نے استہزائی طور اختیار نہ کرتے ہوئے ایک سلیقے سے گرفت کی ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ انھیں مرض کا علاج مطلوب ہے نا کہ علم کے نام پر بلا وجہ کا عملِ جراحی۔''

اس کے بعد بھی زبان اور زبان کے مسائل پر اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے بلکہ میرپور۔ آزاد کشمیر کے گورنمنٹ ڈگری کالج افضل پور کی پرنسپل شپ کے زمانے میں ان کی دانش گاہ کا جو مجلّہ 'سیماب' کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے اور جس کے دو ایک شمارے احقر کی نگاہ سے بھی گزرے ہیں ان

میں بھی زبان اور اس کے قواعد کے بارے میں (مختلف اہلِ علم کے سہی) مضامین ضرور شامل رہے ہیں بلکہ ان کی ایک صفت یہاں اور قابلِ ذکر ہے کہ وہ عام اساتذہ سے یوں ممتاز اور علم دوست ہیں کہ 'سیماب' کا اداریہ ان کے شاگرد کا نہ صرف لکھا ہوا تھا بلکہ اُس کا نام بھی پورے اہتمام سے شائع کیا گیا ورنہ تو اس جہاں میں کیا نہیں ہوتا!!

دراصل غازی علم الدین صاحب پر اپنے نام کا خوب خوب اثر ہے، انھوں نے اپنے کردار سے اس نام کی لاج ہی نہیں رکھی بلکہ اس کی حرمت کو جِلا دینے کی سعیٔ بلیغ بھی کی اور نیتجتاً کامیابی اُن کا مقدر بنی۔ بے شک جو کام اخلاص اور یک سُوہو کر کیے جاتے ہیں ان کا کامیاب ہونا عجب نہیں بلکہ ان کی ناکامی عجب ہوتی ہے۔

مجلّہ 'سیماب' کی تیسری جلد کا پہلا شمارہ اس وقت بھی بہ اتفاق ہمارے سامنے ہے جس میں اُن کے موضوعِ خاص کے لیے ایک باب بعنوان ''اُردو ہے جس کا نام'' ہماری توجہ کا دامن پکڑتا ہے۔ اس میں بھی ان کی سرشت کی شرافت کام کررہی ہے یعنی ان کی دلچسپی کا موضوع ہوتے ہوئے بھی ان کا کوئی مضمون اس باب میں 'دخیل' نہیں، البتہ مختلف کتابوں پر تبصرے کے باب میں ضرور اُن کی ایک تحریر شامل ہے مگر عام شکل میں، ورنہ تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ مدیر حضرات اپنی شاعری یا اپنے ہی مضمون کے اقتباس سے اپنے پرچے کی رونق کو 'تناول' کرتے پائے جاتے ہیں۔

پروفیسر غازی علم الدین کی ادارت نہیں بلکہ سرپرستی میں شائع ہونے والا یہ ''سیماب'' تدریس ہی کا ایک نمونہ ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کی اس طرح تربیت کی ایک عملی کوشش کی، جو اُن کے استادِ صادق ہونے کی ایک شہادت بن گئی ہے۔ کراچی والے حکیم انجم فوقی (بدایونی) کہتے تھے:

''اصل طاقت وَر تو وہ ہوتا ہے جس کا جوہر، اس کی قوت تقسیم ہونے کے بعد بھی، وہ توانا اور طاقت وَر رہے۔''

تو ہم نے اس فارمولے کا جیتا جاگتا کردار پروفیسر غازی علم الدین کی شکل میں دیکھا، جن لوگوں نے ''سیماب'' دیکھا ہے وہ ہماری بات کی تائید کریں گے کہ پانچ سَو صفحات پر محیط یہ مجلّہ کوئی عام سی دانش گاہ کا 'جرنل' نہیں بلکہ باقاعدہ بڑے سائز کی کتابی شکل میں اپنے متن کے سبب ایک یادگار بن گیا ہے جس سے آئندہ کے طالب علم ہی نہیں، ہر علم دوست مستفید ہوگا۔ اسی طرح ان کی علم دوستی کی ایک مثال، ان کے نام ''مشاہیرِ ادب کے خطوط۔۔۔'' کی بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ خطوط کا یہ مجموعہ 'خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو' جیسا نہیں بلکہ ان خطوط میں بھی ان کے نام کے تمام جوہر یکجا ہوگئے ہیں۔ ان کا

موضوعِ خاص یعنی ''لسانی مباحث''، شخصیت شناسی اور علمی و ادبی موضوعات پر مبنی ایسی تحریریں ہیں جو کتاب بن گئی ہیں کہ اور آئندگان کے لیے بھی ایک سبق و درس کی طرح کام آئیں گی۔

ہمیں بزرگوار جمیل الدین عالؔی کی ایک بات یاد آ گئی جو انھوں نے ادا جعفری کی مشہور کتاب ''جو رہی سو بے خبری رہی'' کے ایک مذاکرے میں کی تھی: (مفہوم) ''کتاب کسی بھی صنف سے تعلق رکھتی ہو اس سے بحث نہیں دیکھا یہ جانا چاہیے کہ اس میں 'ادب' ہے بھی یا ہے تو کتنا۔۔۔''

تو جناب! صنف کی اہمیت اس کے متن سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے اختصار یا اس کی تفصیل سے !!۔۔۔'ہم'۔۔۔ بنام غازی علم الدین' جن خطوط کے مجموعے کا ذکر کر رہے ہیں وہ اسی معیار کا ایک نمونہ ہے۔اس کے لکھنے والوں میں علم و ادب کے ممتاز اشخاص ہی نہیں، ہم ہندستانیوں کے لیے بعض انجان حضرات بھی ہیں مگر وہ اپنی تحریر میں انجان نہیں رہے انھیں پڑھنے کے بعد ان سے خاصا تعارف ہو جاتا ہے۔اس کتاب کے بارے میں ہم نے اپنے کالم میں لکھا تھا:

''خط بظاہر ادب کی کوئی صنف نہیں مگر لکھنے والا قلم کا دَھنی ہے تو وہ خط کو بھی ادب بنا دے گا جس کی بنیاد مرزا غالبؔ کے مکتوب ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ مرزا نوشہؔ نے خط کو ایک بلند تر مقام پر پہنچایا ہی نہیں بلکہ مکالمے کی ایک طرح ڈال دی۔ان کے بعد ہماری زبان میں ابوالکلام آزادؔ کے،صفیہ کے خطوط جاں نثار اختر کے نام، حکیم انجم فوقی بدایونی وغیرہ کے مکتوب بھی ایک روشن مثال ہیں۔اِن کے علاوہ دورِ جدید میں بھی بعض اہلِ علم کے خطوط باقاعدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔جدید ذرائع ابلاغ نے ہمیں بہت آسانیاں اور سہولتیں دی ہیں مگر جو چیزیں ان کی قیمت پر ہم سے چھین لی گئی ہیں ان میں ایک 'خط' بھی ہے اور نجانے کیا کیا ابھی چِھننا باقی ہے۔ایسے مایوس کن حالات میں 492 صفحات پر مشتمل غازی علم الدین کے نام مشاہیرِ ادب کے خطوط کے مجموعے کی (پاکستان میں) اشاعت ایک خوش کن واقعہ ہے۔اس مجموعے کے اکثر خط علم و ادب سے مملو ہیں، جن کے لکھنے والوں میں 'صرف مشہور' لوگ نہیں بلکہ اکثر اہلِ علم حضرات ہیں اور ان خطوط میں جو مسائل زیرِ بحث آئے ہیں ان میں کثیر تعداد میں زبان و ادب اور دیگر علمی موضوعات کے حامل ہیں۔غازی علم الدین مدرس تو ہیں ہی مگر جس طرح انھیں لسانی مسائل سے شغف ہے، دورِ حاضر میں اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والے اُستاد کم کم ملیں گے۔ چند برس قبل تک لاہور سے ماہنامہ سیارہ (ڈائجسٹ نہیں) نعیم صدیقی اور حفیظ الرحمان احسن کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، انھی حفیظ الرحمان احسنؔ نے خطوط کے اس مجموعے کو مرتب کیا ہے۔حفیظ الرحمان احسنؔ کے پیش گفتار کے علاوہ پروفیسر مظہر محمود شیرانی (پیش لفظ)، پروفیسر عبدالستار دلوی (مقدمہ) اور

پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ (حرفِ چند) کے مضامین بھی اس کا حصہ ہیں۔‘‘

واضح رہے کہ اس سلسلے کا ایک مجموعہ ’’اہلِ قلم کے مکاتیب بنام غازی علم الدین‘‘ پہلے ہی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے،۔۔۔پیشِ نگاہ مجموعے میں بیشتر خطوط علم وادب کے کسی نہ کسی ایسے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں جس سے قاری کا ذہن بھی مجلّا ہوتا ہے، غازی علم الدین سے ہمارا تعارف ہی ’زبان‘ جیسے موضوع ہی کے سبب ہوا تھا۔ اُن کی کتاب ’لسانی مطالعے‘ اُردو دُنیا میں نہ صرف مشہور ہوئی (جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا) اس سے اُردو کے ایک ہندستانی عاشق نے اپنے نام کا بھی چراغ روشن کرلیا جس پر ہمارے ہاں ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد۔ دکن) نے اپنے انداز سے ان کی خوب ’خیر خبر‘‘ لی۔۔۔ ہماری اکثر جامعات میں ہونے والے ریسرچ ورک کی جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے مگر پاکستان میں بھی اس ضمن میں یہاں سے کم خراب حالت نہیں ہے۔ راشد شیخ (کراچی) کے ایک خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

’’۔۔۔ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہ تحقیقی مقالے اور خصوصاً Ph.D کے لیے لکھے گئے مقالے کسی تحقیقی خدمت کی خاطر نہیں بلکہ پی ایچ ڈی الاؤنس حاصل کرنے کی خاطر لکھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق جس پست سطح تک پہنچ چکی ہے وہ نا قابلِ بیان ہے۔ ماضی قریب میں برِصغیر پاک و ہند کے دو نامور محقق یعنی مشفق خواجہ اور رشید حسن خان اس قسم کی تحقیق کے سخت مخالف تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں نے تحقیق کے بلند مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود Ph.D کی سند حاصل نہیں کی۔ اس بارے میں مشفق خواجہ کے ادبی کالموں میں بعض دلچسپ جملے ملتے ہیں جن میں سے دو جملے قارئین کے ضیافتِ ذوق کی خاطر لکھتا ہوں:

۱۔ مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جاتی ہے ہمارے ہاں اُنھی کاموں پر Ph.D کی ڈِگری دی جاتی ہے۔

۲۔ آئندہ انھی اساتذہ کو ترقی دی جائے جو پی ایچ ڈی کی تہمت سے محفوظ ہوں۔‘‘

اسی خط میں راشد شیخ نے ایک اور صداقت بیان کی ہے، اے کاش اُردو والے اس پر بھی کان دھریں:

’’تمام علمی دُنیا میں ایک طے شدہ اصول ہے کہ Ph.D کو تحقیقی سفر کا پہلا قدم قرار دیا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں Ph.D کے دوران طالب علم تحقیق کرنے کے گُر اور طریقے سیکھتا ہے، اس کا اصل کام تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔‘‘

یہ تو اس خط کی چند سطریں آپ تک پہنچی ہیں جبکہ اسی خط میں مکتوب الیہ پر تنقید بھی کی گئی ہے، جو غازی علم الدین کی شریف النفسی ہی نہیں بلکہ اُن کی علم و ادب دوستی کی بھی مظہر ہے، جبکہ ہمارے ہاں اب علم و ادب سے زیادہ 'شخصی' حرمت مقدم رکھی جاتی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مرتب کو اس خط کی ہَوا بھی نہ لگنے دیتا۔ (واضح رہے کہ اس قبیل کا یہی ایک خط نہیں بلکہ دیگر خطوط میں بھی غازی موصوف تنقید کا ہدف بنے ہیں) سچ یہی ہے کہ جو لوگ علم و ادب کے ساتھ کردار کی حرمت پر بھی مائل ہوتے ہیں وہی زندگی کے مظہر بن جاتے ہیں، ہمارے نزدیک غازی علم الدین اسی قبیل کے ایک زندۂ جاوید شخص ہیں۔

پیشِ نظر (خطوط کے اس) مجموعے میں (بھی) لسانی مسائل پر خاصا کلام کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ کئی خطوط میں تحریرِ غازی پر تنقیدی انداز اختیار کیا گیا ہے، اسی طور کا ایک خط (از: ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان) جب ہم نے پڑھا تو ان سطروں پر پہنچ کر احساس ہوا کہ اس میں تو ہم سے بھی خطاب کیا گیا ہے:

> ''۔۔۔آپ کی تحریر صاف، اُلجھنوں سے پاک اور جامعیت و اختصار سے سرمایہ دار ہے البتہ آپ 'نقطۂ نظر' کو جس مفہوم میں استعمال کر رہے ہیں اُس مفہوم کا اطلاق 'زاویۂ نظر' پر ہوتا ہے اس لیے کہ ہر کسی کا اپنا مشاہدہ اپنے 'زاویۂ نظر' کا مرہون ہوتا ہے، نقطۂ نظر مسلمہ ہوتا ہے۔۔۔''

غازی علم الدین کا موضوع عام طور پر اس ڈگری طلب معاشرے میں رغبت سے عاری ہے مگر اس کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی کافر بھی منکر نہیں ہو سکتا۔ انھیں اپنے موضوع سے کس قدر اُنس و شغف ہے کہ وہ اس موضوع پر ہمہ وقت متفکر اور تلاش و جستجو میں منہمک رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی ایک کتاب ''لسانی زاویے'' ہمارے پیشِ نظر ہے یہ بھی اُن کے مختلف اوقات میں لکھے ہوئے مضامین ہی کا مجموعہ ہے جس کے بعض عنوانات یوں ہیں:

اضافتِ مقلوب اور ہماری نافہمی، ''علاوہ'' کی ذو معنویت اور ابہام و اہمال، لفظ و معنیٰ کی تکرار کا عیب، اُردو میں اِمالہ۔۔۔ایک مطالعہ (لسانی تناظر میں)، نام رکھنے، لکھنے اور پکارنے کی مشکلات (ایک لسانی مطالعہ) جمع کے تعلق سے بعض لسانی مغالطے، تعقیدِ لفظی کا عیب، برقی ذرائع ابلاغ کی انوکھی اختراع وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے جن عنوانات کا ذکر کیا ہے، افسوس وہ آج کے شعرا و ادبا کے ہاں بھی دلچسپی کے حامل نہیں رہے۔ ہمارے بزرگ قیصر الجعفری کے بقول ''اُردو کے شاعر کو فارسی، عربی اور ہندی پر قدرت نہ

سہی مگر ان زبانوں کی شُد بد کے ساتھ اس کے پس منظر اور پیش منظر سے بھی باخبری ضروری ہے کہ نجانے ان زبانوں کا کون سا لفظ کس وقت اس کی 'ضرورت' بن جائے!!''

اب تو فارسی اور عربی زبان سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ عربی اور فارسی کے وہ الفاظ جو عام طور پر اُردو میں رائج ہی نہیں بلکہ اس زبان کا حصہ بن چکے ہیں ان کی معنوی کیفیت سے بھی لوگ بے خبر ہیں۔ شاعری کی یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں لفظ کی ہر نوعیت اُجاگر ہو جاتی ہے بشرطِ شاعر لفظ شناس ہی نہیں، اس پر پوری طرح قادر بھی ہو۔ شاعری کی فضیلت بھی ہم جیسوں کے نزدیک اس سبب ہے مگر کیا کِیا جائے کہ فی زمانہ ہمارے بعض شعرا لفظ کی اِس نزاکت سے یا تو بے بہرہ ہیں یا پھر ان کے نزدیک لفظ کی حرمت بے معنیٰ ہے۔

سہو کو ہم یہاں مثال یا نظیر نہیں بنائیں گے مگر اس کا ذکر ہونا عجب نہیں کہ اس طرح ہم لفظ کے استعمال پر چوکنا رہ سکتے ہیں۔

ایک مثال

مدت ہوئی کسی بزرگ شاعر کی نعت کا ایک شعر ہماری نظر سے گزرا جس کا پہلا مصرع محلِ نظر تھا:

ازَل سے عشقِ محمدؐ میں مبتلا ہوں مَیں

(ملے گا روزِ قیامت مجھے خطاب الگ)

اس مصرع میں لفظ ''مبتلا'' نے مدحِ رسول ﷺ کو ایک ایسی ضرب لگائی کہ شعر کی پوری عمارت متزلزل ہو گئی۔ شاعر 'مبتلا' کی معنویت سے بے علم نہ سہی مگر وہ مصرع کی بُنت کرتے وقت اس لفظ کی منفی کیفیت سے غافل رہا جبکہ یہ مصرع بہت آسانی سے یوں بھی کہا جا سکتا تھا (یا اِس سے اچھا بھی):

ازل سے عشقِ محمد میں دل دھڑکتا ہے

اسی طرح کئی برس پہلے علی گڑھ سے ایک شعری مجموعہ موصول ہوا۔ زبان و بیان کے ساتھ شاعری بھی ایک معیار کی تھی اور کتاب کو شاعر نے اپنے والدِ محترم کے نام مُعنوَن کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ صفحہ کتاب کے اوّل اوّل حصے میں ہوتا ہے اس میں بھی یہی ترتیب تھی۔ اس صفحے پر صرف چار سطریں تھیں پہلی سطر

''ابّا کے نام''

دوسری اور تیسری سطر میں وہ شعر تھا جو، ابّا کے نام مُعنوَن کیا گیا تھا اور چوتھی سطر میں شاعر کا نام۔ ذرا سوچیے کہ پورے صفحے پر چار سطروں میں اُن کا ایک عیب ایسے نمایاں ہوا تو ہمیں افسوس ہوا کہ اچھے خاصے شاعر سے کیسی غلطی سرزد ہو گئی۔ وہ شعر یوں تھا:

عمیق گہرے سَمُندَر کے پانیوں جیسا
وہ ایک شخص تھا قصّے کہانیوں جیسا

اب کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ شاعر یا تو ''عمیق'' کے معنیٰ نہیں جانتا یا پھر وہ ''گہرے'' کے مطلب سے بے خبر ہے۔ افسوس اس کا بھی کیجیے کہ اس میں کاتب یا کمپوزر کو موردِ الزام نہیں ٹھیرایا جا سکتا یعنی:

'راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا'

بے شک زبان کے تمام روزن و دَر کھلے رکھنے چاہئیں مگر اسی کے ساتھ عقل بھی بیدار رہنی چاہیے کہ ایسا نہ ہو کوئی بھی نامحرم آپ کی معنوی محرمات کے سامنے آ کھڑا ہو۔ یعنی دوسری زبانوں کے لفظ یا اصطلاحیں وقتِ ضرورت ہماری زبان کا حصہ ضرور بن سکتی ہیں مگر اپنی زبان کے وہ محاسن جو گزشتگان نے بڑی محنت سے جلوے بنائے تھے وہ متاثر نہ ہوں۔ پھر اس کا بھی خیال رہے کہ آنے والا مہمان بڑی حد تک قابلِ احترام و قابلِ قدر ہو سکتا ہے مگر وہ ہمارے گھر کے لوگوں کے وجود کے لیے مہلک ثابت نہ ہو ورنہ تو پھر زبان کے گھر میں ایک طرح کی انارکی اور انتشار پھیل جائے گا۔ جیسا کہ اوپر ''عمیق گہرے'' کی مثال دی گئی ہے ویسے عیوب عام ہو جائیں گے اور زبان کا حسن و حرمت ہم سے پردہ کر جائے گی۔

ابھی ہم نے ''عمیق گہرے'' کے حشو و زوائد کی مثال پیش کی ہے اب لفظ کے حُسنِ استعمال کا بھی ایک نمونہ دیکھیے کہ ایک لفظ نے اپنی ترتیب سے کس طرح معنیٰ بھی بدل دِیے:

اِدھر تھا وقتِ ضرورت اُدھر ضرورتِ وقت ** بگڑ گئی تھی گھڑی بیچ دِی تو چلنے لگی (*ارتضیٰ نشاط)

کوئی بیس برس اُدھر کی بات ہے کہ ممبئی کے ''مکتبہ جامعہ'' میں لاہور کے ایک شاعر (غالباً سعادت سعید) کی نظموں کا ایک مجموعہ 'کجلی بن' ہماری نگاہ سے گزرا، ہمیں اس کے نام نے متوجہ کیا اور وہ مجموعہ ہم نے خرید لیا صرف اس وجہ سے کہ 'کجلی بن'' کیا ہوتا ہے؟ کئی دن کی تلاش و جستجو کے بعد اس کے معنیٰ کی صورت ہم پر 'ہاتھیوں کا جنگل' کھلا۔ لفظ بھی اپنے آپ میں عجب عجب فطرت و سرشت کے حامل ہوتے ہیں اور ان سے جو وابستہ ہو جائے اس کی سرشت و فطرت میں یہ لفظ اُتر جاتے ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی اپنی زبان دانی اور لسانی تمول کے سبب اُردو زبان کا ایک بے مثال شخص گزرا ہے، جوشؔ کے ایک واقعے کا تذکرہ بے محل نہیں ہوگا۔

جبار مرزا لکھتے ہیں:

''پاکستان میں جوشؔ صاحب کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو اُردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔
ہند میں چھوڑے گئے اثاثوں کے دعوے کی خاطر جن میں آموں کا باغ، گھر بار، حویلی،

سنیما بھی شامل تھا اس کے حصول میں جوشؔ صاحب کو اتنا زچ کیا گیا تھا کہ وہ عاجز آ
کر اپنے اثاثوں ہی سے دست بردار ہو گئے۔ اُن ہی دنوں اُنھوں نے کہا تھا کہ
جہاں بھی ہم نے بنایا گھر ÷ سڑک میں آ گیا

بہت بعد ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار ۱۹۷۵ء میں اسلام آباد میں جوشؔ صاحب کو ایک گھر دیا تھا جس کا ماہانہ کرایہ متعلقہ وفاقی وزارت دِیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ماہانہ پانچ ہزار روپے خرچ بھی باندھا تھا۔ مولانا کوثؔر نیازی نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا کہ ان ہی کی کوششوں سے بھٹو نے ایسا کیا تھا۔

زبانوں کا معیار چونکہ اس کا ادب ہوتا ہے، صحافت نہیں، اسی لئے ایک دفعہ ایک ماہنامے کے ایڈیٹر نے جوشؔ سے پوچھا کہ جوشؔ صاحب! آپ کتنے ''برس'' کے ہو چکے ہیں۔ اس نے برس کی 'ر۔۔۔ر۔۔۔' زبر کی بجائے جزم کے تلفظ سے ادا کی تو جوشؔ صاحب نے کہا بھئی آپ لوگ اُن صاحب سے دور رہا کرو، یہ آپ کی اُردو خراب کر دیں گے۔

جنرل ضیاالحق نے جب جوشؔ صاحب کا ماہانہ خرچ اور گھر کے کرائے کی بحالی کی تو وفاقی سکریٹری اطلاعات نے جوشؔ صاحب کو بلا کر کہا کہ حکومت نے آپ کا خرچ اور ''رہائش گاہ'' کا کرایہ بحال کر دِیا ہے تو جوشؔ صاحب نے جواباً قدرے ترش لہجے میں سکریٹری اطلاعات سے کہا کہ بھئی کچھ شرم کرو اطلاعات کے سکریٹری ہو اور قیام گاہ کو رہائش گاہ کہہ رہے ہو۔ تمہیں مصدر تبدیل کرنے کی اجازت کس نے دِی؟ اگر رہنے کی جگہ کو رہائش گاہ کہو گے تو پیدا ہونے کے مقام کو 'پیدائش گاہ' کیوں نہیں کہتے!

اس علمی تلخی کی وجہ سے کئی ماہ تک سکریٹری مذکور نے جوشؔ صاحب کا خرچ اور کرایہ منظوری کے باوجود روکے رکھا۔ ذرا دیکھیے کوئی اور ہوتا تو وہ 'رہائش گاہ اور قیام گاہ' کی بحث سے پرے اپنی مراعت حاصل کرتا مگر وہ کیسے لوگ تھے کہ ان کے نزدیک ذاتی مفادات پر علم و ادب غالب رہا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں پر علم و ادب بھی نازاں ہے۔ وہ جو ہم نے زبان کے روزن و دَر کھلے رکھنے کی بات کی ہے وہ زبان کی ترقی اور فطرت کے تقاضوں کے سبب از بس ضروری تو ہے ہی مگر احتیاط کا پہرہ اس سے زیادہ لازم ہے۔

پاکستان ہی کے ابرار احمد نے اپنے ایک مضمون میں کیا صحیح بات کی تھی:

''معروف شاعر اور ماہر اُردو لسانیات ساحرؔ لکھنوی کے بقول 'بعض الفاظ اپنی اصل زبان سے دوسری زبانوں تک پہنچ کر اُس کا حصہ بن جاتے ہیں' ہم اسے الفاظ کی ہجرت کہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ایک عمرانی عمل (Social Process) ہے جو از خود وقوع

پذیر ہوتا ہے، مگر جبراً ایک زبان میں دوسری زبان کے الفاظ استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے بلکہ سامعین کے لیے سمع خراشی کا بھی سبب بنتا ہے۔ اُردو میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال اُس وقت زیادہ ضروری محسوس ہوتا ہے جب انگریزی لفظ کا کوئی مناسب اور جامع مترادف نہ ہو۔ لیکن انگریزی لفظ Categorically کا مترادف اُردو میں 'دوٹوک' ہے، جو زیادہ جامع اور زوردار (غازی صاحب! توجہ فرمائیں کہ لکھنے والے نے 'زبردست' سے کیسے اعراض کیا!!*ن۔ص) لفظ ہے، مگر ہمارے (پاکستانی) چینلوں کے نمائندگان انگریزی الفاظ استعمال کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید وہ انگریزی زبان سے مرعوب سامعین و ناظرین پر اپنا علمی رعب بٹھانا چاہتے ہیں۔''

اب دیکھیے کہ ہم نے زبان کے مخزن کے کیسے کیسے گوہر آبدار کھو دِیے ہیں۔ کیا ہم آج جانتے ہیں کہ جانوروں کی آوازوں کے لیے بھی اُردو میں الگ الگ لفظ ہیں جنھیں ہم نے فراموش کر دیا اور اس زیاں کے احساس سے بھی عاری ہو گئے۔ لیجیے وہ آوازیں تصور ہی میں سہی، سُن لیجیے:

''شیر دھاڑتا ہے، ہاتھی چنگھاڑتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، کُتّا بھونکتا ہے، بلّی میاؤں کرتی ہے، بکری ممیاتی ہے، چڑیا چہچہاتی ہے، کوا کائیں کائیں کرتا ہے، کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتا ہے، مکھی بِھنبھناتی ہے اور مینڈک ٹرّاتا ہے۔۔۔ (وغیرہ وغیرہ)''

☆☆☆☆

ہماری انا ہمارا نفس تو ہر وقت اور ہر جگہ زندہ و توانا رہتا ہے انتہا تو یہ ہے کہ یہ نیکی اور ایمان کے معاملات میں بھی گمراہ کرتا رہتا ہے اور ہم ہیں کہ بھولے رہتے ہیں کہ

نفس نیکی میں بھی شیطان سے جا ملتا ہے
یہ کسی طَور بھی اُبھرے اسے مارا جائے

مگر ہوتا اس کے برعکس ہے کہ مار تو ہم ہی کھاتے رہتے ہیں اور طرہ یہ کہ اپنی شکست کے احساس سے بھی محروم رہتے ہیں کہ انا اور نفس کی ایک 'صفت' یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اس احساس کو مار دیتا ہے، ورنہ سوچیے کہ سیرت النبی ﷺ جیسی کتاب کا مصنف لفظ ''مشکور'' کی معنوی کیفیت پر اصرار ہی نہیں کرتا بلکہ یہ بھی لکھ مارا کہ اگر کوئی اس کے برعکس اصرار کرے تو اس کے منہ پر مار دو اور نفس کی پیروی کرنے والے ہم جیسے عام ہیں، انھوں نے ہمارے منہ پر مار بھی دِیا۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ کیا اللہ کے ہاں لفظ و معنیٰ کے ساتھ زیادتی کرنے والے بھی گرِفت میں آئیں گے؟!!

بہت سے لفظ گم ہو گئے یا گم ہو رہے ہیں اور ہم ہیں کہ اُن سے بھی بے خبر ہیں۔ ایک دن خیال

آیا کہ لفظ 'اقبال' کی ضد کیا ہوگی؟۔۔۔اپنے آپ سے بڑی شرمندگی ہوئی بہت دیر تک سوچتے رہے کہ وہ کیا لفظ ہوسکتا ہے جو 'اقبال' کا متضاد ہو۔۔۔ہم لگے رہے تو اللہ کو رحم آ گیا اور اُس نے ہمارے 'اقبال' کے 'ادبار' کی خبر دیدی۔

ممبئی میں ایک بزرگِ محترم جالبؔ مظاہری گزرے ہیں، زبان و بیان پر اُنھیں خوب قدرت تھی۔ان کی ایک کتاب 'قاموس الادب' ہم نے پڑھی ہے معروف معنوں میں یہ لغت تو نہیں مگر کسی عام لغت کے مقابل اس کی اہمیت یوں ہے کہ اس میں انھوں نے زبان و بیان کے ضمن میں بہت کچھ یکجا کر دِیا ہے۔دراصل یہ کتاب ہائی اسکول کے طلبا کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اب یہ 'قاموس' اعلیٰ درجات کے طلبہ کی بھی ضرورت ہے۔حال ہی میں غازی علم الدین صاحب سے فون پر لفظ کی ضد پر گفتگو ہورہی تھی تو انھوں نے کہا کہ ضروری نہیں ہر لفظ کی ضد تلاش کی جائے۔غازی صاحب سے گفتگو کے بعد ہم نے جالبؔ مرحوم کی قاموس اٹھائی تو اس میں انھوں نے اپنے طلبہ کے لیے کوئی پانچ صفحے خرچ کیے ہیں۔موصوف نے کئی ایسے متضاد لفظ بھی یاد دِلا دِیے کہ جنھیں ہماری عمر کے اکثر افراد بھی فراموش کر گئے ہیں مثلاً: تہی کی ضد پُر، غرقاب کی ضد پایاب، تیز کی ضد کُند، بسیار کی ضد اندک، متصل کی ضد منفصل، تواضع کی ضد تکبر، خطا کی ضد صواب، زیبا کی ضد زشت، قضا کی ضد ادا، شعار کی ضد دثار، خُسُوف کی ضد کُسُوف (ان دونوں لفظوں سے تو ہم ناآشنا تھے مگر ان دونوں کے معنیٰ ضرور ازبر ہیں کہ چاند گرہن اور سورج گرہن) وغیرہ۔۔۔اسی طرح اس 'قاموس' میں پھولوں کی باقاعدہ سَو سے زائد قسمیں نام بنام درج کی گئی ہیں مثلاً گُلِ بیگانہ، سیوتی، عشقِ پیچاں، گُلِ تسبیح یہ وہ نام ہیں جن سے ہم بے خبر تھے۔

جالبؔ صاحب کی اس قاموس میں تذکیر و تانیث پر بھی خاصا علم ہمیں ملتا ہے۔انھوں نے جان دار اور بے جان چیزوں کی تذکیر و تانیث واضح کی ہے بلکہ انھوں نے تو کچھ ایسے لفظ بھی ہمیں یاد دِلا دِیے جو بعض معنوں میں مؤنث ہیں اور بعض معنوں میں مذکر جیسے: گُزر۔۔۔'بسر اوقات' کے معنوں میں تو مؤنث ہے مگر 'گزرنے' کے معنوں میں مذکر، آب بمعنیٰ 'پانی' مذکر ہے سب جانتے ہیں مگر چمک کے معنوں میں 'آب' مؤنث ہے۔اسی طرح مغرب بھی ایک معنیٰ میں مذکر ہے تو دوسرے معنیٰ میں مؤنث، لفظ 'نظم' بھی اسی طرح مذکر و مؤنث دونوں ہے جن کی اصل، محل استعمال ہی پر کُھلتی ہے۔حضرتِ جالبؔ نے بے جان چیزوں کی تانیث پر بھی کلام کیا ہے۔وہ کہتے ہیں جس لفظ کے اخیر میں یائے معروف (ی) ہو جیسے نیکی، بدی، چُھری، سوئی وغیرہ مؤنث ہیں، لیکن بعض اسم جن کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے مثلاً گھی، موتی، دَہی، پانی وغیرہ مذکّر ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اسی ضمن میں بعض مستثنیات کا بھی ذکر کیا ہے۔جالبؔ صاحب

کی یہ قاموس چونتیس برس قبل چھپی تھی اب نایاب ہے۔اس میں متفاوت المفہوم الفاظ کو بھی واضح کیا گیا ہے، ایک مثال ملاحظہ کیجیے: جوع البقر (جس کے معنیٰ ہیں وہ بیماری جس میں سیری کے باوجود بھوک کا احساس ہوتا رہتا ہے)۔اس کے مقابل عارضۂ 'استسقا' کا ذکر کیا ہے (اس کے معنیٰ انھوں نے لکھے ہیں کہ وہ مرض جس میں پیاس بہت ہوتی، پیٹ بڑھتا جاتا، بدن ڈھیلا اور سُست ہوکر پھُول جاتا ہے)۔لفظ 'شہرت' تو ایک عام سا لفظ ہے اور اس سے تفاوت رکھنے والا لفظ انھوں نے 'تشہیر' رکھا ہے۔آج بہت کم لوگ اس لفظ کے اصل معنیٰ سے باخبر ہیں، اس ضمن میں موصوف نے لکھا ہے کہ کسی کی رسوائی کو شہرت دینا۔ پہلے دستور تھا کہ جس مجرم کی تشہیر کرنا ہوتی تھی تو اس کا منہ کالا کر کے، گدھے پر اُلٹا بٹھا کر آبادی میں اُسے پھراتے تھے (لکھنؤ میں مشہور شاعر یاس یگانہ چنگیزی کے ساتھ یہ عمل کیا گیا تھا جس کے چند روز بعد وہ انتقال کر گئے۔)

منشی غلام حسین صاحب آفاقؔ بنارسی نے تو تذکیر و تانیث پر باقاعدہ ایک لغت 'معین الشعرا' مرتب کر دی ہے (یہ لغت پاکستان میں بھی طبع ہو چکی ہے) جس کو اساتذہ کے اشعار سے مستند کیا گیا ہے۔

حال ہی میں وہاٹس ایپ پر ایک اُستاد کا لیکچر سُنا جو زبان کا درس دے رہا تھا۔اس اُستادِ محترم کی زبان سے 'تلمیح' کے ساتھ ایک لفظ اور سُنا 'تلمیع' (ت ل م ی ع)۔ بہت دیر نہیں، کئی دن تک اس لفظ میں ہم اُلجھے رہے تو پتا چلا کہ ایسے نجانے کتنے لفظ ہوں گے یا تو ہم سِرے سے ان لفظوں کے معنیٰ ہی نہیں جانتے یا پھر ہم نے انھیں بھلا دِیا اور پھر یوں ہوا کہ ان لفظوں نے بھی ہم سے منہ پھیر لیا۔ وہ تو اللہ کو رحم آ گیا اور نیوجرسی (امریکہ) سے محترم سید سلطان عباس نے فون کی گھنٹی بجائی اور اُن سے دیگر موضوعات پر بات ہو رہی تھی کہ سیّدی سے ہم نے ''تلمیع'' کا سوال کر لیا، انھیں ایک منٹ نہیں لگا اور بتایا:

''میاں! کسی شعر میں یا کسی عبارت میں معنوی قربت رکھنے والے دیگر زبانوں کے لفظوں کے یکجا ہونے کو تلمیع کہتے ہیں۔''

ہم نے عرض کیا، کسی مثال کے ذریعے سمجھا سکتے ہیں؟۔۔۔جس پر انھیں چند منٹ ہی لگے اور موصوف نے فاضلِ بریلوی شاہ احمد رضا خاںؔ کی مشہور و مقبول نعت کا حوالہ دِیا کہ یہ پوری نعت اسی صنعتِ تلمیع کا مثالی نمونہ ہے۔ نیوجرسی سے سیدِ محترم نے آن کی آن اُس نعت کے تین شعر سنا دِیے جو ہم نے ماضی میں پڑھی اور نعت خوانوں سے سُنی بھی مگر ہماری بدبختی تھی کہ اس صنعت سے بے خبر تھے۔ فاضل بریلوی کی نعت کے وہ شعر یہاں درج ہو جائیں تو شاید ہماری لفاظی کو بھی بَرَکتِ معنوی نصیب ہو جاوے:

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

اَلْبَحْرُ عَلَا وَالْمَوجُ طَغٰے من بیکس و طوفاں ہوشربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہَوا موری نیّا پار لگا جانا
اَلرُّوْحُ فِدَاکَ فَزِدْ حَرْقًا یک شعلہ دگر بر زن عشقا
موراتن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

فاضل بریلویؒ کی یہ پوری نعت اسی صنعتِ تلمیع میں ہے۔ اس کا پہلا ٹکڑا عربی، دوسرا فارسی اور مصرعِ ثانی کا پہلا ٹکڑا خالص ہندی (وہ بھی پوربی ہندی) میں اور آخری ٹکڑے میں اُردو جلوہ بنی ہوئی ہے۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ اب اس نعت کو سبقاً سبقاً پڑھانے اور سمجھانے والے بھی نایاب ہیں، بزرگوں کے درس بھی جاری وساری رہتے ہیں یہ نعت اپنی صنعت میں ایک واضح درس ہی تو ہے۔ اب جسے توفیق ملے وہ مستفید ہوجاوے، اللہ! فاضلِ بریلویؒ کے درجات بلند کرے۔ آمین

یہ مضمون لکھتے وقت یہ خیال نہیں تھا کہ اس کی تمہید میں اتنے صفحے خرچ ہوجائیں گے۔ دراصل اگر اچھی چیز نہیں بنتی تو وہ اچھی چیزیں جو ماضی میں ضبطِ تحریر میں آچکی ہیں ان کا اِعادہ بھی ایک مستحسن عمل ہوگا وہ یوں کہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے کے ذہن میں کوئی 'نئی بات' پیدا ہوجاوے۔ پاکستان میں ایک شاعرہ گزری ہیں محترمہ بسمل صابری، ان کا ایک مطلع مشہور ہوا، یہاں کے مشاعروں کی نظامت میں ڈاکٹر بشیر بدؔر وہ مطلع یوں پڑھتے تھے:

وہ اشک بن کے مِری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

ایک دن اس مطلع کے دوسرے لفظ نے جیسے احتجاج کیا کہ ندیؔم میاں! میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، بتایئے کہ جب چشمِ تر ہے تو پھر مجھ 'اشک' کی کیا ضرورت آن پڑی!! ہم نے توجہ کی تو پتا چلا:

محترمہ بسمؔل نے۔۔۔ 'اشک'۔۔۔ کہا ہی نہیں تھا، انھوں نے تو۔۔۔ 'عکس'۔۔۔ کہا تھا، سہوِ سماعت یا کسی اور طرح یہ ''عکس'' سے ''اشک'' میں بدل گیا۔ بالکل اسی طرح حشو وزوائد کا ایک نمونہ ہماری سماعت سے یوں بھی گزرا:

کچھ اشک ٹپک آئے مِرے دیدۂ تر سے
آوارہ جو ہوتے ہیں نکل جاتے ہیں گھر سے

اس مطلع میں بھی وہی عیب دَر آیا کہ جب دیدہ۔۔۔ تر ہے تو پھر 'اشک' کی کیا ضرورت؟
اب ذرا اِس مطلع کو یوں پڑھ کر دیکھیے اور بتایئے کہ لفظ کی اس تبدیلی کے بعد کیا شعر کی معنویت

کسی طور متاثر ہوتی ہے؟

کچھ درد ٹپک آئے مرے دیدۂ تر سے
آوارہ جو ہوتے ہیں نکل جاتے ہیں گھر سے

(ہر چند کہ اس مطلع کے ثانی مصرع میں 'آوارہ' اور 'گھر سے' بھی محلِ نظر ہے۔)

زبان کی خوبیاں اور مسائل یقیناً ہم سب کے لیے دلچسپی اور کچھ نت نئے کا سراغ بن جاتے ہیں اور اس دَور میں جبکہ زبان ہی خدشات کی زد میں ہے ایسے میں ہمارے علم الدین جیسے غازی۔۔۔ زبان کے بھولے بسرے قواعد اور کلیے کے لیے فکر مند ہیں۔ان کا یہ عمل اپنے آپ میں نہایت مستحسن اور قابلِ قدر ہی نہیں قابلِ احترام بھی ہے۔

اس دورِ پُرفتن میں ہم جیسے بے علم اپنے تشخص اور اپنی ناموری کے لیے مَرے جا رہے ہیں مگر غازی علم الدین زبان کی حرمت اور اس سلسلے میں باقاعدہ، ایک تسلسل سے کام کر رہے ہیں۔ ان کا 'لسانی زاویے' کے نام سے جو کام ہمارے سامنے ہے وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی شعبوں کے متعلقین کو اُن سے اس موضوع پر نصابی کتب تصنیف یا مرتب کروانی چاہئیں۔ پیشِ نگاہ کتاب اپنے آپ میں لسانیات کے کوئی دو درجن سے زائد نہایت وقیع و علمی موضوعات کو سمیٹے ہوئے ہے جن میں لسانی قاعدے اور جزئیات پر سلیقے اور علمی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم میں اکثر لکھنے پڑھنے والے ان قاعدے کلیے سے یا تو ناواقف ہیں یا پھر ان کی اہمیت اور ضرورت سے لاپروا۔۔۔ یہی دیکھیے کہ اس کتاب کا اوّلین مضمون جس کا عنوان ''اضافتِ مقلوب اور ہماری نافہمی'' ہے ہم صرف اس موضوع پر جب متوجہ ہوئے تو ہم پر لاعلمی کے دَر کھلتے چلے گئے۔ غازی علم الدین نے جس طرح اضافت کے مختلف معانی اور ان کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے وہ طلبا ہی کے لیے نہیں بلکہ ہم جیسوں کے لیے بھی آموختہ کے ساتھ، کئی نکات بھی واضح کر دیتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اضافتوں کے سلسلے کی وہ غلطیاں جو ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں اُن پر بھی انھوں نے سلیقے سے اور بہت کم لفظوں میں سمجھا دِیا ہے مثلاً: 'سرورق' کو لیجیے۔ اچھے خاصے شعرا و ادبا اور اساتذہ حضرات بھی اس غلطی کے عام طور پر مرتکب ملتے ہیں۔

''سَرِ ورَق نہیں، سَرُوَرَق ہے

یہ ترکیب کسرۂ اضافت کے بغیر ہوگی کیونکہ یہ مقلوب صورت ہے۔ یہ اصل میں 'ورقِ سَر' ہے جسے عملِ تقلیب کے بعد سَرُ وَرَق بنالیا گیا۔ اس کا معنیٰ ہے کتاب کا پہلا وَرَق یعنی ٹائٹل پیج (Title Page)۔ اس ترکیب میں سَر کے معانی ابتدا، چوٹی اور عنوان کے ہیں۔ سَرِ ورَق (کسرۂ اضافت کے ساتھ) کہنے

کی صورت میں اس کا معنیٰ ہو جائے گا 'ورق کا سَر' جو ایک بے معنیٰ سی ترکیب ٹھہرے گی۔''

اسی طرح جنابِ غازی نے پسِ نوشت اور پس نوشت۔۔۔آبِ جُو اور آب جُو پر بھی ہمیں متوجہ کیا ہے۔ عام طور پر نئے اساتذہ بھی شاید و باید ہی جانتے ہوں کہ قواعد کی ایک اصطلاح ہے جسے 'امالہ' کہا جاتا ہے۔

امالہ کیا ہوتا ہے؟

اُردو کے ایک مشہور افسانہ نگار احمد ہمیشؔ گزرے ہیں ان کے تعلق سے ایک واقعہ کہیں پڑھا تھا کہ وہ 'اِمالہ' کے مسئلے پر جوشؔ ملیح آبادی سے اُلجھے ہوئے تھے اور کسی طور وہ امالہ کو ماننے سے منکر تھے تو جوشؔ نے انھیں جس آسانی سے سمجھانے کی کوشش کی وہ بھی ایک سبق سے کم نہیں۔ جوشؔ نے فرمایا:

''میاں! یوں سمجھیے کہ آپ کے دادا جان گھڑ سواری کا شوق کرتے تھے اور یہی گھڑ سواری کا شوق اُن کے لیے اِک دن جان لیوا ثابت ہوا۔۔۔وہ یوں کہ گھوڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا کہ اِک موڑ پر دادا جان گھوڑے پر قابو کھو بیٹھے اور زمین پر آ رہے جہاں ایک بڑا پتھر پڑا ہوا تھا اور اُن کا سَر اُس پتھر سے جا ٹکرایا اور آن کی آن وہ جاں بحق ہو گئے تو ذرا بتایئے کہ اب آپ یہ کہیں گے: میرے دادا جان گھوڑا سے گر کر مر گئے۔۔۔یا یہ کہیں گے کہ۔۔۔دادا جان گھوڑے سے گر کر مر گئے۔

گھوڑا اور گھوڑے کا یہی فرق ہے جو اِس جملے میں ہے اور اسی کو 'امالہ' کہا جاتا ہے۔''

امالہ کی ایک مثال اور

شہر کا نام تو کلکتہ ہے مگر وقتِ ضرورت اسے کلکتے بھی کہا جاتا ہے مثلاً:

''کلکتے کے مشہور شعرا میں رضا علی وحشتؔ کا نام اوّل لیا جائے گا۔''

ایسی دوسری مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ امالہ دراصل ہمارے قواعد کی وہ اصطلاح ہے، جس کا استعمال بول چال میں تو عام ہے مگر عام طور پر لوگ باگ اس اصطلاح کے نام سے ناواقف ہیں۔ غازی علم الدین صاحب نے اپنے انداز سے اِجمالاً اس پر خوب کلام کیا ہے جس سے اس کی تعریف اور اس کی معنوی حیثیت اور اس کا صَرف وغیرہ واضح ہو جاتا ہے:

ایک مثال یوں ہے:

''جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں ''ہ'' یا اَلِف ہو اور فوراً بعد کوئی حرفِ عاملہ آ جائے تو اِمالہ کیا جائے گا مثلاً آپ کے بارہ میں۔۔۔اس افسانہ کا۔۔۔تمہارے بھروسا پر۔۔۔وہ چوراہا میں کھڑا تھا،

کے بجائے یوں لکھنا صحیح ہوگا:

آپ کے بارے میں، اس افسانے کا، تمہارے بھروسے پر، وہ چوراہے میں کھڑا تھا۔''

اسی طرح انھوں نے ان الفاظ کی بعض مثالیں بھی درج کردی ہیں جو امالے کو قبول نہیں کرتے۔ مثلاً:

''ایسے توصیفی الفاظ جن کے اخیر میں الف نون اور ہائے خفی (آنہ) کا اضافہ ہوتا ہے ان میں اِمالہ نہیں ہوسکتا جیسے عاشقانہ، جاہلانہ، مجاہدانہ وغیرہ لیکن جن میں یہ لاحقہ نہ ہو جُزوِلفظ ہو اُن میں امالہ ہوتا ہے جیسے دیوانہ سے دیوانے، پروانہ سے پروانے اور جرمانہ سے جرمانے۔

عربی کے بابِ افعال کے جو مصدر اُردو میں مستعمل ہیں اور جن کے آخر میں الف بھی ہے جیسے اِملا، انشا وغیرہ، ان میں امالہ نہیں ہوتا یعنی الف 'یے' سے نہیں بدلتا۔ 'املا' کو لوگ غلطی سے 'املے' لکھتے اور بولتے ہیں مثلاً 'املے کی غلطی' یہ درست نہیں ہے۔ ایسی ہی صورت لفظ 'انشا' کی ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے لوگ اس کا بھی امالہ کردیتے ہیں جیسے 'انشے کی کاپی' ایسے بولنا اور لکھنا غلط ہے۔''

غازی صاحب نے آگے یہ بھی لکھا ہے:

''آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں امالہ جائز نہیں جیسے کلوا، چندا۔ شہروں کے ناموں میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کی یہ رائے ہے کلکتہ، آگرہ وغیرہ میں امالہ جائز ہے جب کہ بعض کہتے ہیں کہ بوجہ اسمِ علم ہونے کے امالہ جائز نہیں۔''

اس اختلاف کا ایک نمونہ ہم نے جوشؔ ملیح آبادی کے ہاں پڑھا ہے، وہ کسی زمانے میں فلموں میں کام کے سبب ممبئی سے قریب شہر 'پونہ' میں مقیم تھے تو انھوں نے کسی کو لکھا تھا کہ

''مَیں آئندہ اتوار کو 'پونے' سے ممبئی پہنچوں گا۔''

اس جملے میں پونہ کا امالہ کیا گیا ہے۔ حُسنِ اتفاق کہ اب سرکاری طور پر پونہؔ کا نام بدل کر ''پونےؔ'' ہی رکھ دیا گیا ہے اور یہی ایک شہر نہیں ممبئی سے متصل ٹاؤن جو ''تھانہ'' کے نام سے معروف تھا، اب اسے بھی سرکاری طور پر 'تھانے' کر دِیا گیا ہے۔ اس کی وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ ہم اس سے بے خبر ہیں مگر گمان غالب ہے کہ مراٹھی زبان پر عربی اور فارسی کے اثرات کا جو غلبہ ہے، عجب نہیں کہ پونہ اور پونے۔۔۔ تھانہ اور تھانے میں بھی یہی امالہ کام کررہا ہو۔

یہ امر توجہ طلب ہے کہ مراٹھی زبان میں عربی اور فارسی کے نجانے کتنے لفظ اب تک ایسے رائج ہیں کہ جن کا چلن ہی اب ہمارے ہاں نہیں رہا مثلاً آکڑائی نا کہ کو یوپی والے چنگی ناکہ کہتے ہیں اور

مہاراشٹر میں اسے 'زکات ناکہ'' کہا جاتا ہے البتہ زکات کا تلفظ 'جکات' ہو گیا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں کل تک جلسۂ عام ہوتا تھا مگر مراٹھی والوں کے ہاں آج بھی ''جاہر جلسہ'' (ظاہر جلسہ) ہی ہو رہا ہے۔ مہاراشٹر کی عدالتی زبان میں تو آج بھی بے شمار اصطلاحیں عربی اور فارسی ہی کی رائج ہیں اور مراٹھی حضرات کو اس پر کوئی تاسف بھی نہیں۔ اس کے برعکس ممبئی میں نون غنّہ ہضم کر لیا گیا ہے اکثر اوقات ''ہیں'' کی جگہ ''ہے'' بولا ہی نہیں جاتا، اب تو یہاں کے اُردو اخبارات میں لکھا بھی جا رہا ہے۔

غازی صاحب نے اس کتاب میں زبان کے قاعدے کلیے اور لفظ کے استعمال اور لفظ کے صَرف پر خوب خوب کلام کیا ہے۔ مثلاً ''ہر لفظ کی جمع نہیں بنائی جاسکتی۔''

اس عنوان کے تحت ان کی یہ بات صد فیصد صحیح اور توجہ طلب ہے:

''کتنے ہی ایسے الفاظ ہیں جن کی جمع لانا درست نہیں جیسے سوچ، غیرت، احساس، مرضی، فصاحت، بلاغت، نفاست، ذکاوت، حراست، قساوت اور طلاقت وغیرہ۔ یہ اسما اگر چہ واحد ہیں لیکن جمع کے مفہوم کو بھی واضح کرتے ہیں۔ سوچ سے سوچوں اور سوچیں، غیرت سے غیرتوں اور غیرتیں، احساس سے احساسات، مرضی سے مرضیوں اور مرضیاں، فصاحت سے فصاحتوں اور فصاحتیں، بلاغت سے بلاغتوں اور بلاغتیں، نفاست سے نفاستوں اور نفاستیں، ذکاوت سے ذکاوتوں اور ذکاوتیں، حراست سے حراستوں اور حراستیں، قساوت سے قساوتوں اور قساوتیں اور طلاقت سے طلاقتوں اور طلاقتیں بنانا غیر فصیح اور غیر مانوس ہے نیز ذوقِ سلیم کے خلاف بھی۔''

غازی صاحب کی کتاب 'لسانی زاویے' علم و ادب میں اضافہ ہے یا نہیں (یہ اہلِ علم جانیں) مگر ہمارے نزدیک اس چراغ کی لو کو روشن رکھنے کی ایک توانا کوشش بہر حال ہے۔ ہم نے جیسا کہ لکھا ہے کہ غازی صاحب کی ان مساعی کو ہمارے نصاب میں شمولیت ملنی چاہیے ایسے لوگ اب ہر جگہ ناپید ہیں، غازی علم الدین سے مستفید نہ ہونا کفرانِ نعمت ہوگا۔ ایک وقت تھا کہ ہمارے گھروں میں ہماری نانی، دادی، خالہ، پھوپھی اور ماں زبان اور زبان سے متعلق باریکیوں کو کس قدر ملحوظ رکھتی تھیں کہ جس کی ایک مثال ڈاکٹر ظ انصاری کی والدہ سے متعلق ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ جنھوں نے ایک غلط لفظ بولنے پر اپنے بیٹے کو لوہے کا موٹا چمٹا پھینک مارا تھا، جس سے اُن کے لختِ جگر کے پیر کا ناخن اُدھڑ گیا اور بیٹا بھی کیسا کہ جس نے ہمیں خود بتایا تھا:

''لوہے کے موٹے چمٹے نے پاؤں کا جو ناخن اُدھیڑا تھا، اس کا نشان تو عمر کے ساتھ جاتا رہا مگر آدھی صدی گزرنے کو ہے، پوری عمر میں پھر وہ لفظ زبان سے نہیں نکلا، بلکہ کسی کے منہ سے جب بھی

کوئی غلط تلفظ، یا غلط لفظ سنتا ہوں تو پیَر کے ناخن سے لے کر دماغ تک ایک سنسناہٹ بلکہ ایک کرنٹ محسوس ہوتا ہے۔''

لفظ کی یہ حرمت و وقعت اور یہ قوت ہمارے ہاں اب ختم ہو رہی ہے۔ ایسے میں غازی صاحب کی مساعی کو ہمیں بڑھانا ہی نہیں چاہیے انھیں ہر طرح کی کمک بھی پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ زبان ہی نہیں پوری تہذیب بھی متاثر ہوگی۔

کسی کے گھر فون کی گھنٹی بجی، نوجوان نے فون پر ہیلو کہا تو اُدھر سے سوال کیا گیا:

''آپ کے والدِ بزرگوار تشریف رکھتے ہیں؟''

نوجوان نے ماں کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا:

''ارے کوئی بہت گاڑھی اُردو بول رہا ہے۔''

مگر اب ہمارے گھروں کی مائیں ہی اُردو بھول گئی ہیں یا پھر اُن کی تربیت ہی نہیں ہو سکی۔ ایک محفل میں مشہور شاعر و فلم اسکرپٹ رائٹر جاوید اختر نے نوجوانوں سے کہا تھا کہ اگر اُردو سے محبت ہے تو آپ کو اُردو جاننے والی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے کہ اس طرح آپ کی زبان بھی پھلے پھولے گی اور آپ کے گھر میں اُردو کا چمن اپنے گلاب و بیلے اور چنبیلی سے مہکتا رہے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ زبان و ادب سے کیا ملنے والا ہے، اب لوگ ہر معاملے میں بنیا گیری جیسے مزاج کے حامل ہو گئے ہیں۔ زندگی میں بہت سے مرحلے ایسے آتے ہیں کہ جہاں نفع اور نقصان نہیں دیکھا جاتا۔ زندگی کے راستے میں کس موڑ پر، کون سا امتحان آپ کا انتظار کر رہا ہے کس کو پتا!!

حجاج بن یوسف کے دَور کا ایک واقعہ اس وقت مذکور ہوا چاہتا ہے:

''حجاج بن یوسف نے اپنے دورِ حکومت میں ایک بار، ایک قانون کا نفاذ کرتے ہوئے اعلان کروایا کہ لوگ رات میں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ گھروں سے باہر نکل کر باتیں نہ کریں، اکٹھا ہو کر کسی جگہ پر باتیں نہ کریں، قانون شکنی کرنے والوں کو سخت سزا دِی جائے گی۔ ایک شب تین نوجوان جو آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے، ایک جگہ بیٹھ کر گفتگو کرتے پائے گئے۔ پہرے دار نے تینوں کو پکڑ کر حجاج کے سامنے پیش کر دیا۔ حجاج نے ایک نوجوان سے مخاطب ہو کر پوچھا تم کون ہو، تمہارا باپ کون ہے؟

نوجوان نے ادب سے سَر جھکا کر کہا: میرا باپ وہ ہے جو روزانہ سیکڑوں آدمیوں کو کھانا کِھلاتا ہے۔ حجاج سن کر متاثر ہوا اور سمجھا کہ یہ کسی سخی باپ کا بیٹا ہے۔

دوسرے نوجوان سے وہی سوال کیا۔ دوسرے نے کہا کہ میں اُس باپ کا بیٹا ہوں جس کے

سامنے بڑے بڑے لوگ سَر جھکاتے ہیں۔ حجاج نے خیال کیا کہ یہ کوئی باوقار امیر کا بیٹا ہے۔ تیسرے نوجوان نے کہا میں اُس باپ کا بیٹا ہوں جو، ہر دِن پچاسوں آدمیوں کو کپڑے پہناتا ہے۔ حجاج نے گمان کیا کہ یہ کوئی دولت مند کا فرزند ہے۔ حجاج نے تینوں کے نام و پتے درج کر کے ہدایت وتنبیہ کی اور چھوڑ دِیا، بعد میں مخبر بھیج کر تینوں کے حالات وکوائف معلوم کروائے تو معلوم ہوا کہ پہلا نوجوان ایک باورچی کا، دوسرا نائی کا اور تیسرا درزی کا بیٹا ہے۔ حجاج نے یہ سُن کر دربار میں لوگوں کو اکٹھا کر کے کہا کہ لوگو! تم اپنے بچوں کو زبان وادب سکھاؤ، زبان وادب پڑھاؤ کہ ان تینوں کی ادبی زبان نے اُن کی جان بچالی۔‘‘

ادب کی بنیاد میں ’زبان‘ ہی اپنا کام کرتی ہے، چاہے وہ کوئی بھی زبان ہو، کوئی بھی ادب، اپنی زبان اور حُسنِ زبان کے بغیر بے معنیٰ ہوگا۔

لفظ ہی سے زبان وجود پاتی ہے اور زبان سے ادب، لفظ زندہ وجان دار ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر ہمارا وجود مہمل اور بے معنیٰ ہوجائے گا۔ ہمیں اپنی زبان وادب اور اس کی نزاکتوں اور محاسن کو بہر حال زندہ رکھنا ہوگا۔ غازی علم الدین ہماری زبان ہی کے لیے نہیں بلکہ بالواسطہ ہمارے وجود کے لیے بھی ایک سِپر سے کم نہیں، ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے۔ وہ قدر نہیں جو ایوارڈ اور اعزاز دے کر کی جاتی ہے بلکہ ان کی قدر یوں ہو کہ انھوں نے زبان وادب کا جو علَم بلند کر رکھا ہے اسے اپنی درس گاہوں، دانش کدوں میں نئی نسل کے ہاتھوں تک پہنچا دینا چاہیے۔

ندیم صدیقی (ممبئی۔ اِنڈیا)
سابق انچارج جمعہ میگزین وادبی امور
روزنامہ انقلاب (ممبئی)، روزنامہ قومی آواز (ممبئی)
روزنامہ اُردو ٹائمز (ممبئی)، روزنامہ ممبئی اُردو نیوز
۱۸/ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ، یکم مئی ۲۰۲۱ء

اِضافتِ مقلوب اور ہماری نافہمی

زبان، انسانی شخصیت میں ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔[۱] قوتِ تکلم، انسانی شرف کا ہمیشہ ایک امتیازی وصف رہا ہے۔ اسلام ہمہ گیر راہ نمائی کا مدّعی ہے اس لیے قوتِ اظہار کے اس شرف پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ الفاظ ہماری زندگیوں میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسلام میں پہلی وحی کے نزول کی ابتدا ہی 'اقرا' سے ہوتی ہے یعنی 'پڑھیں'۔[۲] اس وحی میں جو پڑھنے کی ہدایت ہے، وہ یقیناً الفاظ سے متعلق ہے۔ زندہ قوموں کی روایت ہے کہ وہ اپنے زبان و بیان پر فخر کرتی ہیں۔ ہر متحرک قوم اپنے لسانی سرمائے کو زندہ رکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ تلفظ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں متکلم کی، کسی زبان میں استعداد اور مہارت کا عکس نظر آتا ہے۔ صحتِ تلفظ، اصلاحِ زبان کا اہم پہلو ہے مگر بدقسمتی سے لسانی انتشار اور بگاڑ ختم ہونے کی بجائے آئے دن فزوں تر ہو رہا ہے۔ ذمہ دار اور پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے لکھنے، بولنے، پڑھنے اور پڑھانے میں قومی زبان کی تخریب اس سے محبت کرنے والوں پر شاق گزرتی ہے۔ تخریبِ زبان کا یہ عمل جب سرکاری اور نیم سرکاری نشریاتی ادارے تواتر سے دہراتے ہیں تو اصلاحِ احوال کی ساری اُمیدیں دم توڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ آئے روز دہرائی جانے والی غلطیوں میں 'اضافت' کے استعمال کے ضمن میں کی جانے والی غلطیاں بھی ہیں۔ سوشل میڈیا نے اضافت کی غلطیوں کی تکرار کا اس قدر غدر مچا رکھا ہے کہ الامان والحفیظ۔ لکھنے میں کسرۂ اضافت کی جگہ ''ے'' کا اضافہ رواج پکڑ چکا ہے۔ شیرے پہاڑ، فخرے بنگال، والیے لاہور، شاہے مدینہ، کاشانہ اے نبوت، نبی اے رحمت، دورے حاضر اور اس طرح کے دیگر انتشارات میرے جیسے کمزور طالبِ علم پر انقباض طاری کرتے رہتے ہیں۔

اضافت کا معنی و مفہوم

اضافت کا لغوی معنی تو تعلق، لگاؤ اور نسبت ہے لیکن قواعدِ نحو کی رو سے اضافت، دو یا دو سے

زائد افراد یا چیزوں کی باہمی نسبت اور تعلق کو کہا جاتا ہے۔ دو اسم جب آپس میں حرفِ اضافت کی مدد سے ملتے ہیں تو اُن میں ایک تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اس تعلق کو اضافت کہتے ہیں۔ جس اسم کا تعلق ظاہر کیا جائے اُسے مضاف اور جس سے تعلق اور نسبت قائم ہو، اُسے مضاف الیہ کہتے ہیں۔ دونوں کا مجموعہ مرکب اضافی کہلاتا ہے۔ اُردو میں مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں ہوتا ہے مثلاً زید کا قلم۔ اس ترکیب میں زید مضاف الیہ ہے، 'کا' حرفِ اضافت اور 'قلم' مضاف۔ بعض صورتوں میں ترکیب اس طرح بھی ہو جاتی ہے: 'قلم زید کا'، 'بیٹا زید کا' وغیرہ [۳] یعنی پہلے مضاف پھر مضاف الیہ، اس کے بعد حرفِ اضافت۔ حرفِ اضافت، ہر دو صورت میں مضاف الیہ کے بعد ہی آئے گا۔

اُردو میں مستعمل فارسی قاعدے کے مطابق، مضاف مقدم ہوتا ہے اور کسرۂ اضافت اسے مضاف الیہ سے ملاتا ہے جیسے 'دردِ دل' یعنی دل کا درد، 'خانۂ خدا' یعنی خدا کا گھر، 'شدتِ غم' یعنی غم کی شدت وغیرہ۔ جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے، اضافت کی صورت میں اس ''ی'' کے نیچے زیر آئے گی نہ کہ ہمزہ مثلاً مرضیِ خدا، رعنائیِ خیال اور آزادیٔ وطن کی تراکیب ہمزہ کے اضافے کے ساتھ غلط تصور کی جائیں گی۔ مرضیِ خدا، رعنائیِ خیال اور آزادیِ وطن (کسرۂ اضافت کے ساتھ) ہی درست ہوں گی۔ [۴] اس قاعدے کے مطابق مضاف اور مضاف الیہ کا عربی اور فارسی ہونا ضروری ہے۔ اس سے ہٹ کر، خواہ اس میں صوتی حُسن بھی پایا جاتا ہو، قواعد کی رُو سے صحیح نہیں مانا جائے گا جیسے ٹکڑۂ زمین، سپوتِ پاکستان، روگِ عشق، زاویۂ سوچ، پسِ سکرین، پسینۂ جبیں، پھولِ چمن، بلندیِ پہاڑ، درپنِ دل، فخرِ دھرتی، رنگِ پھول، رقبۂ پلاٹ، غمِ سماج، سطحِ پانی وغیرہ۔ [۵] عربی کے کچھ مرکباتِ اضافی بھی اُردو میں مستعمل ہیں اور اس قدر جذب ہو گئے ہیں کہ مِن وعَن اُردو ہی کے سمجھے جاتے ہیں جیسے رسول اللہ، کتاب اللہ، ملک الموت، رب العالمین، رحمۃ للعالمین، حق الیقین، عید الفطر، عید الاضحیٰ، قاضی القضاۃ، مطلق العنان، قرۃ العین، مدینۃ النبی، تحت الثریٰ، عند الضرورت اور عند الطلب وغیرہ۔ اگرچہ مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد میں ہے تاہم مذکورہ مثالوں میں کسرۂ اضافت کسی طور پر نہیں آ سکتا۔

ہمارے نصابِ تعلیم سے عربی اور فارسی کو آہستہ آہستہ ختم کیا جا رہا ہے جس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہم اُن خوب صورت الفاظ و تراکیب سے بے بہرہ اور ناآشنا ہو رہے ہیں جو اُردو زبان و ادب کا حسنِ یگانہ ہیں۔ آج کل طلبہ، اساتذہ اور پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں، ادیب اور شاعر بھی ان تراکیب کو استعمال کرنے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ جہاں اِضافت ہونی چاہیے وہاں فارسی سے نابلد یہ لوگ اضافت کھا جاتے ہیں اور جہاں اضافت نہیں ہے 'زیرِ اضافت' کا غلط استعمال کرتے ہوئے وہاں بھی

اضافت لگاتے چلے جاتے ہیں۔ اضافت کی متعدد قسمیں ہیں جیسے اضافتِ مطلق، اضافتِ ملک، اضافتِ نسبی، اضافتِ ظرفی، اضافتِ توضیحی، اضافتِ مادی، اضافتِ علّت و سبب، اضافتِ شبہی، اضافتِ استعارہ، اضافتِ وصفی، اضافتِ ابنی، اضافتِ بیانی، اضافتِ تخصیصی، اضافتِ مقلوب وغیرہ مگر یہاں صرف اضافتِ مقلوب کی تصریح و توضیح مقصود ہے۔

اِضافتِ مقلوب کا معنی و مفہوم

مقلوب کا لفظی معنی ہے پلٹا گیا، پلٹا ہوا، یا اُلٹایا گیا، اُلٹایا ہوا۔ اُردو کے قواعد کی رُو سے اضافتِ مقلوب اُس ترکیب کو کہتے ہیں جس میں مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں آتا ہے نیز اس میں کسرۂ اضافت کا استعمال نہیں ہوتا۔ مضاف اور مضاف الیہ کے اُلٹنے اور ایک دوسرے کی جگہ پر آنے کو عملِ تقلیب کہا جاتا ہے۔ اس عمل میں جہاں مضاف اور مضاف الیہ اُلٹتے ہیں وہاں ترکیب کے معنی بھی اُلٹ جاتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد اضافتِ مقلوب کی بابت لکھتے ہیں کہ:

> ''مضاف ہمیشہ پہلے ہوتا ہے مگر اکثر جگہ ترکیب الٹ دیتے ہیں اور اسے اضافتِ مقلوب کہتے ہیں مثلاً جہان شاہ، شاہان شاہ وغیرہ۔''[٦]

یہ ترکیب اصل میں ''شاہِ جہان'' (جہان کا بادشاہ) اور ''شاہِ شاہان'' (بادشاہوں کا بادشاہ) تھی لیکن عملِ تقلیب کی وجہ سے جہان شاہ اور شاہان شاہ ہوگئی۔ مضاف الیہ (جہان اور شاہان) پہلے آ گیا اور مضاف (شاہ) بعد میں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ''جہاں شاہ'' کی مثال تو دے دی ہے مگر اس کا چلن اب ختم ہو چکا ہے۔ 'فکِّ اضافت' کے قاعدے کے مطابق اس کی جگہ شاہ جہان (کسرۂ اضافت کے بغیر) ہی بولا اور لکھا جاتا ہے، البتہ شاہان شاہ (جس کی مخفف صورت شاہنشاہ اور شہنشاہ ہے) کا استعمال بدستور مروّج ہے۔ پروفیسر عبدالستار صدیقی نے اضافتِ مقلوب کی بابت لکھا ہے کہ:

> ''ایک دوسری صورت اضافت کی ہے کہ پہلے مضاف الیہ پھر مضاف [یعنی فارسی کے مرکب اضافی کے عام رواج کے برعکس جس میں مضاف پہلے آتا ہے] اور دونوں کے بیچ میں کوئی تیسری چیز نہیں۔ اسے فارسی کے نحویوں نے ''اضافتِ مقلوب'' کا نام دیا۔ پہلے دور کی [فارسی] زبان میں اضافت کی یہی ایک صورت ہے جیسے ''شاہان شاہ'' (جس سے شاہنشاہ پھر شہنشاہ ہوگیا)۔''[۷]

اضافت کے غلط استعمال کی عمومی مثالیں

کسرۂ اضافت کے غلط استعمال سے اُردو زبان کے حالات خراب تر صورت کی طرف جا رہے

ہیں۔ ایک تو اُردو میں اعراب لگانے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے جس کی وجہ سے مرکب اضافی میں کسرۂ اضافت بھی اکثر نہیں لکھا جاتا، دوسرا ستم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ جو تراکیب کسرۂ اضافت کے بغیر مستعمل ہیں وہاں ہمارے اردو مصنّفین ومؤلفین لکھتے وقت بے دھڑک کسرۂ اضافت لکھ دیتے ہیں جس سے اکثر تراکیب کے معانی غتر بود ہو جاتے ہیں۔ اُردو زبان میں مرکبِ اضافی کی ایسی سیکڑوں مثالیں موجود ہیں جن میں اضافتِ مقلوب کا قاعدہ مستعمل ہے، ان میں سے کچھ مثالیں قارئین کے ملاحظہ کے لیے پیش کی جاتی ہیں جن کی ترتیب اُن کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھ کر قائم کی گئی ہے:

پیشِ لفظ نہیں، پیش لفظ ہے

یہ ترکیب اصل میں 'لفظِ پیش' ہے جسے عملِ تقلیب کے بعد 'پیش لفظ' بنا لیا گیا۔ یہاں پیش کی ش پر کسرۂ اضافت ہرگز نہیں ہے ورنہ معنی بدل جائے گا۔ 'پیش لفظ' کا معنی ہے وہ تعارفی تحریر جو متنِ کتاب سے پہلے ہو۔ یہ تحریر عام طور پر مصنفِ کتاب کے سوا کسی اور ادیب کی ہوتی ہے۔ اُردو میں اسے 'مقدمہ' اور 'دیباچہ' بھی کہتے ہیں، انگریزی میں preface کہا جاتا ہے۔ 'پیش' کا لغوی معنی ہے پہلے، سامنے اور آگے۔ یہ 'پس' (پیچھے) کی ضد ہے۔ ترکیب میں اگر کسرۂ اضافت لگا دیا جائے تو 'پیشِ لفظ' کا معنی بن جائے گا لفظ کے سامنے یا لفظ سے پہلے اور یہ ترکیب اُردو میں کہیں بھی مستعمل نہیں ہے۔

پسِ منظر نہیں، پس منظر ہے

پس منظر (کسرۂ اضافت کے بغیر) اصل میں 'منظرِ پس' ہے یعنی 'پیچھے کا منظر' جسے انگریزی میں بیک گراؤنڈ (background) کہتے ہیں۔ تقلیب کے عمل نے اپنا کام کیا اور اسے 'پس منظر' بنا دیا۔ پس منظر کا مطلب ہے کسی واقعہ کے اسباب ومحرکات جو اس کے وجود میں آنے کا باعث ہوئے ہوں، کسی تصویر یا منظر کا وہ حصّہ جو دیکھنے والے سے دور تر ہو، ماحول جس میں کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو، اصل حقیقت جو بدیہی طور پر نظر نہ آئے۔ [۸] اس ترکیب کو اگر 'پسِ منظر' (سین کے نیچے کسرۂ اضافت کے ساتھ) پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا 'منظر کے پیچھے' (behind the scene) اس طرح یہ معنیٰ بالکل مختلف ہو جائیں گے اور یہ اضافتِ مقلوب نہیں رہے گی۔ اس قسم کی دیگر مثالیں 'پسِ دیوار' (دیوار کے پیچھے)، 'پسِ آئینہ' (آئینے کے پیچھے)، 'پسِ پردہ' (پردے کے پیچھے) اور 'پسِ پشت' (پیچھے کی طرف) وغیرہ ہیں۔

پیشِ اِمام نہیں، پیش اِمام ہے

پیش اِمام اصل میں اِمامِ پیش ہے یعنی آگے یا سامنے کا امام اور یہ اضافتِ مقلوب ہے۔

پیشِ منظر نہیں، پیش منظر ہے

پیشِ منظر (کسرۂ اضافت کے بغیر) 'منظرِ پیش' کی مقلوب صورت ہے جس کا معنی ہے سامنے کا منظر (Scenario)، منظرنامہ، اس بات کا بیان کہ حال اور مستقبل میں واقعات و معاملات کے کس انداز میں وقوع پذیر ہونے کا امکان ہے۔ پیشِ منظر (کسرۂ اِضافت کے ساتھ) ایک دوسری ترکیب بنانے کی کوشش ہوسکتی ہے جس کا معنی ہوگا 'منظر کے سامنے' لیکن اردو میں یہ ترکیب مستعمل نہیں ہے۔ ہاں! ایک ترکیب 'پیشِ نظر' ہے جو بالکل درست ہے اور اس کا معنی ہے 'نظر کے سامنے' لیکن بات منظر کی ہو رہی ہے نظر کی نہیں۔

سَرِ وَرَق نہیں، سَرُ وَرَق ہے

یہ ترکیب کسرۂ اِضافت کے بغیر ہوگی کیونکہ یہ مقلوب صورت ہے۔ یہ اصل میں 'ورقِ سَر' ہے جسے عملِ تقلیب کے بعد سَرُوَرَق بنا لیا گیا۔ اس کا معنی ہے کتاب کا پہلا ورق یعنی ٹائٹل پیج (title page)۔ اس ترکیب میں سر کے معانی ابتدا، چوٹی اور عنوان کے ہیں۔ سرِ وَرَق (کسرۂ اضافت کے ساتھ) کہنے کی صورت میں اس کا معنی ہو جائے گا 'ورق کا سر' جو ایک بے معنی سی ترکیب ٹھہرے گی۔

پسِ نوشت نہیں، پس نوشت ہے

پس نوشت (کسرۂ اضافت کے بغیر) اصل میں 'نوشتۂ پس' کی مقلوب صورت ہے۔ اس کا مطلب ہے صفحے کی پُشت پر چند سطری تحریر، کوئی وضاحتی یا تاکیدی بات جو خط لکھنے کے بعد یاد آئے۔ مکتوب نگاری میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خط میں لکھے سے رہ جانے والی بات یا وضاحت اختتامِ متن کے نیچے یا صفحے کے دوسری طرف نہایت اختصار سے لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے مقابل پسِ نوشت (کسرۂ اضافت کے ساتھ) ایک مہمل ترکیب ہے۔

خط و کتابت نہیں، خط کتابت ہے

مُندرجہ بالا مثالوں میں کسرۂ اِضافت کے غلط استعمال کو واضح کیا گیا ہے لیکن 'خط و کتابت' ایسی ترکیب ہے جس میں کسرۂ اِضافت کی بجائے 'واوِ عاطفہ' کا غلط استعمال کیا گیا ہے یعنی یہ ترکیب خط کتابت ہے خط و کتابت نہیں۔ خط کتابت اصل میں 'کتابتِ خط' کی مقلوب صورت ہے جس کا معنی ہے خط لکھنا۔ یہ ترکیب، عملِ تقلیب کے بعد خط کتابت (کسرۂ اضافت کے بغیر) ہوگئی جس کا مطلب ہے خط لکھنا، مراسلت کرنا۔ خط و کتابت کی ترکیب کسی طور پر درست نہیں ہے کیونکہ اس میں واوِ عاطفہ غیر ضروری ہی

نہیں، بالکل غلط ہے۔ کتابت عربی مصدر ہے جس کا معنی ہے لکھنا۔ اس لحاظ سے 'خط و کتابت' کا معنی اور مفہوم ہو جائے گا 'خط اور لکھنا' جو بے معنی سی بات ہے۔

ذیل میں دو سندیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوگا کہ نثر نگاروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ شعرائے کرام نے بھی اپنی شاعری میں خط و کتابت نہیں، خط کتابت (واوِ عاطفہ کے بغیر) ہی استعمال کیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کا شعر ہے:

راہ و رسمِ خط کتابت ہی سہی
گل نہیں تو گل کی نکہت ہی سہی [۹]

'خط کتابت' کی سند میرؔ کے ہاں بھی ملتی ہے:

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے تجھے   آویں گے گھر بار کی، تیری، خبر کو بار بار
جب گیا میں یاد سے، تب کس کا گھر، کاہے کا پاس   آفریں، صد آفریں اے مردمانِ روزگار [۱۰]

آبِ جُو اور آب جُو میں فرق

آبِ جُو کا معنیٰ 'ندی کا پانی' ہے جب کہ آب جُو (آبجُو) اضافتِ مقلوب کے قاعدے کے مطابق 'جوئے آب' ہے جس کا معنی ہے 'پانی کی ندی'۔

آبِ دیدہ اور آب دیدہ میں فرق

آبِ دیدہ کا معنیٰ ہے 'آنکھ کا پانی' یعنی آنسو، اشک۔ اضافتِ مقلوب کے قاعدے کے مطابق آب دیدہ اصل میں 'دیدۂ آب' ہے یعنی پانی (آنسو) بھری آنکھ۔

ترکیب ''خوں بہا'' کا مفہوم

''خوں بہا'' کی ترکیب ایک ایسی ترکیب ہے جسے سنتے اور پڑھتے ہی، عام لوگوں کے ذہن میں خون بہانے کا تصوّر آ جاتا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہاں ''بہا'' بہانا مصدر سے نہیں ہے۔ یہ فارسی ترکیب اضافتِ مقلوب ہے جس کی اصل صورت ''بہائے خون'' ہے۔ بہا کا معنی یہاں قیمت ہے۔ یہ ترکیب ایک اِصطلاح کے طور پر مستعمل ہے جس کا مطلب ہے دیت ۔۔۔ وہ نقدی جو مقتول کے وارث بعوض خون لیں۔ سند کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

تن کو جو قتل گہ میں ملے نقد داغِ زخم
ہم سمجھے خوں بہا تیری تلوار سے مِلا
(رشکؔ) [۱۱]

اضافتِ مقلوب کی کچھ ایسی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جنھیں بولنے اور لکھنے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے:۔

غلط استعمال	صحیح استعمال اور معانی
پسِ افگندہ	پس افگندہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) پیچھے پھینکا ہوا، گوبر، پاخانہ یا بیٹ۔
پسِ انداز	پس انداز (کسرۂ اضافت کے بغیر) بچا ہوا، جمع کیا ہوا، باقی، بچت، کفایت شعاری۔
پسِ پا	پس پا (کسرۂ اضافت کے بغیر) واپس، اُلٹے پاؤں، شکست خوردہ۔
پسِ خوردہ	پس خوردہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) بچا ہوا کھانا، جُھوٹا، اُلش۔
پسِ خیمہ	پس خیمہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) فوج یا قافلے کا پچھلا خیمہ، فوج کے پیچھے چلنے والا ساز وسامان، فوج یا قافلے کے پیچھے چلنے والا حِصّہ۔
پسِ ماندہ	پس ماندہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) پیچھے رہا ہوا، بچا ہوا، مرنے والے کا وارِث۔
پیشِ افتادہ	پیش افتادہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) سامنے پڑا ہوا، فرسودہ، پامال، معمولی۔
پیشِ امام	پیش امام (کسرۂ اضافت کے بغیر) نماز پڑھانے والا، امامت کرنے والا۔
پیشِ اندیش	پیش اندیش (کسرۂ اضافت کے بغیر) عاقبت اندیش۔
پیشِ بندی	پیش بندی (کسرۂ اضافت کے بغیر) کسی بات کا پہلے سے انتظام یا تدارک، روک تھام۔
پیشِ بیں	پیش بیں (کسرۂ اضافت کے بغیر) عاقبت اندیش، دوراندیش۔
پیشِ خیمہ	پیش خیمہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) وہ خیمہ جو اگلی منزل پر بھیج دیا جاتا ہے تاکہ پہنچنے پر انتظار نہ کرنا پڑے، ہراول دستہ، کسی کام کے ظہور کا سامان۔
پیشِ دست	پیش دست (کسرۂ اضافت کے بغیر) پہل کرنے والا، سبقت کرنے والا۔
پیشِ رفت	پیش رفت (کسرۂ اضافت کے بغیر) کسی کام کا آگے بڑھنا۔
پیشِ قدمی	پیش قدمی (کسرۂ اضافت کے بغیر) سبقت، آگے بڑھنا، چڑھائی کرنا۔
پیشِ کش	پیش کش (کسرۂ اضافت کے بغیر) نذرانہ، تحفہ، presentation۔
پیشِ قبض	پیش قبض (کسرۂ اضافت کے بغیر) خنجر، چُھرا۔
پیشِ گاہ	پیش گاہ (کسرۂ اضافت کے بغیر) عمارت کا اگلہ حصّہ، دالان، برآمدہ۔
پیشِ وا	پیش وا (کسرۂ اضافت کے بغیر) امام، سربراہ۔

اسی طرح سربراہ، سربرہنہ، سرُبریدہ، سربزانو، سربستہ، سربسر، سربہ صحرا، سربفلک، سربکف، سربگریباں، سربلند، سربمہر، سربند، سرپرست، سرتابی، سرتاج،، سرچشمہ، سرخوش، سردار، سررشتہ، سرزد، سرسبز، سرشار، سرغنہ، سرکردہ، سرکش، سرگزشت، سرگرداں، سرگرمی، سرگوشی، سرمست، سرنام، سرنگوں وغیرہ میں سر کے ''ر'' پر کسرۂ اضافت نہیں آئے گا۔

اُردو اشعار میں، بعض اوقات قدیم فارسی انداز پر مستعمل، اضافتِ مقلوب بھی آجاتی ہے مثلاً مردِ خوب سے ''ے'' کے اضافے کے ساتھ خوب مردے۔ اضافتِ مقلوب لانا غالبؔ کا خاص انداز ہے۔[۱۲]

فارسی کے بعض مرکبات میں کسرۂ اضافت کا وجود ہوتا ہے لیکن اسے پڑھا اور لکھا نہیں جاتا۔ اگر کوئی اسے استعمال کرنا جائز سمجھے تو قاعدے سے انحراف نہیں ہوگا مگر ترجیح چلن کو حاصل ہو گی۔ کسرۂ اضافت نکال دینے کو 'فکِّ اِضافت' کہتے ہیں۔ فک عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں الگ کرنا، چھڑانا اور جگہ سے ہٹا دینا۔ اِسی سے اردو میں 'جزوِ لاینفک' کی ترکیب مستعمل ہے جس کا معنی ہے وہ حصہ جسے الگ نہ کیا جاسکے۔ 'فکِّ اضافت' میں مرکب کے دو حصوں کو چھڑا کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ پروفیسر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں:

> ''جب مضاف اور مضاف الیہ میں گہرا میل ہو جاتا ہے اور کوئی مرکب بہت زیادہ استعمال ہونے لگتا ہے تو اس میں سے اضافت کا کسرہ جاتا رہتا ہے، جیسے صاحبِ دل سے صاحب دل، شاہِ جہاں سے شاہ جہاں، نورِ جہاں سے نور جہاں اور مالکِ مکان سے مالک مکان۔''[۱۳]

مختلف تراکیب کی تین ایسی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جو اضافتِ مقلوب کی ذیل اور بحث میں نہیں آتیں لیکن اکثر لوگ بلکہ پڑھے لکھے اصحاب، انھیں غلط بولتے اور لکھتے ہیں اور کسرۂ اضافت کا بے جا استعمال کرتے ہیں۔

دستِ نگر نہیں، دست نِگر ہے

دستِ نگر (دست کی ت پر کسرۂ اضافت اور نگر کے نُون پر زبر) کا معنی ہے 'شہر کا ہاتھ'۔ یہ سراسر مہمل اور لغو ترکیب ہے۔ یہ اصل میں 'دست نِگر' (''ت'' کسرۂ اضافت کے بغیر اور نون کے نیچے زیر) ہے۔ نِگر، نِگریستن مصدر سے ہے جس کا معنی ہے دیکھنا۔ اسی سے نگران ہے یعنی دیکھنے والا، نگرانی بھی اسی سے ہے۔ دست نِگر کا مطلب ہے مانگنے کی غرض سے کسی کے ہاتھ کی طرف دیکھنے والا یعنی سائل،

محتاج، حاجت مند اور فقیر وغیرہ۔

جانِ آفریں نہیں، جاں آفریں ہے

جانِ آفریں (نون کے نیچے زیر) کا مطلب ہے 'پیدا کرنے والے کی جان'۔ اس معنی کا تصور ہی بہت خوفناک ہے۔ آفریں، آفریدن مصدر سے ہے اور 'جاں آفریں' کا معنی ہے جان پیدا کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ۔ عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ 'اس نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی' جو کہ سراسر غلط ہے۔ اس جملے کو اس طرح ہونا چاہیے: 'اُس نے اپنی جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی'۔

چشمِ زدن نہیں، چشم زدن ہے

'چشم زدن' میں چشم کی میم پر کسرۂ اضافت نہیں ہے۔ چشمِ زدن (کسرۂ اضافت کے ساتھ) کا معنی انتہائی مہمل اور لغو بنتا ہے یعنی 'زدن (مارنا) کی آنکھ'۔ چشم زدن کا لغوی معنی ہے آنکھ مارنا، آنکھ جھپکنا جب کہ اس کا مفہوم اور مطلب ہے لمحہ بھر۔ 'چشم زدن میں' کا مطلب ہوگا لمحہ بھر میں، فوراً، بہت جلد اور بہت تیزی سے۔

اضافتِ مقلوب کی بحث سے ہٹ کر، کچھ تراکیب ایسی ہیں جو کسرۂ اضافت کے ساتھ اور معنیٰ دیتی ہیں لیکن اگر ترکیب کو اُلٹا دیا جائے تو ایک نیا معنیٰ نکلتا ہے جیسے کلامِ شیریں کا مطلب ہے 'عمدہ کلام' جب کہ شیریں کلام کا معنیٰ ہے 'خوش گفتار'۔ اسی طرح کچھ ترکیبیں ایسی ہیں جن پر کسرۂ اضافت لگانے سے ایک معنیٰ نکلتا ہے، کسرۂ اضافت نہ لگانے سے دوسرا معنیٰ جیسے نصیبِ خفتہ یعنی 'سویا ہوا نصیب' اور نصیب خفتہ کا معنیٰ ہے 'بدنصیب'۔

اُردو کی حفاظت اور صحتِ زبان پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ بزرگوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نئی نسل کو درست اور خالص زبان منتقل کریں۔ درست اور غلطیوں سے پاک زبان سامع اور قاری پر خوش گوار اثر ڈالتی ہے۔ اضافت کے قواعد کو سمجھنا اور محلِ استعمال کو جاننا اردو کی حفاظت کا ایک طریقہ ہے۔ اس ضمن میں ہیچ مداں کی یہ ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ ٥ سورہ الروم:۲۲

۲۔ العلق:۹٦

۳۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، جامع القواعد حصّہ نحو (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹۔اپر مال، ۲۰۰۳ء) ص ۵۱

۴۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، صحتِ املا کے اصول (کراچی۔ادارۂ یادگارِ غالب، ۲۰۱٦ء) ص ۱۴

۵۔ خواجہ محمد عارف، اردو ہے جس کا نام، [غیر مطبوعہ مضمون، مخزونہ راقم الحروف] مضمون نگار......شاعر، ادیب اور لسان شناس ہیں۔انگلستان میں مقیم ہیں

٦۔ محمد حسین آزاد، جامع القواعد (لاہور: رائے صاحب ایم گلاب سنگھ اینڈ سنز، ۱۹۰۷ء) ص ۱۱۰ [تیرھواں ایڈیشن]، [اشاعتِ اوّل ۱۸۸۹ء]

بحوالہ رؤف پاریکھ، ذکر اضافت کھانے اور اضافت کے اضافے کا، مشمولہ قومی زبان، شمارہ جنوری ۲۱۰۹ء، (کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان) ص ۵۷

۷۔ عبدالستار صدیقی، مقالاتِ صدیقی، پہلا حصّہ، (لکھنؤ: اتر پردیش اکیڈمی، ۱۹۸۳ء) ص ۱۴۵

بحوالہ رؤف پاریکھ، ذکر اضافت کھانے اور اضافت کے اضافے کا، مشمولہ قومی زبان، شمارہ جنوری ۲۱۰۹ء، (کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان) ص ٦۷

۸۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء) ص ۲۳۸

۹۔ اسمٰعیل میرٹھی، کلیاتِ اسمٰعیل (میرٹھ: اورینٹل پبلشنگ کمپنی، ۱۹۱۰ء) ص ۲۷۹

بحوالہ رؤف پاریکھ، ذکر اضافت کھانے اور اضافت کے اضافے کا، مشمولہ: قومی زبان، شمارہ جنوری ۲۱۰۹ء، (کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان) ص ۷۷

۱۰۔ رؤف پاریکھ، اردو کے چند نادر الفاظ و تراکیب، مشمولہ مباحث، مدیر ڈاکٹر تحسین فراقی، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء، (لاہور: اردو منزل ۳۲۵۔ای جوہر ٹاؤن) ص ۲۳۵

۱۱۔ نیر، مولوی نور الحسن، نور اللغات، جلد ۲ (لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۹ء) ص ۱۲۷۰

۱۲۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، جامع القواعد حصّہ نحو (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۹۹۔اپر مال، ۲۰۰۳ء) ص ۵۴

۱۳۔ عبدالستار صدیقی، مقالات صدیقی، پہلا حصہ، (لکھنؤ: اتر پردیش اکیڈمی، ۱۹۸۳ء) ص ۱۴۵

بحوالہ رؤف پاریکھ، ذکر اضافت کھانے اور اضافت کے اضافے کا، مشمولہ قومی زبان، شمارہ جنوری ۲۱۰۹ء، (کراچی: انجمن ترقیِ اردو پاکستان) ص ٦۷

’علاوہ‘ کی ذُو معنویت اور اِبہام و اِہمال

اُردو زبان کے استعمال میں بعض اِبہام تواتر سے سرزد ہو رہے ہیں جنھیں عام طور پر غلط نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کچھ ابہام اہلِ زبان کی تحریروں اور تقریروں میں بھی راہ پا چکے ہیں۔ ’علاوہ‘ کے استعمال میں، ایک عام رائج ابہام، بعض سکہ بند اہلِ زبان سے بھی سرزد ہوتا رہتا ہے۔ ایک اردو ٹی وی چینل پر نشر ہونے والے پروگرام میں، ایک معروف عالم اور مبلغ نے ایک نومسلم کو کلمہ طیبہ اور اس کا ترجمہ پڑھایا، ”اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔“[۱] یہاں ’سوا‘ کا محل تھا، ’علاوہ‘ کا استعمال درست نہیں کیا گیا۔ ’علاوہ‘ کو ذو معنی، مہمل اور مبہم بنا دیے جانے کی وجہ سے، اسے کلمہ طیبہ کے ترجمے میں استثنا کے طور پر لانا، اگر کوئی غلط نہ بھی سمجھے، نامناسب ضرور ہے۔ راقم کے نزدیک یہاں استثنا کے لیے ’سوا‘ ہی مکتفی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک معاصر ادبی اور تحقیقی مجلّہ، راقم کے زیرِ مطالعہ تھا کہ ایک معروف ادیب کی تحریر پر نظر رک گئی۔ انھوں نے لکھا، ”زبانیں وہ اپنی زبان کے علاوہ بہت خوبی سے نہ جانتی تھیں، سوا انگریزی۔“[۲] فاضل ادیب دراصل کہنا چاہتے تھے، ’وہ اپنی زبان اور انگریزی کے سوا، کوئی اور زبان خوبی سے نہیں جانتی تھیں‘۔[۳] یہاں یہ بحث مقصود نہیں ہے کہ فاضل ادیب کا جملہ محولہ بالا کمزور ہے یا نہیں، سوال جملے میں لفظ ’علاوہ‘ کے محلِّ استعمال کا ہے۔ فاضل ادیب کے پیشِ نظر ’علاوہ‘ کے معنی اگر مع اور بشمول کے ہیں تو جملے کا مطلب ہے کہ وہ اپنی زبان اور دیگر زبانیں بھی بہت خوبی سے نہیں جانتی تھیں سوا انگریزی کے۔ اگر یہاں ’علاوہ‘ کا معنی ’سوا‘ لیا گیا ہے تو جملہ لفظی و معنوی تکرار کی وجہ سے اِہمال و اِبہام کی زد میں آ گیا ہے جس سے مفہوم یوں اخذ ہوتا ہے، ’وہ اپنی زبان کے سوا دیگر زبانیں بہت خوبی سے نہیں جانتی تھیں سوا انگریزی کے‘۔

راقم نے کوئی چھے سال قبل، اس موضوع کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے، لسان شناس اہلِ ادب کے

سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تھا:

''نشر و اشاعت میں آج کل 'سوا' اور 'علاوہ' کے استعمال میں رائج غلطی کا مسلسل اعادہ ہو رہا ہے۔ بعض سکہ بند اہلِ زبان اور معروف ادیب اور صحافی بھی لکھنے اور بولنے میں اس غلطی کو دہرا رہے ہیں۔ سوا کی جگہ علاوہ اور علاوہ کی جگہ سوا کا استعمال بڑی لاپروائی اور بے احتیاطی سے ہو رہا ہے جس سے عبارت کے معانی بدل کر رہ جاتے ہیں۔ دونوں لفظوں کا اصل مفہوم ایک دوسرے کے الٹ ہے۔ سوا کلمۂ اِستثنا ہے جس کے معنی 'اسے چھوڑ کر'، 'بغیر' اور 'بجز' کے ہیں۔ سوا کے استعمال میں کسی ذات، چیز یا بات کی نفی مقصود ہوتی ہے مثلاً: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یعنی اللہ تو معبود ہے اُسے چھوڑ کر کوئی اور معبود نہیں ہے۔

علاوہ کے معنی 'اور بھی'، 'مزید' اور 'بشمول' کے ہیں۔ 'مزید برآں' بھی علاوہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے moreover کہتے ہیں۔ اس جملے کو مثال کے طور پر دیکھیے:

''پیامِ مشرق میں فلسفے کے علاوہ شعریت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔''

یعنی پیامِ مشرق میں فلسفہ تو موجود ہے مزید برآں اس میں شعری حُسن اور کمالِ جاذبیت کی بھی فراوانی ہے۔

سوا کو علاوہ اور علاوہ کو سوا کی جگہ غلط استعمال کرنے کی چند مثالیں موضوع کو واضح کرنے کے لئے مفید ثابت ہوں گی:

''اسلام کے علاوہ دیگر تمام ازم (نظام) کفر و شرک کی دعوت دیتے ہیں۔''

اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اسلام بھی اور دیگر تمام ازم بھی کفر و شرک کی دعوت دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ صحیح عبارت یوں ہونا چاہیے تھی:

''اسلام کے سوا دیگر تمام ازم کفر و شرک کی دعوت دیتے ہیں۔''

اسی طرح ایک اور فقرہ لیجیے: ''مرض الموت کے علاوہ ہر مرض کا علاج ہے۔''

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ مرض الموت کا بھی اور دیگر ہر مرض کا بھی علاج ہے۔ حال آں کہ جملے کا مدعا یہ تھا کہ مرض الموت کو چھوڑ کر باقی ہر مرض کا علاج ہے۔ لہٰذا جملہ یوں ہونا چاہیے تھا: ''مرض الموت کے سوا ہر مرض کا

علاج ہے۔''

اگر کسی محفل میں کوئی یہ کہے کہ میرے علاوہ سب احمق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود بھی احمق ہے۔ یہاں بھی 'علاوہ' کی جگہ 'سوا' کا محل ہے۔''[۴]

بعدازاں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں، راقم نے 'علاوہ' پر بحث کی تو ایک فاضل لسان شناس[۵] نے احتجاجی لہجے میں راقم کے نقطۂ نظر سے شدید اختلاف کیا اور فرمایا:

''اردو، عربی کی غلام یا فارسی کی کنیز نہیں ہے 'علاوہ' کو ہم جیسے چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔''[۶]

'علاوہ' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ ع، ل، و ہے۔ واو حرفِ علت ہے جو الف اور ی میں بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس سے نکلنے والے الفاظ سے ارتفاع، بلندی اور اونچائی کے معنی نکلتے ہیں۔ عربی میں کہا جاتا ہے: عَلَا صَوتُ الرَّجُلِ (آدمی کی آواز بلند ہوئی)۔ اَلْحَقُّ یَعْلُو دَائِماً (حق ہمیشہ غالب رہتا ہے)۔ عَلَوْتُ قِمَّۃَ الجَبَلِ (میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا)۔ اس مادے سے تشکیل پانے والے الفاظ میں سے علی، تعال، تعالیٰ، تعلّی، علوّ، علیٰ، مُتعالی، عِلّیِّین، عُلیا، اعلیٰ، متعال وغیرہ اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اگلے صفحوں میں آنے والی تفصیل کے مطابق 'علاوہ' کے لفظی اور لغوی معانی ہیں وہ چیز جو اپنے حق سے زیادہ مل جائے،......سرِ بار یعنی وہ چیز جو کسی چیز پر بڑھائیں،......اور کسی جانور کی پشت پر لدے ہوئے بوجھ کے اوپر ایک چھوٹا سا بوجھ، جیسے گدھے کے اوپر لدی ہوئی بوری، اور بوری پر رکھی ہوئی گٹھڑی، جو سب سے اوپر ہے۔ 'علاوہ' کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں 'میرے پاس کرسی، میز، کتاب، قلم اور کاغذ کے علاوہ روشنائی ہے'۔ یعنی کُل کے بڑے اور غالب حصے کو پہلے بیان کیا اور بعد میں باقی رہ جانے والے جز کو اضافے کے طور پر بیان کر کے نمایاں کر دیا گیا۔

'سوا'، 'اِلّا' اور 'غیر' تینوں عربی زبان کے وہ الفاظ ہیں جو اردو میں بھی کلماتِ استثنا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۲۔ میں تم سے قطعاً بات نہیں کروں گا اِلّا یہ کہ تم معذرت کر لو۔

۳۔ میں نے آپ کے بغیر یہ کام کر لیا۔

ان الفاظ کے علاوہ لفظ 'علاوہ' بھی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن یہ کلمۂ استثنا نہیں ہے، اس کے باوجود اُردو زبان میں اسے کلمۂ استثنا کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ تین مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔

۲۔کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے علاوہ مشکل کُشا اور حاجت روا ہستیاں ہیں۔

۳۔احمد کے علاوہ عارف اور ماجد آئے۔

پہلے جملے میں 'علاوہ' کا مطلب ہے کہ اللہ بھی نہیں، کوئی اور بھی معبود نہیں ہے۔ دوسرے میں 'علاوہ' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بھی مشکل کُشا اور حاجت روا ہے اور مزید کچھ ہستیاں بھی مشکل کشا اور حاجت روا ہیں۔ تیسرے جملے کا مطلب ہے کہ احمد، عارف اور ماجد تینوں آئے۔ ان مثالوں میں 'علاوہ' نے ایزاد، معیت اور اضافہ کا معنی دیا ہے۔ پہلے جملے میں منفی صورت میں، باقی دو میں اثبات کی شکل میں اضافہ ہے۔ ان تینوں مثالوں میں استثنا کہیں بھی نہیں، اس کے باوجود اُردو زبان میں اسے کلمۂ استثنا کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ راقم کی دانست میں یہ ذو معنی اور مہمل عمل ہے۔ ایک ہی مفہوم کو آج کے انداز میں بیان کریں تو یوں کہیں گے:

۱۔سب طالب علم آ گئے سوا حامد کے۔

۲۔سب طالب علم آ گئے علاوہ حامد کے۔

جو حضرات 'علاوہ' کو کلمۂ استثنا کے طور پر استعمال کرنے کے حق میں ہیں، وہ ذرا غور فرمائیں اور بتائیں کہ آیا یہاں دونوں جملوں کا مفہوم ایک ہی ہے یا دونوں جملے حامد کی متضاد حالت کو بتا رہے ہیں؟ پہلا جملہ کہہ رہا ہے حامد نہیں آیا، جب کہ دوسرا جملہ کہہ رہا ہے حامد آیا ہے ساتھ طالب علموں کے۔

راقم نے 'علاوہ' کی حقیقت اور اصل جاننے کے لیے عربی، اُردو اور انگریزی کے لغوی مصادر کی طرف رجوع کیا اور دست یاب مصادر کو کھنگالا۔ 'علاوہ' اپنی اصل کے مطابق عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی کے لغوی مصادر میں کہیں بھی اس لفظ کو کلمۂ استثنا نہیں کہا گیا، ہر جگہ اسے کلمۂ ایزاد، معیت، توسیع اور شراکت ہی بتایا گیا ہے۔ یہ تسلیم کہ عربی کے ایسے الفاظ کی ایک بڑی کھیپ اردو میں مستعمل ہے جو اپنے اصل معنی سے ہٹ کر ایک دوسرا اور الگ معنی دیتے ہیں تاہم 'علاوہ' کو اردو میں بیک وقت کلمۂ استثنا اور کلمۂ ایزاد (جو ایک دوسرے کی ضد ہیں) کے طور پر استعمال کرنے سے مفہوم ذو معنی، مبہم اور مہمل ہو جاتا ہے مثلاً:

طالب علم آئے علاوہ استاد کے۔

'علاوہ' کے مفہوم کو خلط ملط کر دینے کی بنا پر غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہاں 'علاوہ' کے بعد 'استاد' کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یا 'علاوہ' سے اضافہ، ایزاد اور شراکت مطلوب ہے۔ راقم کے علم میں اردو کا ایسا کوئی قاعدہ

کلیہ نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس مثال میں 'علاوہ' صرف استثنا کے لیے ہے یا صرف 'بشمول' کے معنوں میں ہے۔

لغوی مصادر، جو راقم کے پیشِ نظر رہے، کیا کہتے ہیں! آ یئے ملاحظہ کیجیے:

المنجد علاوہ: مَا زَادَ عَلَیْہِ. یُقَالُ: اَعْطَیْتُکَ اَلْفَ دِینارٍ و دینارًا علاوۃً. اَیُ زَیَادَۃً علٰی مَا یُحِقُّ لَکَ.[۷]

ترجمہ: (جو اس پر زیادہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ میں نے تجھے ایک ہزار دینار دیے اور ایک دینار اضافی یعنی تیرے حق سے زیادہ۔)

مصباح اللغات علاوہ: اضافہ۔ زائد۔ ہر چیز میں سے زیادہ۔ مثلاً میں نے تجھے ایک ہزار روپیہ دیا اور اس کے علاوہ دس روپے دیے یعنی دس مزید دیے۔[۸]

القاموس العصری علاوہ: زیادۃ .increase. addition. extra[۹]

المورد (انگریزی سے عربی) except: یَستَثْنِی. یَعْتَرِضُ عَلٰی. مَاعَدَا

exception: شذوذ. اِستثنا[۱۰]

except اور exception کے درج بالا معنوں میں 'علاوہ' کا ذکر نہیں ہے۔

addition / additional: شئ مضاف. بالاضافۃ اِلٰی. اضافی[۱۱]

beside/ besides: بالاضافۃ اِلٰی. علاوۃ علٰی.[۱۲]

addition اور besides کے معنوں میں سوا کا کوئی مفہوم اور ذکر نہیں ہے۔

قومی انگریزی اردو لغت except: شمار سے کسی چیز کو علیحدہ کر دینا۔ مستثنٰی کرنا۔ استثنا۔ بجز۔ الّا۔ سوائے[۱۳]

یہاں except کے معنی میں 'علاوہ' مذکور نہیں ہے۔

addition / additional: اضافی۔ زائد۔ مزید۔ علاوہ۔ فالتو۔[۱۴]

beside / besides: علاوہ ازیں۔ مزید برآں: فالتو[۱۵]

addition اور beside کی معنوں میں سوا کا مفہوم اور ذکر نہیں ہے۔

کتابستان ڈکشنری (اُردو۔ انگریزی) علاوہ:[۱۶] in addition to / besides:

یہاں علاوہ کے معنوں میں except مذکور نہیں ہے۔

فرہنگِ آصفیہ علاوہ: (تابع فعل) حرفِ استثنا۔ ماسوا۔ سوا۔ اس کے سوا۔ بجز۔

علاوہ: (تابع فعل) اور۔ اُوپر۔ فالتو۔ زیادہ۔ اور بھی۔ اس کے لغوی معنی اس تھوڑے سے بوجھ کے ہیں جو بڑے بوجھ کے اوپر رکھ لیتے ہیں۔ نیز ایک چیز جو دوسری چیز پر ہو۔ نیز وہ چیز جو کسی چیز پر بڑھائیں جسے فارسی میں سرِ بار کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں: (تابع فعل) اس کے ماسوا۔ اس کے باوجود۔[۱۷]

نور اللغات: علاوہ: ہر چیز جو دوسری چیز کے اوپر رکھ لی جائے۔ وہ چیز جو کسی چیز پر بڑھائیں۔ اس کے سوا۔ ماسوا۔ زیادہ۔ اور بھی۔ یہ لفظ شمول اور شراکت کے لیے بھی آتا ہے۔[۱۸]

فرہنگِ تلفظ: علاوہ: ایزاد اور استثنا کے لیے مستعمل۔ نیز کا مترادف یا سوائے مثلاً ''ہمارے علاوہ اور بھی تھے''، یعنی ہم تھے نیز اور بھی۔ ''ہمارے علاوہ سب تھے''، یعنی ہم نہ تھے باقی سب تھے۔[۱۹]

علمی اردو لغت: علاوہ: ماسوا۔ مزید۔ اور بھی۔

علاوہ ازیں: ماسوا۔ باوجودیکہ۔ مزید برایں۔ ماسوا اس کے۔[۲۰]

جامع اللغات: علاوہ: زیادہ۔ ماسوا۔ مزید۔ اور بھی۔

علاوہ ازیں/ علاوہ برایں: اس کے سوا۔ مزید برآں۔ باوجودیکہ۔ ماسوا اس کے۔[۲۱]

فرہنگِ عامرہ: علاوہ: سوا۔ بڑے بوجھ کے اوپر چھوٹا بوجھ۔[۲۲]

قاموسِ مترادفات: علاوہ: مزید۔ بشمول۔ اور۔ ماسوا۔ بجز۔[۲۳]

مندرجہ بالا لغتوں اور فرہنگوں میں دیے گئے 'علاوہ' کے معانی کو پرکھیں تو حقیقت کھلتی ہے کہ عربی اور انگریزی لغوی مصادر میں 'علاوہ' صرف کلمۂ ایزاد، اضافہ، شمول، شراکت اور توسیع ہے۔ ان لغوی مصادر میں 'علاوہ' کے ضمن میں دیئے گئے معانی میں کسی بھی کلمۂ استثنا کا ذکر نہیں ہے۔ اُردو کی سات مذکورہ فرہنگوں اور لغتوں میں 'علاوہ' کے معانی میں ایزاد اور استثنا، دونوں کو خلط ملط کر کے معنوی التباس پیدا کر دیا گیا۔ اس چلن کا نام غلط العام پڑ گیا جسے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے اب کوئی غلط العام بھی تصور نہیں کرتا۔ فرہنگِ آصفیہ اور علمی اردو لغت میں 'علاوہ' کی بابت، پہلے استثنا اور بعد میں ایزاد کے کلمات لکھے گئے ہیں جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ 'علاوہ' کے مفہوم میں اوّلیت استثنا کی ہے جب کہ ایزاد کی حیثیت ثانوی ہے۔ نور اللغات، جامع اللغات، علمی اردو لغت اور قاموسِ مترادفات میں 'علاوہ' کے مطالب میں ایزاد اور استثنا کے کلمات کو ملا کر، بغیر ترتیب کے لکھ دیا گیا ہے۔ فرہنگِ عامرہ میں 'علاوہ' کا معنی صرف 'سوا' مذکور ہے۔ فرہنگِ تلفظ میں 'علاوہ' کا معنی مندرج ہے، ''نیز کا مترادف یا سوائے۔'' 'یا' سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا

ہے کہ مذکورہ لغتیں مرتب کرنے والے 'علاوہ' کے معنی کی اصلیت اور قطعیت پر یکسو نہیں ہیں۔ اِسی فرہنگ میں 'علاوہ' سے ایزاد کے مقابل استثنا کا معنی نکالنے کے لیے دو مثالیں دی گئیں:

۱۔ ہمارے علاوہ اور بھی تھے۔ (یعنی ہم تھے نیز اور بھی)

۲۔ ہمارے علاوہ سب تھے۔ (یعنی ہم نہ تھے باقی سب تھے)

حیرانی کی بات ہے کہ مثال میں بیان کیے گئے جملے دو نہیں، جزوی فرق کے ساتھ ایک ہی جملہ ہے اور یہ واضح نہیں کیا گیا کہ 'علاوہ' سے ایزاد اور استثنا، دونوں کا مفہوم کس قاعدے کے تحت کشید کیا گیا ہے۔

عربی کے کلماتِ استثنا 'سوا'، 'ماسوا'، 'الاّ' اور 'غیر' اردو میں مستعمل ہیں، ان کے علاوہ 'لیکن' 'مگر'، 'چھوڑکر'، 'بجز' وغیرہ بھی کلماتِ استثنا ہیں تو پھر ایک ایسا کلمہ (علاوہ) کیوں استعمال کیا جائے جو لغوی اعتبار سے کلمۂ استثنا ہے ہی نہیں، اور غلط العام میں بھی ذو معنی، مبہم اور مہمل ہے۔ اُردو عبارتوں میں 'علاوہ' کے استعمال پر مشتمل ایسے کئی مبہم جملے ملتے ہیں، جنھیں دیکھ کر پڑھنے والے فیصلہ نہیں کر پاتے کہ یہاں 'علاوہ' کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ایک چشم کشا مثال ہی کافی ہے:

لوگ آئے علاوہ احمد کے۔

اس جملے سے واضح نہیں ہوتا کہ یہاں 'علاوہ' کے بعد احمد کو مستثنیٰ کیا گیا ہے یا ایزاد اور شمول مطلوب ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ Peace ٹی وی چینل پر ۴؍جون ۲۰۱۹ء کو نشر ہونے والے ایک پروگرام میں ڈاکٹر ذاکر نائک نے ایک غیر مسلم کو کلمہ طیبہ پڑھا کر مسلمان کیا اور ساتھ اس کلمے کا ترجمہ بھی پڑھایا۔ ترجمے میں ڈاکٹر ذاکر نائک نے ''سوا'' کی جگہ ''علاوہ'' ادا کیا۔

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تبصراتی خط مشمولہ: شمارہ اوّل بہ نگاہِ معاصرین، مشمولہ مباحث، مدیر ڈاکٹر تحسین فراقی، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۲ء، (لاہور: اردو منزل ۳۲۵۔ای جوہر ٹاؤن)، ص ۵۶۵۔

۳۔ یہ جملہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے جرمن سکالر ڈاکٹر این میری شمل کے بارے میں لکھا جس سے ان کا مدعا ہے کہ وہ جرمن اور انگریزی تو خوب جانتی تھیں مگر اردو اور فارسی لکھنے اور بولنے میں ماہر نہیں تھیں۔

۴۔ پروفیسر غازی علم الدین، لسانی مطالعے، (دہلی۔انڈیا: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۳۸......۱۳۹

۵۔ تشنہ بریلوی، تبصراتی خط بنام مدیر، مشمولہ ماہ نامہ چہار سو، مدیر گلزار جاوید، شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء (راولپنڈی: ویسٹرریج III)، ص ۱۱۸......۱۱۹

۶۔ جناب تشنہ بریلوی صاحب کے احتجاج کی شدت اور میرے نقطۂ نظر سے ناگواری اُن کے مکتوب محولہ بالا سے محسوس کی جا سکتی ہے ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''پروفیسر غازی علم الدین صاحب! جب علم 'روشن خیالی' کا دشمن ہو جائے تو پھر اردو کے لیے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ ایک شعر پیشِ خدمت ہے:

اردو ترا وجود تو خطرے میں پڑ گیا
گردن پہ ہیں سوار یہ پیرانِ تسمہ پا
تشنہ بریلوی (کراچی)

۷۔ لوئس معلوف یسوعی، المنجد، (بیروت: دارالمشرق، ۱۹۷۳ء)، ص ۵۲۸۔

۸۔ عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات [عربی اُردو]، (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)، ص ۵۷۴

۹۔ الیاس انطون الیاس، القاموس العصری، (قاہرہ۔مصر۔ا۔شارع کنیسہ الروم الکاثولیک بالظاہر، ۱۹۷۶ء) ص ۴۵۶

۱۰۔ مُنیر بعلبکی، المورد، [انگلش عربی ڈکشنری]، (بیروت-لبنان: دارالعلم للملایین، ۲۰۰۵ء)، ص ۳۲۴

۱۱۔ ....ایضاً...............................،ص ۲۷

۱۲۔ ....ایضاً...............................،ص۱۰۰

۱۳۔ ڈاکٹرجمیل جالبی،قومی انگریزی اردولغت،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان،۲۰۰۲ء)ص ۶۹۸

۱۴۔ ....ایضاً...............................،ص۲۴

۱۵۔ ....ایضاً...............................،ص ۱۷۸

۱۶۔ بشیراے قریشی، کتابستان ڈکشنری[اردوانگریزی]،(لاہور: ۳۸-اردو بازار،سن ندارد)ص ۴۳۷

۱۷۔ مولوی سیّداحمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ جلدسوم،(لاہور: اردوسائنس بورڈ،۲۰۰۳ء)ص ۲۸۰

۱۸۔ مولوی نورالحسن نیرّ، نوراللّغات جلدسوم،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء)ص ۵۶۱

۱۹۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۵ء)ص ۷۰۸

۲۰۔ وارث سرہندی، علمی اردولغت (لاہور: علمی کتاب گھر،۲۰۱۲ء)ص ۱۰۱۹

۲۱۔ خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات جلددوم،(لاہور: اردوسائنس بورڈ،۲۰۰۳ء)،ص،۱۴۰۲

۲۲۔ محمد عبداللہ خویشگی، فرہنگِ عامرہ،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان،۱۹۸۹ء)،ص ۴۲۷

۲۳۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات (لاہور: اردوسائنس بورڈ،۲۰۰۱ء)،ص ۸۱۰

لفظ اور معنیٰ کی تکرار کا عیب

اُردو کی شکل بگاڑنے کا مذموم عمل، تیز تر ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں، ٹیلی وژن کے درجنوں اُردو چینلز اور سوشل میڈیا کے گھناؤنے کردار کو زیرِ بحث لانا، وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اِن کے سُدھار کی، کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ صاحبِ نظر اور سنجیدہ فکر لوگوں کو تشویش لاحق ہے کہ اخبارات میں برتی جانے والی اُردو کا معیار نہایت پست ہو چکا ہے حتیٰ کہ ادارتی صفحوں پر شائع ہونے والے مضامین بھی، املا اور قواعد کی غلطیوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اُردو کے فروغ میں علمی اور ادبی رسائل و جرائد کا کردار بھر پور اور توانا رہا ہے مگر بدقسمتی سے آج کل اکثر رسائل میں اُردو غلط لکھی جاتی ہے جس سے اس کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اُردو کے نام پر، شہر شہر اور نگر نگر تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ اُردو کانفرنسیں، ثقافتی اجتماع اور بڑے بڑے کتاب میلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اِن سرگرمیوں میں بظاہر اُردو کا نام نمایاں ہے لیکن افسوس! اُردو کے اصل مسئلوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ لسانی بگاڑ عفریت کی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کے مداوے کی کوئی بات نہیں کرتا۔ لوگ خدا جانے کہاں کہاں سے کیسی کیسی ترکیبیں، روزمرہ اور محاورے اٹھا کر لا رہے ہیں۔ غلط تلفظ، غلط محاورے اور نت نئی اختراعاتِ بد رواج پذیر ہو رہی ہیں جن میں ایک لفظ و معنیٰ کے غلط اور بے جا تکرار کا عیب ہے جو ذوقِ سلیم رکھنے والوں پر گراں گزرتا ہے۔ یہ عمل عبارت اور گفتگو کے حسن کو گہنا دیتا ہے۔ لفظی تکرار معنوی تکرار کا باعث بنتی ہے، یہ جہاں سماعت کو بھلی نہیں لگتی وہاں بصری طور پر بھی ناگوار گزرتی ہے۔

تکرار کے غلط اور بے جا استعمال سے قطع نظر، نظم و نثر میں اس کو برتنے کے متعدد اچھے اور مفید پہلو بھی ہیں۔ مدّعا واضح کرنے، بات نکھارنے، پیرایۂ بیان دل کش بنانے، کسی مسئلے کی اہمیت اور تاکید کے لیے تکرار اہم کردار ادا کرتی ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء کے واقعات کی تکرار ہر مرتبہ نیا اور دل کش اُسلوب

سامنے لاتی ہے۔[۱] قرآنی الفاظ کی تکرار سے جہانِ معانی عیاں ہوتے ہیں۔[۲] آیاتِ مقدسہ کی تکرار سے حکمتوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔[۳] اُردو نظم و نثر میں بھی فعل کی تکرار سے کئی معانی پیدا ہوتے ہیں جیسے:

۱۔ وقت کی قلت ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں، ''ہمارے دیکھتے دیکھتے زمانہ بدل گیا۔''

۲۔ فعل کا جاری رہنا جیسے ''میں تو اُسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔''

۳۔ وقت کی درازی کے لیے جیسے:

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دے
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

۴۔ فعل کا وقوع کے قریب پہنچ کر رُک جانا جیسے: ''یہ بات میری زبان تک آتے آتے رہ گئی۔'' اور ''کام بنتے بنتے بگڑ گیا'' وغیرہ۔[۴]

اُردو نثر میں، لفظی تکرار کی ایسی مثالیں ہمیں جابجا نظر آتی ہیں جیسے: ''مجھے لمحہ لمحہ کی خبر ہے۔'' ...... ''میں نہر کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔'' ...... ''یہ قریب قریب دو ماہ پہلے کی بات ہے''۔ اور ''میں لفظ لفظ کی صحت کا خیال رکھتا ہوں'' وغیرہ۔

تکرار کے غلط استعمال میں، عام طور پر، ایک ہی جملے میں کسی بات کو لفظاً اور معناً دُہرا دیا جاتا ہے اور یہ مُضحک صورتِ حال جہالت، بلادت اور توجہ کے فقدان کا ثبوت بن جاتی ہے۔ آئے دن، ایسی سیکڑوں مثالیں ہمارے مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔ ممبئی (انڈیا) کے رہنے والے ہمارے محترم دوست ندیم صدیقی، جو نامی ادیب، شاعر، صحافی اور لسان شناس ہیں، الفاظ کے بے جا استعمال اور ناپسندیدہ تکرار کی بابت لکھتے ہیں:

> ''ہمارے استاد کہتے تھے کہ میاں! لفظ بھی سکّے کی مانند ہوتے ہیں۔ کیا آپ ایسا کرتے ہیں کہ جہاں پانچ روپے کے سکّے کی ادائیگی کی ضرورت ہو وہاں آپ پانچ کے دو تین سکّے دے دیتے ہوں؟ میاں! یاد رکھیے کہ کسی بھی چیز کا 'اِسراف' اُس چیز کے ساتھ ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اگر آپ لفظوں کے اِسراف کے عادی ہو گئے تو عجب نہیں کہ ایک دن آپ کے لفظوں سے معنیٰ ہی کم ہو جائیں۔ اچھی تحریر کے لیے اساتذہ نے کہا ہے کہ لفظ کم ہوں اور معنی زیادہ۔ اِسی کو بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بعض قلم کار لفظوں کے تھوک بیوپاری نظر آتے ہیں۔ ذرا غور و فکر

کے ترازو میں ان کی تحریر تولیے تو کلو بھر لفظوں میں دس گرام معنی برآمد ہوتے ہیں......
یہ بھی اِسراف ہی کی ایک شکل ہے۔"[۵]

تحریر و تقریر، انسانی شخصیت کا ثقافتی تلازمہ ہے۔ اہلِ ذوق اس امر کا اہتمام کرتے ہیں کہ زبان و بیان مسلّمہ اصول و معیار سے ہم آہنگ رہے۔ اس طرح کی مختلف النّوع لغزشیں اور فروگذاشتیں اگر تحریر و تقریر میں در آئیں تو زبان کی نزاکت کو سمجھنے والوں کی طبیعت تکدّر اور بیزاری کا شکار ہوتی ہے۔ ماضی میں شاعر و ادیب، اساتذہ اور صحافی حضرات ہی زبان و بیان کے معیار و وقار کا سبب بنتے تھے لیکن فی زماننا ان میں اکثر حضرات اس کی پروا نہیں کر رہے ہیں۔ خطرناک بات یہ ہے کہ محتاط روی کی تلقین کرنے والے ادیب، شاعر اور صحافی پھسل گئے تو ایک قوم پھسل جائے گی کیوں کہ علم و ادب کے معاملات میں لوگ اِنھیں کی پیروی کرتے ہیں۔

لفظی اور معنوی تکرار کی ایسی معیوب اور مذموم مثالیں، جو مطالعے اور مشاہدے میں آتی رہتی ہیں، پیش کی جاتی ہیں۔ یہ جائزہ عصری ادب کی سرگرمیوں کا عکاس ہے جس سے لکھنے اور بولنے کے معیار کا پتا چلے گا:

<u>آب دیدہ آنکھیں:</u> "وہ اپنی آب دیدہ آنکھوں سے مرحوم والد کی تصویر دیکھتا رہا۔" اس جملے میں 'آنکھوں' اضافی ہے، دیدہ کا معنیٰ ہی آنکھ ہے۔ آبْ دیدہ کا معنیٰ ہے 'جس شخص کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوں'۔ دوسری ترکیب 'آبِ دیدہ' ہے جس کا معنیٰ آنکھ کا پانی یعنی آنسو ہے۔ درست جملہ اس طرح ہے: "وہ آبْ دیدہ اپنے مرحوم والد کی تصویر دیکھتا رہا۔" یا یوں کہہ سکتے ہیں: "وہ آنسو بھری آنکھوں سے مرحوم والد کی......"

<u>آبِ زم زم کا پانی:</u> 'آبِ زم زم' درست ہے یا 'زم زم کا پانی' کہہ سکتے ہیں۔

<u>آپ کی محبت کشاں کشاں کھینچ لائی ہے:</u> 'کشاں' کشیدن (مصدر) سے ہے جس کا معنیٰ ہے کھینچنا۔ 'کشاں کشاں' کے بعد 'کھینچ لائی' کی زیادتی معنوی یکجائی کا باعث ہے۔ "آپ کی محبت کھینچ لائی ہے" سے بھی جملے کا مفہوم واضح ہو رہا ہے۔

<u>آئندہ آنے والے دنوں میں:</u> آئندہ دنوں میں یا آنے والے دنوں میں۔

<u>ابھی بھی:</u> "یہ کام ابھی بھی نامکمل ہے"۔ اس جملے میں "بھی" زائد ہے کیوں کہ 'ابھی' میں 'بھی' کا معنیٰ پہلے سے موجود ہے۔ یہ جملہ یوں ہونا چاہیے "یہ کام ابھی نامکمل ہے"

اٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں: اختر الایمان کی ایک مشہور نظم کا پہلا مصرع ہے:

اُٹھاؤ ہاتھ کہ دستِ دعا بلند کریں

عجیب بات ہے کہ جب ہاتھ اٹھا لیے گئے تو پھر 'دستِ دعا' بلند کرنا چہ معنٰی ؟ عجب حشو ہے۔ شاعر جو بات کہنا چاہتا ہے بڑی آسانی سے یوں کہہ سکتا تھا:

اُٹھاؤ ہاتھ کہ حرفِ دعا بلند کریں

اخباری اشتہار: پولیس نے کسی اخبار میں ایک اشتہار دیا جس کا عنوان تھا ''اخباری اشتہار۔'' گویا صرف اشتہار لکھنا کافی نہیں سمجھا گیا۔

ارباب ہائے اقتدار: ایک روزنامے کی سرخی ہے: ''ہمارے ارباب ہائے اقتدار ہوش کے ناخن لیں۔''
'ارباب' رب کی جمع ہے لہٰذا اس کے ساتھ فارسی علامتِ جمع ''ہائے'' کا استعمال غلط ہے۔ یہاں ''اربابِ اقتدار'' ہی درست ہے۔

ازبر یاد ہونا: ''مجھے یہ کہانی ازبر یاد ہوگئی'' 'ازبر ہونا' کا معنٰی ہی 'زبانی یاد ہونا' ہے۔ جملے میں ازبر کے بعد 'یاد' اضافی ہے۔

اس کام کو ازسرِ نو دوبارہ کریں: 'ازسرِ نو' اور 'دوبارہ' کو اکٹھا کرنا معنوی یکجائی کا باعث ہوگا۔ اس کام کو ازسرِ نو کریں، درست ہوگا، یا پھر 'اس کام کو دوبارہ کریں۔'

اسامی خالی ہے: 'اسامی' اسم کی جمع الجمع ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہ Vacancy یعنی نوکری، ملازمت اور عہدہ ہے جس کے لیے مناسب آدمی مطلوب ہے۔ اسامی (Vacancy) میں عہدے کے خالی (Vacant) ہونے کا معنٰی پہلے سے موجود ہے لہٰذا مناسب جملہ اس طرح ہوسکتا ہے: اسامی دستیاب ہے۔ اکثر لوگ اسامی کو آسامی لکھتے اور بولتے ہیں حالاں کہ آسامی کا معنیٰ ''آسام کا رہنے والا'' ہے۔

اس سبب کی وجہ سے: سبب اور وجہ دونوں ہم معنٰی ہیں۔ 'اِس سبب سے' یا 'اِس وجہ سے' ہونا چاہیے۔

اس کے باوجود بھی: 'باوجود' کا معنٰی ہے 'کسی چیز کے ہوتے ہوئے'...... اس کے بعد 'بھی' نہیں آئے گا کیوں کہ اس کا استعمال یہاں غیر ضروری اور زائد ہے۔

اس میں یہ راز پوشیدہ ہے: راز کا معنیٰ 'پوشیدہ بات' ہے لہٰذا پوشیدہ کا اضافہ غلط ہے۔

استعمال عمل میں لانا: اُردو ادب کے ایک استاد لسانی مباحث پر مبنی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اگر انسان اور انسانی حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اپنے بچپن سے لے کر لڑکپن، جوانی، بڑھاپے اور اپنی عمر کے آخری لمحے تک زبان کا کسی نہ کسی صورت میں استعمال عمل میں لاتا ہے۔''[٦]

اس جملے میں 'استعمال عمل میں لانا' نہایت قابلِ گرفت ہے۔ فاضل مصنف کو علم ہونا چاہیے کہ 'استعمال' (بابِ اِستِفعال) کا معنٰی ہی کسی چیز کو کام (عمل) میں لانا ہے۔ استعمال کے ساتھ 'عمل'، لکھنا بے خبری کی دلیل ہے۔ جملہ یوں ہونا چاہیے ''......آخری لمحے تک زبان کو کسی نہ کسی صورت میں استعمال کرتا ہے یا استعمال میں لاتا ہے۔''

استفادہ حاصل کرنا: اس کی درست صورت استفادہ کرنا یعنی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ استفادہ میں تحصیلِ فائدہ کا مفہوم چونکہ ازخود شامل ہے اس لیے استفادہ کرنا، لغوی اور معنوی اعتبار سے قائل کے مفہوم کا صحیح ترجمان ہے لہٰذا اس کے ساتھ لفظ 'حاصل' کا اضافہ محض تحصیلِ حاصل ہے یعنی ایسی چیز کی جستجو یا خواہش کرنا جو پہلے ہی ہمارے پاس موجود ہے۔

اس کام کا آغاز شروع ہو گیا: 'آغاز' کے بعد 'شروع' لکھنا سنگین غلطی ہے۔

اشکوں کا سیلاب: سیلاب اصل میں 'سیلِ آب' کا مرکب ہے جس کا معنی ہے 'پانی کا ریلا'۔ 'اشکوں کا سیلاب' کی جگہ 'سیلِ اشک' یا 'اشکوں کا سیل' ہونا چاہیے۔

اشیائے ضرورت کی چیزیں: ایک معروف اخبار کی خبر ہے: ''اشیائے ضرورت کی چیزیں سستی کی جائیں'' اشیاء اور چیزوں کو یکجا کر دینا بے خبری کی انتہا ہے۔ ''اشیائے ضرورت سستی کی جائیں'' یا ''ضرورت کی چیزیں سستی کی جائیں'' اِن دونوں میں سے ایک ہونا چاہیے۔

اعلیٰ ترین، ادنیٰ ترین، افضل ترین: اعلیٰ، ادنیٰ اور افضل......افعل التفضیل ہیں۔ 'ترین' بھی تفضیلِ کُل ہے۔ لہٰذا اعلیٰ، ادنیٰ اور افضل کے ساتھ ترین کی یکجائی خلافِ قواعد ہے۔

امن وامان: ''ملک میں امن وامان قائم ہو گیا ہے۔'' غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس ترکیب میں کوئی فالتو لفظ تو نہیں ہے؟ کیا یہاں دونوں لفظوں کی ضرورت ہے یا ایک ہی کافی ہوگا۔ 'امن' اور 'امان' میں بظاہر معنوی یکسانی محسوس ہوتی ہے مگر ان دونوں میں

معنیٰ کے اعتبار سے فرق ہے۔ 'امن' سے مراد ہے فساد کا نہ ہونا اور 'امان' کا مطلب کسی کی پناہ میں ہونا۔ جملہ اتنا ہی کافی ہے: 'ملک میں امن قائم ہو گیا ہے۔''

انراخ سے زائد قیمتوں کی وصولی: بارہ جون ۲۰۲۰ء کو میر پور آزاد کشمیر سے شائع ہونے والے ایک روزنامے ''آوازہ'' میں یہ خبر شائع ہوئی، ''میر پور میں انراخ سے زائد قیمتیں وصول کی جا رہی ہیں۔'' فارسی لفظ نرخ کی جمع عربی قاعدے کے مطابق انراخ بنائی گئی ہے جو وحدت جمع کے اصول کے خلاف ہے۔ نرخ اور قیمت کی یکجائی معنوی تکرار کے زمرے میں آتی ہے۔

اُن کا موضوعِ سخن سیاستِ حاضرہ ہے: ''اس جملے میں 'موضوعِ سخن' کے بجائے 'موضوع' ہونا چاہیے۔ موضوعِ سخن شاعری کے متعلق ہوتا ہے۔

اہلِ زبان لوگ: ماہ نامہ 'نیرنگِ خیال' راولپنڈی میں، ایک نیم مزاحیہ مضمون کا عنوان ہے ''اہلِ زبان لوگ مچھلی کیوں پسند کرتے ہیں''؟ لفظ 'اہل' کے سابقے میں از خود جمع کا مفہوم شامل ہے۔ ''اہلِ زبان'' لکھنے کی صورت میں یہ مفہوم بہت واضح ہے، اس پر لفظ 'لوگ' کا اضافہ ناجائز اور ناروا ہے۔ اہل جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً اہلِ علم (علم والے لوگ)، اہلِ شہر (شہر کے باشندے) اور اہلِ وطن (وطن کے لوگ) وغیرہ۔ کسی ایک شخص کو صاحبِ علم، صاحبِ رائے اور صاحبِ قلم لکھا جاتا ہے۔

اہلِ عُشّاق: 'اہل' جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے بعد والا اسم جمع نہیں، واحد ہوتا ہے۔ نظم و نثر میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں اس قاعدے کی خلاف ورزی نظر آتی ہے:

انقلاب آئے نہ آئے ہمیں کچھ غم تو نہیں
اہلِ عُشّاق تو خوش ہیں کہ مری جان ہے تو[۷]

'اہلِ عشاق' کی ترکیب 'اہل' کی متحمل نہیں ہو سکتی، کاش شاعر کو علامہ اقبال کا یہ شعر نظر آیا ہوتا:

آئے عُشّاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایصالِ ثواب پہنچانا: ''یہ کارِ خیر مرحوم کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے انجام دیا گیا ہے۔'' 'ایصالِ ثواب کے لیے' یا 'ثواب پہنچانے کے لیے' درست ہے۔ 'ایصال' اور 'پہنچانے' کو یکجا نہیں کیا

جا سکتا کیونکہ ایصال کا معنٰی ہی پہنچانا ہے۔

ایک مہینے بھر سے: 'مہینے بھر سے' یا 'ایک مہینے سے' کہنا چاہیے 'ایک'......اور 'بھر' کو اکٹھے نہیں کیا جا سکتا۔

اے لوگو! کسی مجمعے کو مخاطب کرنے کے لیے لوگو! کہا جاتا ہے۔ اے لوگو! نہیں۔ ''لوگو'' ہی میں اے کا مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔

اے لوگو! میری بات غور سے سنو: درست جملہ اس طرح ہوگا: ''لوگو! میری بات غور سے سنو''......۔ مخاطب کر کے 'لوگو' کہا جائے تو اس میں 'اے' کا مفہوم موجود ہوتا ہے۔ بعض لکھنے والے 'لوگو' کے ساتھ نون غُنّہ کا اضافہ کر کے غلط طور پر 'لوگوں' اور 'اے لوگوں' کر دیتے ہیں۔

بار بار اِعادہ کرنا: ''یہ اعتراضات علامہ شبلی کے زمانہ میں کافی عروج پر تھے اور بار بار اُن کا اِعادہ کیا جا رہا تھا۔''[۸]
'اعادہ' کا معنٰی ہی 'کسی بات کو بار بار کہنا' ہے لہٰذا جملے میں اِعادہ سے پہلے 'بار بار' زائد اور غلط ہے۔

باریک نکتہ: ''یہاں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ......'' یاد رہے کہ 'نکتہ' کا معنٰی ہی باریکی، 'باریک بات' یا 'لطیف بات' ہے۔ 'نکتے' کو اور کتنا باریک کیا جا سکتا ہے؟

بالائے طاق پر رکھنا: 'بالا' اور 'پر' کو یکجا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ دونوں ہم معنٰی ہیں۔ یہ ملفوظات ایک سابق وفاقی وزیر کے ہیں کہ ''حکومت نے فلاں مسئلے کو بالائے طاق پر رکھ دیا ہے۔''

بجا طور پر درست فرمانا: راقم کی طرف سے ایک وضاحت کے جواب میں دوست نے لکھا:
''پروفیسر صاحب! آپ نے بجا طور پر درست فرمایا ہے۔''
''بجا طور پر'' اور ''درست'' کی یکجائی نے دوست کے جواب پر مشتمل اس جملے میں ایک بڑا سقم پیدا کر دیا ہے۔

بدبو سے تعفن پھیلنا: ایک وزیر باتدبیر کا بیان ہے ''حلوہ مارچ کی بدبو سے تعفن پھیل چکا ہے۔'' بدبو اور تعفن کی یکجائی اُن کی جہالت اور بے خبری کا ثبوت ہے۔

بدھ وار کا دن: 'بدھ وار' کا معنٰی ہی 'بدھ کا دن' ہے لہٰذا 'وار' کے بعد دن کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ اسی طرح سوموار کا دن اور منگل وار کا دن بھی غلط ہے۔

برلبِ سڑک کے کنارے: 'برلبِ سڑک' یا 'سڑک کے کنارے'...... ان دونوں میں سے کوئی ایک ہونا چاہیے۔

بطور مضمون کے: ''اس نے 'تاریخ' کو بطور مضمون کے اختیار کیا ہے۔'' اِس جملے میں 'کے' اضافی ہے۔ 'بطور مضمون' یا 'مضمون کے طور پر' سے جملہ مکمل اور درست ہو جاتا ہے۔

بکثرت سے: 'بکثرت' یا 'کثرت سے' ہونا چاہیے۔ بکثرت کا معنٰی ہی 'کثرت سے' ہے لہٰذا 'سے' کا اضافہ غیر ضروری ہے۔

بمشکل سے: یہی صورتِ حال 'بمشکل سے' کی ہے۔

بمعہ اپنی آل اولاد کے ساتھ: ایک اخبار کے کالم نگار نے لکھا ''فلاں صاحب علاج معالجہ کے لیے بمعہ اپنی آل اولاد کے ساتھ لندن چلے گئے''۔ بمعہ، بمع اور معہ کی تینوں صورتیں غلط ہیں صرف 'مع' درست ہے۔ 'مع' کے بعد 'کے ساتھ' کا اضافہ تکرارِ لفظی و معنوی کی ذیل میں آ کر غلط قرار پاتا ہے۔ 'ب' حرفِ جار اور 'مع' اسمِ جار ہے۔ یہ دونوں (حرف اور اسم) عربی ہیں، جو فارسی اور اُردو میں بھی مستعمل ہیں مگر ان کو ایک ساتھ استعمال کرنا غلط ہے۔

بہت بہتر: بہتر میں 'بہت' کا معنٰی پہلے سے موجود ہے لہٰذا اس سے پہلے 'بہت' لگانا غیر ضروری ہے۔

بہت زیادہ: ''میرے والد آپ سے مل کر بہت زیادہ خوش ہوں گے۔'' یا ''پاکستان اور ترکی میں بہت زیادہ اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔'' 'بہت زیادہ' کی ترکیب لکھنے اور بولنے میں عام ہے۔ 'بہت' کے معنٰی ہیں 'کثرت سے'۔ جب کہ 'زیادہ' فالتو، فاضل اور بیش کے مفہوم میں آتا ہے۔ مکمل ترکیب 'بہت زیادہ' کے معنی ہوئے: 'ضرورت سے زیادہ' یا 'اتنا زیادہ جتنا نہیں ہونا چاہیے'۔ محولہ بالا جملے اس طرح صحیح ہوں گے: ''میرے والد آپ سے مل کر بہت ہی خوش ہوں گے''...... ''پاکستان اور ترکی میں حد درجے کا اعتماد پیدا ہو گیا ہے''۔ یوں دیکھیے تو قارئین کو اندازہ ہو گا کہ ''بہت زیادہ'' کا غلط استعمال آج کل بہت زیادہ ہو گیا ہے اور یہی اس ترکیب کو برتنے کی صحیح صورت ہے۔

بہت کافی: ''چائے میں شکر بہت کافی ہے۔'' 'بہت' اور 'کافی' بظاہر تو ہم معنٰی لگتے ہیں مگر ان کے معنوں کی حدیں اپنی اپنی ہیں اور معنوی اعتبار سے ان دونوں میں بُعد ہے۔ 'بہت' کا مطلب 'بکثرت' ہے اور کافی کا معنٰی ہے جو کفایت کر سکے، جو حسبِ ضرورت ہو۔

لہٰذا اس ترکیب میں 'بہت' اور 'کافی' کا اجتماع معنوی تضاد کی ذیل میں آتا ہے۔
'کافی' کے استعمال میں، عام طور پر، غلطی کی جاتی ہے۔اس کا درست استعمال یوں ہے: ''یہ رقم آپ کے مہینے بھر کے خرچ کے لیے کافی ہوگی۔'' یا ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔'' ناپسندیدہ حالتوں میں اس کا استعمال غلط ہوتا ہے مثلاً: ''آج اسلم کو کافی بخار رہا۔'' یا ''اس نے تجارت میں کافی نقصان اُٹھایا۔'' یہ بات سمجھنے کے لائق ہے کہ 'کافی' کسی چیز کے لیے کفایت کی فاعلی صورت ہے یعنی کفایت کرنے والا، جس کے بعد آدمی کو مزید ضرورت نہ رہے۔

<u>بہترین نِعمَ البدل</u>: نِعمَ البدل کا معنٰی ہی بہترین صلہ ہے۔اس سے پہلے 'بہترین' لکھنا غیر ضروری ہے۔ نِعم کی میم پر پیش لگانا غلطی ہے، میم پر زبر ہے اور یہ قرآن مجید کی آیت میں زبر کے ساتھ ہی آیا ہے۔[۹]

<u>بھیڑ جمع ہوگئی/مجمع جمع ہوگیا</u>: ہمارے ہاں لکھنے پڑھنے میں حشو و زوائد کی غلطیاں عام ہیں۔ 'بِھیڑ ہو گئی'' ...... ''مجمع ہوگیا'' میں بات پوری ہو جاتی ہے۔

<u>بے فضول</u>: ہم بے خبری میں 'بے فضول' بول جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ 'بے' کے اضافے سے اس کا معنٰی اُلٹ ہو جائے گا یعنی قیمتی، گراں بہا اور اہم۔

<u>بیوہ عورت</u>: یہ ترکیب غلط ہے کیوں کہ عورت ہی بیوہ ہوتی ہے مرد نہیں ہوتا۔صرف ''بیوہ'' کہنا اور لکھنا ہی کافی ہے۔

<u>پانی کا سیلاب</u>: ''سندھ میں پانی کے سیلاب نے تباہی مچا دی۔'' یہ جملہ لکھنے والے اخبار نویس کو علم ہونا چاہیے کہ لفظ سیلاب 'سیل' اور 'آب' کا مرکب ہے۔سَیل کے معنٰی ریلا، بہاؤ اور رَو غیرہ کے ہیں۔ ریلا، بہاؤ اور رَو پانی ہی کے ہو سکتے ہیں لہٰذا سیلاب سے پہلے پانی کا اضافہ غیر ضروری اور اضافی ہے۔'سیلاب' کا استعمال اس طرح ہونا چاہیے: ''سندھ میں شدید سیلاب کے سبب کئی گاؤں ڈوب گئے۔'' مگر ہمارے بہت سے لکھنے والے یوں بھی لکھ جاتے ہیں: ''عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں انسانوں کا وہ سیلاب تھا کہ آدمی چل نہیں رہا تھا، بہا جا رہا تھا۔'' اس جملے میں سیلاب کا استعمال بہت کھٹکتا ہے۔ میرے نزدیک اسے یوں لکھنا چاہیے: ''انسانوں کا وہ سیل تھا کہ......'' یا پھر سیدھے سیدھے یوں لکھا جائے:

''انسانوں کا وہ ریلا تھا کہ آدمی چل نہیں رہا تھا، بہا جا رہا تھا۔''

پروفیسر مرزا ناصر بیگ صاحب / جناب پرنسپل صاحب: ہمارے ہاں القاب وآداب لکھنے میں بھی لفظوں کا اِسراف اور معنوی ولفظی تکرار عام ہے۔ اِنشا کی ان غلطیوں کے ضمن میں ممتاز ادیب اور زبان دان رشید حسن خان ہمیں آگاہ کرتے ہیں:

> ''جب نام سے پہلے 'ڈاکٹر' یا 'پروفیسر' لکھ دیا تو پھر نام کے بعد صاحب لکھنے کی ضرورت نہیں، اِسی طرح جب نام سے پہلے جناب لکھ دیا تو پھر نام کے بعد صاحب لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر نام کے بعد صاحب لکھا ہے تو پھر نام سے پہلے جناب لکھنا ضروری نہیں، ضروری کیا، مناسب بھی نہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب، جناب ڈاکٹر صاحب، جناب پرنسپل صاحب، جناب محمود الٰہی صاحب ان سب میں جناب اور صاحب میں سے ایک لفظ زائد ہے۔''[۱۰]

پُرکٹھن حالات میں: ایک صاحبِ قلم نے 'کٹھن' کے ساتھ 'پُر' لگا کر ایک بھونڈی ترکیب وضع کر دی۔ یہاں 'پُر' فالتو ہے، کٹھن ہی کافی ہے۔

پسِ غیبت پسِ غیبت کا معنٰی: 'غیر حاضری میں' کیا جاتا ہے۔ یہ ترکیب اس لیے غلط ہے کہ 'غیبت' میں 'پس' کا معنٰی پہلے سے موجود ہے، صرف غیبت لکھنا اور بولنا کافی ہے۔

پہلے سے پیش بندی: مثلاً ''انھوں نے اس معاملے سے نمٹنے کے لیے پہلے سے پیش بندی کر لی'' پیش کا معنی ہی 'پہلے سے' ہے لہٰذا ان دونوں کا جمع کرنا درست نہیں۔

پھولوں کا گلدستہ: گلدستہ کا معنٰی ہے پھولوں کا گُچھا۔ پھولوں اور گُل کو یکجا کرنا درست کرنا۔

پیشِ نظر کے سامنے: حضرت سیماب اکبر آبادی اور گجرات کے ایک شاعر اعجاز بھڑوچی کے درمیان کسی ادبی مسئلے پر منظوم بحث چھڑ گئی۔ اعجاز بھڑوچی کسی ایک مصرعے میں '......پیشِ نظر کے سامنے' نظم کر گئے تو جواباً حضرتِ سیماب نے یہ شعر کہہ کر بحث ہی ختم کر دی کہ:

کُھل گیا سیمابؔ! اعجاز بھڑوچی کا بھرم
کہہ گیا بندۂ خدا، پیشِ نظر کے سامنے [۱۱]

'پیشِ نظر' کے ساتھ 'سامنے' کے استعمال نے اعجاز بھڑوچی کی زبان دانی کی قلعی کھول دی۔

۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء تک: ''پروفیسر واسطی نے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۶ء تک، گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔'' ماہ نامہ ''قومی زبان، کراچی بابت اپریل ۲۰۱۸ء میں شائع

ہونے والے جاوید احمد خورشید کے مضمون میں 'تا' اور 'تک' کی یکجائی کی غلطی تین مرتبہ دہرائی گئی۔

تا قیامت تک: تا قیامت یا قیامت تک

تابعدار: یہ ترکیب، معنوی اعتبار سے غلط استعمال کی جاتی ہے۔ 'تابع' کا معنٰی ہی مطیع اور فرماں بردار ہے۔ 'دار' کا لاحقہ زائد اور غیر ضروری ہے۔

تأثّر کے زیرِ اثر: ایک اخبار نویس کا کیا خوب جملہ ہے، ''اس واقعے کے تأثّر کے زیرِ اثر انھوں نے یہ فیصلہ کیا''۔ اخبار نویس صاحب یقیناً لاعلم ہیں کہ لفظی اور معنوی تکرار کی وجہ سے 'تاثر' اور 'زیرِ اثر' کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔

تاہنوز: ہنوز کا معنٰی 'ابھی تک' ہے، اس سے پہلے 'تا' ملانا غلط عمل ہے کیوں کہ 'تا' کا معنٰی بھی 'تک' ہے۔

تجدیدِ نو: ''تجدیدِ نَو'' لاہور سے شائع ہونے والا ایک ادبی رسالہ ہے جس کی مدیرہ، محترمہ عذرہ اصغر صاحبہ ہیں۔ رسالے کا نام لفظی اور معنوی تکرار کی بنا پر محلِ نظر ہے۔ تجدید کا معنٰی ہے جدّت، نیا بنانا...... یا نئے سرے سے کوئی کام کرنا، اور 'نَو' کا مطلب بھی 'نیا' ہے۔ ان دو لفظوں کی یکجائی کسی طور پر درست نہیں۔

تحریری مقالہ رقم کرنا: ''ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۹۷۲ء میں، قدیم اردو ادب پر تحریری مقالہ رقم کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔'' [۱۲] 'تحریری'...... 'مقالہ' اور 'رقم کر کے' کی یکجائی اور ہم معنویت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

تقریباً دس کے قریب: ''اس کے پاس تقریباً دس کے قریب سندیں ہیں۔'' اس جملے میں ہم معنٰی لفظوں تقریباً اور قریب کا ایک ساتھ استعمال کر دیا گیا ہے۔ یہ اجتماعِ مترادفین کی ناروا اور غلط مثال ہے۔

تمام جملہ امراض: ''فلاں حکیم حاذِق کے پاس تمام جُملہ امراض کا علاج ہے۔'' 'جملہ' کا معنٰی 'تمام' بھی ہے۔ 'تمام' اور 'جملہ' کی یکجائی کسی طور پر درست نہیں ہے۔

تمام فریقین: ''اس صلح نامے پر تمام فریقین متفق ہو گئے۔'' 'فریقین' تثنیہ کا صیغہ ہے جس کا معنٰی ہے 'دو فریق'۔ مذکور جملے میں 'فریقین' ہی کافی تھا۔ یا 'دونوں فریق' ہو سکتا ہے۔ اس طرح

'دونوں فریقین' اور 'تینوں فریقین' بھی غلط ہے۔

تھیٹر کے بارے میں قدرے زیادہ سنجیدہ: [۱۴۳] اس عبارت میں 'زیادہ' کے ساتھ 'قدرے' بڑی گرانی کا موجب بنتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب درست ہوتا۔

تیسرا ثالث: ''مسئلۂ کشمیر کے حل کے لیے کسی تیسرے ثالث کی ضرورت ہے۔'' یہ ایک سیاست دان کا بیان ہے، حالاں کہ ثالث کا معنٰی ہی تیسرا ہے۔

تیل صاف کرنے والی ریفائنریز: ریفائنری، ریفائن (Refine) سے ہے جس کا معنٰی ہے دوبارہ صاف کرنا۔ 'ریفائنری' تیل صاف کرنے والے کارخانے کو کہتے ہیں، تو پھر اس کے ساتھ 'تیل صاف کرنے والی' کا اضافہ چہ معنٰی دارد؟

جلسے میں صرف شاعر ہی تھے: 'صرف' اور 'ہی' میں سے ایک کلمۂ حشو ہے۔ درست جملہ اس طرح ہے:

'جلسے میں صرف شاعر تھے'...... یا 'جلسے میں شاعر ہی تھے'

جھوٹا بہتان: جملہ ہے ''اُس نے فلاں پر جھوٹا بہتان لگایا۔'' یہ جملہ 'جھوٹا' اور 'بہتان' کی یکجائی سے غلط ہو گیا ہے کیونکہ بہتان کی بنیاد ہی جھوٹ ہوتی ہے پھر بہتان کے جھوٹا ہونے کے کیا معنی؟

جَیب و گریباں: جَیب کا معنٰی ہی 'گریبان' ہے جس کی سند مرزا غالبؔ کا یہ مصرع ہے:

ہمارے جَیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

چلن چل نکلا ہے: ایک کالم نویس نے لکھا، ''اس رسمِ بد کا چلن چل نکلا ہے۔'' 'چلن' کے بعد 'چل نکلنا' کا استعمال ذوقِ جمال کو مجروح کر دیتا ہے نیز معنوی تکرار کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ اُردو میں محاورہ 'چلن چل نکلنا' نہیں بلکہ 'چلن ہونا' ہے جس کا معنٰی ہے 'رواج ہونا'۔

چوکھٹ کی دہلیز: ''چوکھٹ کی دہلیز...... لیکن اتنی اونچی نہیں کہ ہاتھ اس تک نہ پہنچ پاتے''۔ یہ جملہ ایک افسانے سے لیا گیا ہے۔ افسانہ نگار چوکھٹ کے مطلب سے بے خبر ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ چوکھٹ اور دہلیز ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

حجرِ اسوَد کا پتھر: حجرِ اسود کہنا ہی کافی ہے۔

حصول یابی: یہ ترکیب عربی اور فارسی کے لفظوں پر مشتمل ہے۔ 'حصول' کا معنٰی حاصل کرنا جب کہ 'یابی' یافتن (مصدر) سے ہے جس کا معنیٰ 'پانا' اور 'حاصل کرنا' ہے۔ لفظی اور معنوی تکرار

کی بنا پر یہ ترکیب غلط ہے۔ 'حصول' کہنے اور لکھنے سے بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

خرچ کرنے کا صحیح مصرف: ایک کتاب کے انتساب میں، مصنف نے اپنے پیر و مرشد کو یاد کرتے ہوئے لکھا کہ:

''......مُرشدِ برحق نے......مردِ بے کار بدتر از گنہگار......اور......دل بہ یار و دست بہ کار......کا سبق پڑھا کر اپنی سانسوں کو خرچ کرنے کا صحیح مصرف عطا کر دیا۔'' [۱۴]

یہ ایسا سہو ہے کہ کتاب کے دو ایڈیشن چھپ گئے مگر نہ تو کسی خاص اور نہ کسی عام قاری کی نظر اس پر پڑی کہ وہ مصنف کو بتا دیتا کہ ''پیرِ حق نے......سبق پڑھا کر اپنی سانسوں کا صحیح مصرف عطا کر دیا'' میں بات پوری ہو گئی۔ جب صحیح مصرف عطا ہو گیا ہے تو پھر 'خرچ کرنے' کی کیا ضرورت ہے؟

درمیان میں: 'درمیان' خود دو لفظوں 'در' اور 'میان' کا مجموعہ ہے۔ در کا معنٰی 'میں' ہے اور 'میان' کا 'وسط'۔ اب 'درمیان' کے بعد 'میں' لگانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

دل کا ہارٹ اٹیک: ہارٹ اٹیک یا دل کا دورہ

دنیا بھر میں جگ ہنسائی: ''اس واقعے کے بعد بھارت کی دنیا بھر میں جگ ہنسائی ہوئی ہے''۔ یہ عبارت لکھنے والا صحافی بے خبر ہے کہ 'دنیا' اور 'جگ' ہم معنٰی ہیں۔

دوبارہ ریپیٹ (Repeat) کرنا: ریپیٹ (Repeat) میں دوبارہ کا معنٰی پہلے سے موجود ہے۔

دوبارہ ری رائٹ (Rewrite) کرنا: ری رائٹ (Rewrite) میں بھی دوبارہ کا معنٰی پہلے سے موجود ہے۔

دوبارہ سبق دُہرانا: 'دُہرانا' میں 'دوبارہ' کا مفہوم پہلے سے موجود ہے۔

دوبارہ لوٹ کر واپس آنا: ''ہمیں دنیا میں دوبارہ لوٹ کر واپس نہیں آنا ہے۔'' 'دوبارہ'......'لوٹ کر' اور 'واپس آنا' کی یکجائی جہالت کی دلیل ہے۔

دورِ خلافت کا زمانہ: ''حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا زمانہ تاریخ کا سنہری باب ہے۔'' 'دَور' اور 'زمانہ' ہم معنٰی ہیں۔ 'دورِ خلافت' یا 'خلافت کا زمانہ'......ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب درست ہوگا۔

دونوں اطراف سے: اطراف جمع مکسّر ہے جو دو سے زیادہ چیزوں کے لیے آتی ہے۔ یہاں 'دونوں طرف سے' ہونا چاہیے۔

دونوں جانبَین / دونوں فریقین: 'جانبَین' اور 'فریقین' تثنیہ کے صیغے ہیں۔ان کے ساتھ 'دونوں' لگانا زائد اور غیر ضروری ہے۔اگر 'دونوں' کا استعمال کرنا ہے تو پھر 'دونوں جانب' اور 'دونوں فریق' لکھنا درست ہوگا۔

دونوں طرف سے نجیب الطرفین: اس ترکیب کو بھی مذکورہ بالا وضاحت کے تناظر میں سمجھا جائے۔محض 'نجیب الطرفین' (ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شریف الاصل) کہنا ہی کافی ہوگا۔

دیکھنے میں دیدہ زیب: ''یہ عمارت دیکھنے میں بہت دیدہ زیب ہے''۔'دیکھنے' اور 'دیدہ' کی لفظی اور معنوی یکسانی نے جملے کو غلط کر دیا۔ جملے کو درست طور پر یوں بولا اور لکھا جا سکتا ہے:

''یہ عمارت بہت دیدہ زیب ہے'' یا ''یہ عمارت دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے۔''

دیکھنے میں دیدہ زیب نظر آتا ہے: 'دیکھنے میں'...... 'دیدہ زیب'......اور 'نظر آتا ہے' کی صورت میں تین مرتبہ لفظی اور معنوی تکرار در آئی ہے۔

ڈھٹائی پر ڈٹ گئے: 'ڈھٹائی اور ڈٹ کا اِجتماع ذوقِ سلیم کو کچل دیتا ہے۔ڈھٹائی جس کا معنی بے شرمی اور بے حیائی ہے اس لفظ کے اندر ہی غلط بات پر ڈٹ جانے کا مفہوم موجود ہے۔

روزِ حشر کے دن: 'روز' اور 'دن' کی یکجائی ہر کسی کو نظر آ رہی ہے۔

روزمرہ معمول کے مطابق: جملہ ہے، ''وہ اپنے روزمرہ معمول کے مطابق دفتر جاتا ہے۔'' اس جملے میں روزمرہ اور معمول کی یکجائی لفظی اور معنوی تکرار کے زمرے میں آتی ہے۔ معمول میں بھی روزمرہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

رہائش گاہ: رہائش کا مطلب ہے مسکن، گھر اور ٹھکانا......لہٰذا اس کے ساتھ 'گاہ' کا لاحِقہ لگانا درست نہیں۔

زرِ اعانت کی رقم: زرِ اعانت یا اِعانت کی رقم (زر اور رقم ہم معنیٰ ہیں)

زندہ جلا کر قتل کر دیا: کیا زندہ جلا دینا قتل کرنا نہیں ہے؟ جب زندہ جلا کر خاکستر کر دیا تو مزید قتل کرنے کی گنجائش کہاں رہی؟

زوجۂ منکوحہ: زوجہ (بیوی) نکاح کے بعد ہی بنتی ہے لہٰذا منکوحہ غیر ضروری اور زائد ہے۔

سائنس صرف انگریزی ہی سے سیکھی جا سکتی ہے: اس جملے میں ''صرف انگریزی سے'' درست ہوگا یا ''انگریزی ہی سے۔''

سب سے بہترین: 'بہترین' تفضیلِ کُل ہے لہٰذا 'سب سے' کا اضافہ غیر ضروری ہے۔اسی طرح ''سب سے اوّلیں ترجیح'' کا معاملہ ہے۔

سب سے قدیم ترین: قدیم ترین یا سب سے قدیم

سخن ور شاعر: ''مرزا غالب سخن ور شاعر تھے۔'' 'سخن ور' اور 'شاعر' کی یکجائی بے خبری پر مبنی ہے کیوں کہ 'سخن ور' میں شاعر ہونے کا معنٰی بھی موجود ہے۔

سرِ شام ہی سے: ''لاہور میں سرِ شام ہی سے دھند کا راج ہے۔'' 'سرِ شام' کے ساتھ 'ہی' کا اضافہ غلط ہے یا یوں کہا جائے 'شام ہی سے'۔

سناؤنی موت کی آ گئی: سناؤنی کا معنٰی ہی 'خبرِ مرگ' ہے۔اس کے ساتھ موت کو یکجا نہیں کیا جا سکتا۔

سُندر بن کا جنگل: بن اور جنگل ہم معنٰی ہیں۔'سُندر بن'...... یا 'سُندر کا جنگل' کہنا درست ہوگا۔

سنگِ مرمر کا پتھر: سنگِ مرمر یا مرمر کا پتھر

شدید تشدّد کرنا: ٹیلی وژن کے کسی چینل پر یہ جملہ نشر ہوا، ''فلاں پر شدید تشدّد کیا گیا۔'' تشدّد سے پہلے شدید کا وجود گراں گزرتا ہے۔اس سے معنوی یکجائی کا شائبہ ہوتا ہے اور ذوقِ سلیم کو بھی گوارا نہیں۔''شدید زدوکوب کیا گیا'' کہا جاتا تو بابت بن جاتی۔

شستہ گوئی: ''لوگ اُردو کی شستہ گوئی کے دیوانے ہیں۔'' یہ بدوضع ترکیب کسی بدمذاق کی اختراع ہے جس نے 'غزل گوئی'، 'مرثیہ گوئی'، 'نعت گوئی'، 'داستان گوئی' اور 'یاوہ گوئی' کی تراکیب دیکھ کر اِسے وضع کر دیا۔اس جملے میں 'شستہ گوئی' کے بجائے 'شُستگی' ہی درست ہے۔

شعبہ ہائے جات: ''یونی ورسٹی میں مختلف شعبہ ہائے جات ہیں۔'' 'شُعبہ ہا' فارسی قواعد کے تحت جمع ہے۔'جات' اردو میں جمع کی علامت کا لاحِقہ ہے۔'ہا' اور 'جات' کا جمع کرنا درست نہیں ہے۔

شعری مجموعۂ کلام: یہاں 'کلام' کا معنٰی شاعری ہے۔معنوی یکسانی سے بچنے کے لیے 'شعری مجموعہ' یا 'مجموعۂ کلام' کہنا بہتر ہے۔

صحت و عافیت دریافت کرنا: ہم عام طور پر کہتے ہیں:

''میں آپ کی صحت و عافیت دریافت کرنے آ رہا ہوں''

بظاہر ان دو لفظوں میں معنوی یکسانی پائی جاتی ہے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ صحت کا معنٰی تن درستی ہے جب کہ عافیت کا مفہوم آسائش اور خیریت ہے۔ اس طرح کے کلمات میں عام طور پر ہمارے پیشِ نظر مخاطب کی صحت ہوتی ہے نہ کہ اس کی زندگی کے مسائل۔ یہ عین ممکن ہے کہ صحت ہو اور عافیت نہ ہو یعنی وہ کسی معاشی یا خانگی مجبوری میں ہو جس کا آپ کے پاس کوئی حل نہیں ہے یا عافیت ہو اور صحت نہ ہو۔ پھر کیوں نہ ہم وہی کہیں جو فی الحقیقت مراد ہے۔

صحت یابی عطا فرمائے: ''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت یابی عطا فرمائے۔'' 'یابی' یافتن (مصدر) سے ہے، جس کا معنٰی ہے پانا۔ اس اعتبار سے جملے کا مفہوم بنتا ہے: ''اللہ تعالیٰ آپ کو'صحت پانا' عطا فرمائے۔'' یہاں 'صحت یابی' کے بجائے 'صحت' سے مفہوم اخذ ہو جاتا ہے جیسے: ''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔''

طرزِ حکم رانی: 'حکم رانی' میں طور اور طرز کا مفہوم پہلے سے موجود ہے، اس کے ساتھ 'طرز' کا اضافہ معنوی یکسانی کا سبب بنتا ہے۔ راقم حکم ران اور حکم رانی کو توڑ کر ہی لکھنا جائز سمجھتا ہے ورنہ یہ حُکُمَران اور حُکُمَرانی بن جائیں۔

علانیہ اعلانِ جنگ: جو کام بغیر کسی پردہ داری کے کھلم کھلا سر انجام دیا جائے اُس کے اظہار کے لیے لفظ 'علانیہ' استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک کتاب کے مصنف رقمطراز ہیں:

''مولانا ظفر علی خان برطانیہ کے خلاف علانیہ اِعلانِ جنگ کرتے رہے۔''[۱۵]

'علانیہ اعلانِ جنگ' کی ترکیب، مصنف موصوف کے ذوقِ علم و ادب کی ایسی کرشمہ سازی ہے جس کی ہر جہت میں یارانِ نکتہ داں کے لیے ضیافتِ طبع کا سامان موجود ہے۔ بعض لوگ علانیہ سے پہلی الف لگا کر'اِعلانیہ' بنا دیتے ہیں جو غلط ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس دیکھیے:

''اس نے ہر پرگنے اور ضلع میں وقائع نگار مقرر کیے تھے۔ خفیہ اور اِعلانیہ ذرائع خبر رسانی کا جال تمام ملک میں بچھا ہوا تھا۔''[۱۶]

عمارت تعمیر کرنا: ''لال چوک پر عمارت تعمیر کر دی گئی۔'' عمارت اور تعمیر میں معنوی یکسانی نظروں سے اوجھل کیسے ہو گئی؟ کیا اس طرح لکھنے سے معنوی طور پر کوئی کمی رہ جاتی ہے کہ

''لال چوک پر عمارت بنادی گئی'' یا ''حویلی تعمیر کردی گئی۔''

عوام الناس: 'عوام' اور 'الناس' دونوں کا معنٰی 'لوگ' ہے۔ 'عوام' عام کی جمع ہے جس کا مطلب فرد (Individual) ہے۔ لفظ 'عوام' مذکر ہے، اکثر لوگ غلط طور پر اسے مونث لکھتے اور بولتے ہیں۔ قاعدے کی رُو سے 'عوام الناس' کی ترکیب کا کوئی جواز نہیں ہے۔

عیاں دکھائی دیتی ہے: ''اُس کے چہرے پر مسرّت عیاں دکھائی دیتی ہے۔''، 'عیاں' اور 'دکھائی دینا' اجتماعِ مترادفین ہے۔

غزل گوشاعر: ''احمد فراز غزل گو شاعر ہے۔'' اس جملے میں 'غزل گو' اور 'شاعر' میں معنوی یکسانی پائی جاتی ہے۔ 'غزل گو'...... کبھی غیر شاعر نہیں ہوسکتا۔

غیر شادی شدہ: مرکب لفظ ''شادی شدہ'' ہرگز غلط نہیں مگر ''غیر شادی شدہ'' کی ترکیب یقیناً غلط ہے۔ 'شدہ' (شدن مصدر سے) کے معنٰی 'ہوا' یا 'ہُوئی' لیے جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچیے کہ اس کے ساتھ 'غیر' کا استعمال چہ معنٰی؟...... اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ جس کی شادی نہ ہوئی ہو تو اُس کے لیے کیا لفظ استعمال کیا جائے؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اردو لغت کی ذرا ورق گردانی کی جائے تو اس میں ایک لفظ ملے گا...... ناکتخدا...... جو اس معنٰی کا حامل ہے۔ اگر یہ مشکل ہے تو ''کنوارا'' عام مستعمل ہے۔

غیر محفوظ تحفظ: مؤرخہ ۴/ اپریل ۲۰۲۱ء کو روز نامہ ''دُنیا'' میں ایک مضمون بعنوان ''غیر محفوظ تحفظ'' شائع ہوا۔ مضمون نگار کا نام عندلیب عباس ہے۔ مضمون نگار کا مفہوم یوں بھی ادا ہوسکتا تھا:

خدشات سے بھرا ''تحفظ''!!

فرق صاف ظاہر ہے: 'صاف' کا معنٰی 'واضح' ہے جب کہ 'ظاہر' تو 'واضح' ہی ہوتا ہے۔ 'صاف' کے بغیر بھی فرق ظاہر ہوسکتا ہے۔

فوج کا سپہ سالار: 'سپاہ' کا معنٰی فوج ہی ہے۔ 'فوج' اور 'سپاہ' (سپہ) کو اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔

فوراً سے پہلے: ''آپ یہ کام فوراً سے پہلے کرلیں۔'' 'فوراً' کے بعد 'سے پہلے' لکھنا اور بولنا قطعی طور پر غلط ہے۔

فی الحال ابھی احمد نہیں آیا: 'ابھی' کا اضافہ غلط اور غیر ضروری ہے۔

فی الواقعی: فی الواقعی کی جگہ 'فی الواقع' درست ہے۔

فی الوقت کے لیے اتنا ہی کافی ہے: 'فی الوقت' کے بعد...... ' کے لیے' نہیں آئے گا۔

فی پیکٹ پر دس روپے بڑھا دیے گئے: اس جملے میں فی پیکٹ کے بعد 'پر' کا اضافہ غلط ہے۔

قابلِ گردن زدنی / قابلِ دیدنی / قابلِ خوردنی: زدنی، دیدنی اور خوردنی میں آخر میں آنے والی ''ی'' قواعد کی رُو سے ''یائے لیاقت'' کہلاتی ہے یعنی اس ''ی'' میں قابل اور لائق کا مفہوم پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اِس لیے ان الفاظ سے پہلے لائق یا قابل کا اضافہ غیر ضروری ہے۔

قدموں سے پامال ہونا: عبید اللہ علیم کا شعر ہے:

کن ہاتھوں کی تعمیر تھا میں
کن قدموں سے پامال ہوا

حیرت ہے کہ وہ ''قدموں سے پامال'' کیسے ہوئے؟ حالاں کہ پامال کا معنیٰ ہی 'پیروں سے روندنا' ہے۔

قفس خانہ: ایک نقّاد کے مضمون کا عنوان دیکھیے: ''قفس خانہ''۔ 'قفس' کا معنیٰ ہی 'قید خانہ' ہوا تو پھر اس کے ساتھ 'خانہ' کا اضافہ کیوں؟

کارِثواب کا کام: ''عوام کے لیے میٹھے پانی کا کنواں تعمیر کرنا، کارِثواب کا کام ہے۔'' کار اور کام کی یکجائی چہ معنی؟

کالی سیاہی...... نیز نیلی، سرخ اور سبز سیاہی: سیاہی کا معنیٰ 'کالی روشنائی' ہے۔ اس کے ساتھ 'کالی' کا اضافہ معنوی یکسانی کا باعث بنے گا۔ سیاہی، جس سے لکھا جاتا ہے، روشنائی کہلاتی ہے لہٰذا کالی روشنائی، نیلی روشنائی، سُرخ روشنائی اور سبز روشنائی کہنا چاہیے۔ 'کالی سیاہی' میں لفظی اور معنوی تکرار کا عیب ہے جب کہ 'نیلی سیاہی'، 'سُرخ سیاہی' اور 'سبز سیاہی' کہنے میں معنوی تضاد واقع ہو جاتا ہے۔

کام کا دائرۂ کار: ''اُس کے کام کا دائرۂ کار وسیع ہو گیا ہے۔'' 'دائرۂ کار' کا مطلب ہی 'کام کا دائرۂ' ہے۔ درست اس طرح ہو گا ''دائرۂ کار وسیع ہو گیا ہے۔''

کام میں مصروفِ عمل ہونا: ''وہ اپنے کام میں مصروفِ عمل ہے۔'' مصروفِ عمل کا معنیٰ ہی 'کام میں مصروف' ہے۔

کان میں سرگوشی کرنا: ''انھوں نے میرے کان میں سرگوشی کی۔'' 'سرگوشی' کا معنٰی ہی 'کان میں بات کرنا' ہے۔ فارسی میں 'گوش' کان کو کہتے ہیں جیسے ہمہ تن گوش۔ 'سرگوشی' سے پہلے 'کان' کا اضافہ غیر ضروری ہی نہیں، غلط بھی ہے۔

کانوں کان تک خبر نہ ہوئی: 'یہ جملہ درست اس طرح ہوگا ''اُسے کانوں کان خبر نہ ہوئی''۔ کانوں کان کے بعد 'تک' کا اضافہ غلط ہے۔

کتب احادیث: ''اُس نے ساری کتبِ احادیث پڑھی ہیں۔'' 'کتبِ حدیث' درست ہے یا 'حدیث کی کتابیں' کہا جائے۔

کسوٹی کے معیار کو کون مقرر کرے گا؟: فاضل کالم نگار[۱۷] کو سمجھانا پڑے گا کہ 'کسوٹی' اور 'معیار' دونوں ایک ہی چیز اور ہم معنٰی ہیں۔

کمی اِس کسر کی ہے: کبھی کبھی تو بڑی باریک غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں۔ ایک شاعر کی غزل کا مقطع اِسی کا نمونہ ہے:

وہ اَن کہی سی بات، سخن کو جو پُر کرے
تاؔج اپنی شاعری میں کمی اِس کسر کی ہے

شاعر آمد میں گم ہو کر شعر میں 'کمی' اور 'کسر' ایک ساتھ نظم کر گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس شعر کے حشو و زوائد پر فوراً نظر نہیں جاتی۔ 'اَن کہی' میں 'بات' شامل ہے، پھر دوسرے مصرعے میں شاعر نے 'کمی' کہا اور 'کسر' بھی کہہ دیا جب کہ 'کسر' کے معنٰی ہی کمی کے ہیں۔ بآسانی اس قافیے کو بدل کر یہ سقم دور کیا جا سکتا ہے مثلاً:

تاؔج اپنی شاعری میں کمی اِس ہُنر کی ہے

کورونا کا زور کمزور ہو رہا ہے: اخبار کی سرخی ہے ''ملک گیر سطح پر کورونا کا زور کمزور ہو رہا ہے۔''[۱۸] یہ اخبار ممبئی (انڈیا) سے شائع ہوتا ہے اور یہ شہ سُرخی اہلِ زبان مدیر کا شہکار ہے۔ غور و فکر کو بروئے کار لا کر سرخی اس طرح بنائی جا سکتی تھی: ''ملک بھر میں کورونا کا زور کم ہو رہا ہے۔''

کوئی ایک فردِ واحد: 'کوئی ایک فرد' یا 'کوئی فردِ واحد'...... اِن دونوں میں سے کسی کو بھی جملے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کوئی درجن بھر کے قریب: ''اس کے پاس کوئی درجن بھر کے قریب کتابیں ہیں۔'' اس جملے میں 'کوئی

درجن بھر'...... یا 'درجن کے قریب' ہونا چاہیے۔

...... کے پیچھے پس منظر کیا ہے؟: ''اس خاموشی کے پیچھے پس منظر کیا ہے۔'' پس منظر اصل میں منظرِ پس ہے یعنی پیچھے کا منظر۔ 'پس' سے پہلے 'پیچھے' لگانا لفظی اور معنوی تکرار ہے جس کا یہاں کوئی جواز نہیں۔

...... کے نام سے موسوم: ''جب ایک سورت مکمل ہو جاتی تو دوسری سورت الگ نام سے موسوم ہوتی۔''[۱۹] یہ جملہ اس طرح درست ہوگا: ''جب ایک سورت مکمل ہو جاتی تو دوسری سورت کا الگ نام رکھا جاتا۔'' موسوم کا معنٰی ہے ''نام رکھا گیا۔''

اُردو میں لفظ 'نام' کا مترادف 'اسم' ہے۔ ہمارے ہاں اکثر اہلِ قلم یوں لکھتے ہیں کہ: ''وہ احمد کے نام سے موسوم ہے۔'' جب ہم اس طرح کے جملے پڑھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والا شاید 'نام' اور 'موسوم' کی معنوی یکسانی سے ناواقف ہے۔ نام اور موسوم کا ایک ساتھ لکھنا گویا 'آبِ زمزم کا پانی' لکھنا ہوا۔ موسوم کا صحیح استعمال یوں ہوگا: ''پاکستان کی ایک معروف یونی ورسٹی علاّمہ اقبال سے موسوم ہے۔'' یا ''وہ احمد سے موسوم کیا جاتا ہے۔''

گاہ کے لاحقے سے بنی تراکیب: جیسے بزم گاہ، منزل گاہ، مقتل گاہ، مدفن گاہ وغیرہ۔ پروفیسر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں:

> ''بزم میں تو خود ہی جگہ کا مفہوم موجود ہے اِس پر گاہ کا اضافہ غلط ہے۔ اِسی طرح منزل، مقتل اور مدفن کے ساتھ گاہ کا اضافہ بھی غلط ہے کیوں کہ یہ سب اسم ظرف ہیں۔''[۲۰]

گداگر خاتون کا قتل: خبر کا عنوان ہے ''گداگر خاتون کا قتل۔'' مراد تو ہے 'بھیک مانگنے والی عورت' کا قتل، مگر نامہ نگار کو 'خاتون' اور 'عورت' میں فرق معلوم نہیں، اس لیے وہ بلا ضرورت لفظ ''خاتون'' استعمال کرتا ہے۔ 'خاتون' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کا معنٰی ہے ملکہ، امیر گھر کی عورت، امیر زادی اور بیوی۔ اس اعتبار سے 'گداگر خاتون' کی ترکیب میں معنوی تضاد واضح نظر آ رہا ہے۔

گول دائرہ: دائرہ گول ہی ہوتا ہے چوکور نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ گول دائرہ لکھتے ہیں۔ بعض دفعہ

اہلِ علم بھی سہواً اِسے لکھ جاتے ہیں مثلاً ایک بڑے ادیب نے لکھا ''جزم کو عموماً گول دائرے کی طرح لکھا جاتا ہے۔''

گویا اور جیسے کی یکجائی: ''کہانیاں لکھنے کا شوق تو گویا جیسے اُس کی گُھٹی میں پڑا ہوا تھا۔'' اس جملے میں 'گویا' اور 'جیسے' کی یکجائی بے خبری کی دلیل ہے۔

لب پہ پابندی: 'پابندی' کا لغوی معنٰی ہے پاؤں بندھ جانا اور 'پابند' ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے پاؤں بندھے ہوئے ہوں۔ مصرع ملاحظہ کیجیے:

ع لب پہ پابندی تو ہے اِحساس پہ پہرا تو ہے

لب پہ پابندی کا تصور کریں تو ایک ہی لمحے میں ذوقِ جمال بُری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔

لگاتار...... مسلسل: ''پچھلے ہفتے لگاتار بارش مسلسل پانچ دن ہوتی رہی۔'' ایک ٹی وی چینل پر موسم کا حال بتاتے ہوئے ہم معنٰی الفاظ کو بے جا طور پر یکجا کر دیا گیا۔

لمبے لمبے ڈگ بھرنا: اُردو میں محاورہ ''ڈگ بھرنا'' ہے نہ کہ ''لمبے لمبے ڈگ بھرنا۔'' 'ڈگ' دراصل دو قدم کے درمیان کے اُس فاصلے کو کہتے ہیں جو چلنے میں پیدا ہوتا ہے۔ 'لمبے لمبے' کے اضافے سے معنوی تکرار کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیلۃ القدر کی رات: لیلۃ القدر یا شبِ قدر کہنا مناسب ہوگا۔

ماہِ رمضان کا مہینا: ماہِ رمضان یا رمضان کا مہینا

مُبیّنہ طور پر واضح کر دیا: وزیرِاعظم کی معاونِ خصوصی برائے اطلاعات ونشریات محترمہ فردوس عاشق اعوان فرماتی ہیں: ''حکومت نے حزبِ اختلاف پر مُبیّنہ طور پر واضح کر دیا ہے کہ......'' یہاں مبیّنہ کا استعمال محلِّ نظر ہے۔ اس کا استعمال نہایت غیر متعلقہ مقام پر کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مبیّنہ اور واضح کی یکجائی اجتماعِ مترادفین ہے۔ ایک ٹیلی وژن چینل پر راقم 'مبیّنہ' کو مُبینہ (Mubeena) اور مُبیّنہ بروزن مُغنّیہ بھی سماعت کر چکا ہے۔

متعین کردہ/متعین شدہ: متعین کے بعد 'کردہ' اور 'شدہ' کے اضافے کا کوئی جواز نہیں ہے کیوں کہ متعین کا معنٰی ہے 'جس چیز یا بات کا تعیّن ہو گیا یا کر لیا گیا'۔

''محشر'' کے ساتھ بنی تراکیب: جیسے روزِ محشر، عرصۂ محشر، محشر کدہ، محشرستان، اور میدانِ محشر وغیرہ۔ لفظ

محشر اسم ظرف ہے جو خود جگہ اور وقت بتا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ روز، عرصہ، کدہ، ستان اور میدان لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مدرسۃ البنات گرلز سکول: ''وہ مدرسۃ البنات گرلز سکول کی طالبہ ہے۔'' ایک تعلیمی ادارے کے اس نام میں 'مدرسۃ البنات' اور 'گرلز سکول' ہم معنیٰ ہیں اور یہ تکرار غلطی پر مبنی ہے۔

مدلل انداز میں: ''علامہ شبلی نے اپنے اس مقالہ میں اُن تمام لوگوں کے الزامات و اعتراضات کا مدلل انداز میں جواب دیا جو قرآن مجید میں تحریف اور تغیر و تبدل کا دعویٰ کرتے تھے۔''[۲۱] 'مدلل انداز میں' نہایت بھونڈی ترکیب ہے یہاں اس کے بجائے 'مدلل جواب دیا' ہونا چاہیے تھا۔ 'مدلل' کا معنٰی ہے 'جو دلیل سے ثابت کیا گیا'۔

مدلل طور پر: ''ڈاکٹر سید عبداللہ نے ادب اور لسانی زندگی کے تعلق پر انتہائی خوب صورت، آسان اور مدلل طور پر بات کی ہے۔''[۲۲] جملہ یوں ہونا چاہیے تھا: ''......خوبصورت، آسان اور مدلل بات کی ہے۔'' مدلل کے بعد 'طور پر' کا اضافہ غلط ہے۔

مُزاحمت کاری: 'مزاحمت' کا معنٰی 'روکنا' اور 'تعرض کرنا' ہے۔ اس کے ساتھ 'کاری' لکھنا بیکار اور فضول ہے۔

مزید اور کتابیں دے دیجیے: مزید کے بعد 'اور' کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسترد شدہ: مسترد پر بھی یہی قاعدہ لاگو ہوگا۔ اس کا معنٰی ہے 'جس کا رد کر دیا گیا'۔

مسٹ (MUST) یونی ورسٹی: مسٹ (میر پور یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) میں یونی ورسٹی پہلے سے موجود ہے۔

مسکراہٹ پھینکتے واپس لَوٹ آئے: 'لَوٹنا' کا معنیٰ 'واپس آنا' ہے۔ اس لیے 'واپس' کے ساتھ 'لوٹ' کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسلسل طور پر: مسلسل کے بعد 'طور پر' کا اضافہ غلط ہے۔

مطبخ خانہ / مذبح خانہ: 'مطبخ' اور 'مذبح' دونوں اسمِ ظرف ہیں جن میں 'خانہ' کا مفہوم پہلے سے موجود ہے البتہ اِنھیں ذبح خانہ اور باورچی خانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

معاندانہ عناد: ''اس کے دل میں معانِدانہ عناد بھرا ہوا ہے۔'' اس جملے میں 'معاندانہ' اور 'عناد' کی لفظی اور معنوی تکرار ہے۔ اس کے علاوہ 'دل' کا استعمال زائد اور غیر ضروری ہے کیوں کہ

'عناد' دل کے سوا کہیں اور نہیں ہوتا۔

معزز قارئینِ کرام: 'معزز' اور 'کرام' دونوں میں سے ایک آئے گا۔

مفصل تفصیل: ''اس نے اپنے خط میں مفصّل تفصیل لکھ دی۔'' اس جملے میں لفظی اور معنوی یکجائی گوارا نہیں۔۔ مفصّل کا معنیٰ ہی 'باتفصیل' یا ''بالتّفصیل'' ہے۔

مقابلہ بازی: 'مقابلہ' میں 'آمنا سامنا' اور 'مڈھ بھیڑ' کا مفہوم پہلے سے موجود ہے لہٰذا 'بازی' کا اضافہ درست نہیں۔

مقتولوں کو قتل کر دیا گیا: یہ نہیں بتایا گیا کہ جو پہلے سے مقتول ہیں انھیں کیسے قتل کیا جا سکتا ہے؟

مقصدِ تعلیم کا اصل مقصد: ''الغرض! مقصدِ تعلیم کا اصل مقصد...... ہے۔'' یہ جملہ اُردو کے ایک پروفیسر کا ہے۔

مَلَکُ الموت کا فرشتہ: مَلَکُ الموت یا موت کا فرشتہ

ممنونِ احسان: ممنون کا معنیٰ ہے 'جس شخص پر احسان کیا گیا'۔ اس کے بعد احسان کا اضافہ محض تحصیلِ حاصل اور حشو ہے۔ حشوِ کلام، بلاغت کے خلاف ہے۔

منتخب شدہ: مُنتخَب کی بھی یہی صورتِ حال ہے کیوں کہ اس کا معنیٰ ہے 'جس کا انتخاب کر لیا گیا'۔

مِن حیث المجموعی: من حیث المجموع درست ہے۔

منگلوار کا دن: منگلوار میں 'وار' کا معنیٰ دن ہے۔

موقع پر رنگے ہاتھوں پکڑے جانا: ''پولیس نے اُسے موقع پر ہی رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔'' اس جملے میں 'رنگے ہاتھوں' کا مطلب ہی 'موقع پر' ہے۔

میری عزیزی: ادیبہ اور شاعرہ کشور ناہید صاحبہ نے اپنی ایک تحریر میں کسی خاتون کو 'میری عزیزی' کہا۔ 'عزیزی' کو اگر 'عزیز' سے مونث بنانے کی کوشش کی گئی ہے تو یہ بے خبری کا ثبوت ہے۔ اگر عزیز کے ساتھ لگائی گئی ''ی'' سے مراد میرا یا میری ہے تو 'میری عزیزی' میں 'میری' لگانے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ یہاں تکرارِ لفظی و معنوی، غلطی کا موجب بن رہی ہے۔ محترمہ کے پیشِ نظر ''میری عزیزہ'' ہوگا اور یہی درست ہے۔

میں آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں: ''مجھے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔'' یا ''آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں۔'' ان دونوں میں سے ایک ہونا چاہیے۔ اگر ''چاہتا''

قائم رکھا جائے تو پھر ''مطلوب'' نہیں ہوگا۔

میں ابتداء سے شروع کرتا ہوں: جملہ اس طرح ہونا چاہیے: میں یہ کام ابتداء سے کرتا ہوں یا شروع سے کرتا ہوں۔

ناجائز تجاوزات: 'تجاوزات' ناجائز ہی ہوتے ہیں۔ تجاوز کا مطلب ہے حد سے آگے بڑھنا۔ کسی بھی معاملے میں حد سے آگے بڑھنا جائز نہیں، چنانچہ ناجائز تجاوزات میں ''ناجائز'' جائز نہیں ہے۔

ناجائز منافع خوری: 'ناجائز منافع خوری' بھی اخباری دنیا کی عام اصطلاح ہے۔ منافع حاصل کرنا بالکل جائز ہے لیکن جب منافع خوری کہا جائے تو اس میں ناجائز کا پہلو شامل ہو جاتا ہے چنانچہ ناجائز کا سابقہ لگانے کی ضرورت نہیں۔

نام رکھنے کی وجہ تسمیہ: نام رکھنے کی وجہ یا وجہ تسمیہ۔

نِت نئے روز: ایک فاضل مدیر نے لکھا: ''نت نئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔'' 'نِت' ہندی کا لفظ ہے جس کا معنٰی ہے 'ہر روز'۔ اس لحاظ سے 'نِت' کے بعد 'نئے روز' کا اضافہ سراسر غلط ہے۔

نسٹ (NUST) یونی ورسٹی: نسٹ (نیشنل یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی) میں یونی ورسٹی پہلے سے موجود ہے۔

نمک پاشی چھڑکنا: ''اُس کی یہ حرکت نمک پاشی چھڑکنے کے مترادف ہے۔'' 'پاشی' پاشیدن (مصدر) سے ہے جس کا معنٰی ہی چھڑکنا ہے۔

نمل (NUML) یونی ورسٹی: نمل (نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوایجز) میں یونی ورسٹی پہلے سے موجود ہے۔

نئی جدّت: ''اُس نے اپنے کام میں ایک نئی جدّت پیدا کی۔'' 'جدّت' کا معنٰی ہی 'نیا پن' ہے لہٰذا اس کے ساتھ 'نیا' لگانا غلطی کا موجب ہوگا۔

واقف کار: 'واقف' کا معنٰی یقیناً 'شناسا' ہے لیکن 'واقف کار' (کام جاننے والا) ہنرمند کو کہتے ہیں۔

وصولیابی: 'وصول' عربی کا لفظ ہے اور 'یابی' فارسی کے یافتن (مصدر) سے ہے جس کا معنٰی ہے 'پانا'۔ یہاں معنوی یکجائی ناگوار ہے۔ اس کی جگہ 'وصولی' کا استعمال زیادہ موزوں ہے۔

وہ اشک بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے: محترمہ بسملؔ صابری کے معروف شعر کی اصل صورت یوں ہے:

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے، پانی کے گھر میں رہتا ہے

یہاں سماعت کا مغالطہ اور نظر و ذہن کا عدمِ ارتباط عجب گُل کِھلا گیا، اشک اور چشمِ تر کی یکجائی کو محسوس نہیں کیا گیا اور شعر غلط طور پر اس طرح رائج ہو گیا:

وہ اشک بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے، پانی کے گھر میں رہتا ہے

گویا چشمِ تر کے پانی اور اشک کو الگ الگ سمجھ لیا گیا۔

وہ حبس ہے کہ ہوا بھی گراں گزرتی ہے: شاعر کا یہ مصرع نہایت قابلِ غور ہے۔ حبس کا معنٰی ہے 'ہوا کا بند ہو جانا'۔ حبس کی موجودگی میں ہوا کیسے آ سکتی ہے کہ وہ گراں گزرے؟ کیسا ''بلند پایہ'' معنوی تضاد ہے۔

وہ صاحبِ طرزِ اُسلوب کے مالک تھے۔

وہ صاحبِ طرزِ اُسلوب نگار ہیں۔

اُن کا طرزِ اُسلوب نہایت دل کش ہے: ادبی رسالوں میں ایسے جملے نظر سے گزرتے رہتے ہیں حالانکہ 'طرز' اور 'اُسلوب' ہم معنٰی ہیں، اِن کی یکجائی لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ ''طرزِ اُسلوب'' (اسلوب کا طرز) کی ترکیب بھی غلط ہے۔

وہ کامیابی حاصل کر سکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے: ایک فاضل کالم نگار کے اس معرکہ آرا جملے میں 'سکنا' اور 'کامیابی' کی تکرار ہے۔ بات فقط اتنی ہے کہ ''وہ کامیاب نہیں ہو سکا۔''

ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر: 'لکھی ہوئی' اور 'تحریر' کی یکجائی لفظی اور معنوی تکرار ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ 'تحریر' ہو یا 'لکھائی'...... ہاتھ ہی سے ممکن ہوتی ہے۔

ہاتھ میں یدِ بیضا ہونا: کسی شاعر کا مصرع ہے:

موسیٰ کے ہاتھ میں یدِ بیضا ہے اک چراغ

ہاتھ میں یدِ بیضا کا جواب نہیں۔ شاعر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ 'ید' تو ہاتھ ہی کو کہتے ہیں۔

ہم نے اپنی تحریر میں لکھا کہ......: کیا 'تحریر' اور 'لکھا' کے معنٰی الگ الگ ہیں؟ دراصل لکھنا یہ چاہیے تھا

'ہم نے اپنے مضمون میں'...... یا 'اپنے خط میں لکھا کہ......'۔

<u>یا خدایا:</u> ''اے خدا'' کہنا چاہیے یا صرف ''خدایا''، ''یا خدایا'' کہنا غلط ہے۔ اِسی طرح ساقیا سے پہلے اے نہیں آئے گا صرف ''ساقیا'' کہا جائے گا۔ قواعد کی رُو سے خدایا اور ساقیا کے آخر میں الف ''اے'' کے معنی دیتا ہے۔ اس لیے اے خدایا، اے ساقیا لکھنا اور کہنا غلط ہوگا۔

<u>یعنی کہ اس کا مطلب ہے......:</u> 'یعنی' کوئی لایعنی لفظ نہیں ہے۔ یہ عَنٰی (فعل ماضی) سے فعل مضارع ہے جس کا ترجمہ ہے 'اس کا معنٰی ہے کہ'۔ اِسے انگریزی میں It means کہیں گے۔ یہاں ''یعنی کہ'' اور ''اس کا مطلب ہے'' کو جمع کرنا معنوی یکسانی اور تکرار کا سبب بن رہا ہے۔

<u>یکم شعبان کی پہلی تاریخ:</u> یکم شعبان یا شعبان کی پہلی تاریخ۔

<u>یومِ عاشور کا دن:</u> یوم عاشور یا عاشور کا دن یا دس مُحرّم۔

<u>یومِ یک جہتیِ کشمیر کا دن:</u> یوم اور دن کی یکجائی کسی طور پر روا نہیں۔ ''یومِ یک جہتیِ کشمیر'' ہی درست ہوگا۔

<u>یہ تحریر میرے سفر نامے کی رُوداد ہے:</u> ہوسکتا ہے کہ عام قاری کی نگاہ اس جملے کے جھول کو نہ سمجھ پائے، مگر میرا خیال ہے کہ توجّہ کی جائے تو تحریر، نامہ...... اور رُوداد کی یکجائی اور ہم معنویت واضح ہو جائے گی۔

<u>یہ کام ان شاء اللہ، اللہ نے چاہا تو ہو کر رہے گا:</u> ان شاء اللہ اور اُس کے ترجمے کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ یہ تکرار توجہ کے فقدان اور بے خبری کی دلیل ہے۔

<u>یہ کام ممکن ہوسکتا ہے:</u> اس جملے میں 'ممکن' اور 'ہوسکنا' ایک ہی معنٰی کے حامل ہیں۔ ممکن کا معنی ہے 'قابلِ اِمکان'، 'ہو سکنے والا کام'۔ بعض اہلِ قلم کی تحریروں میں 'ممکن' اور اس کے مفہوم کی مختلف صورتوں کو ایک ساتھ لکھنے کا التزام دیکھنے میں آتا رہتا ہے مثلاً 'ایسا ممکن نہ ہوسکا'...... 'جہاں تک ممکن ہو سکے' وغیرہ۔ یہ طرزِ تحریر بالکل اس طرح غلط ہے جس طرح 'ماہِ رمضان کا مہینا' 'کارِ ثواب کا کام' یا 'درحقیقت میں'۔

محوّلہ بالا جملوں کی جگہ 'ایسا ممکن نہ ہوا' یا 'ایسا نہ ہو سکا'، 'جہاں تک ممکن ہو' یا 'جہاں تک ہو سکے'

لکھنا چاہیے۔ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اقتصادی ترقی کے نویں پنج سالہ منصوبے ۲۰۰۳-۱۹۹۸ء میں ایک کثیر رقم ایسے منصوبوں کے لیے مختص کی گئی ہے جس سے بنیادی شہری سہولتیں مہیّا کرنا ممکن ہو سکے گا۔''[۲۳]

مثال کے طور پر ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''البیرونی کی معلومات کی بنا پر عہد حاضر کے ماہرینِ ایرانیات کے لیے ممکن ہو سکا ہے کہ وہ ان قدیم مخطوطات کی زبان کو سُغدی ثابت کر سکیں۔''[۲۴]

یہ مضمون بعنوان ''متّقی کون ہے'' کے عنوان سے چھپا: 'بعنوان' اور 'کے عنوان سے' کی یکجائی قواعد سے بے خبری جہالت ہے۔

یہ نوشتۂ دیوار پر لکھا ہوا ہے: ٹیلی وژن کی ایک اینکر نے اس جملے میں تین غلطیاں کی ہیں۔نوشتہ کا تلفظ بروزن نوش تا (Noshta) کیا ہے، دوسرا نوِشتۂ دیوار کے بعد 'پر' کا اضافہ اس کی جہالت ہے اور تیسرا 'نوشتہ' اور 'لکھا ہوا' کو یکجا کر کے معنوی تکرار کا عیب پیدا کر دیا ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ وغیرہ کا بار بار ذکر ہر مرتبہ نیا معنیٰ ، نیا مفہوم اور نئی جہت متعارف کرواتا ہے۔

۲۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (سورہ المعارج:۵)، کَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّاo وَّجَآءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّاo (سورہ الفجر:۲۱،۲۲)، اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (سورہ الزلزال:۱)۔

۳۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاo اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاo (سورہ الم نشرح:۵،۶)، کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَo ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (سورہ التکاثر:۳،۴)۔

۴۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۶ء) ص ۱۴۸-۴۹۔

۵۔ ندیم صدیقی، پُرسہ (ممبرا۔تھانے (انڈیا) اردو قبیلہ، ۲۰۱۵ء) ص ۲۷۰۔

۶۔ ڈاکٹر اشرف کمال، لسانیات، زبان اور رسم الخط ، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء) ص ۷۔

۷۔ پروفیسر عزیز جبران انصاری، چھیڑ چھاڑ، (کراچی: جبران اشاعت گھر، ۲۰۱۶ء) ص ۱۳۹۔

۸۔ شمع پروین، ''علامہ شبلی کے مذہبی مقالات کا تنقیدی جائزہ'' مشمولہ: ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، جلد:۳۹، شمارہ:۴ (علی گڑھ-یو پی (انڈیا)، اپریل ۲۰۲۰ء)، ص ۴۷۔

۹۔ ......نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُo (الانفال:۴۰)۔

۱۰۔ رشید حسن خاں، انشا اور تلفظ، (نئی دہلی-انڈیا: مکتبۂ پیامِ تعلیم جامعہ نگر، ۱۹۹۳ء) ص ۲۷۔

۱۱۔ ندیم صدیقی، پُرسہ، ص ۲۷۴۔

۱۲۔ خالد تاج (مدیر)، ماہ نامہ ادب دوست، (لاہور: شمارہ مئی ۲۰۱۹ء) [اداریہ] ص ۱۔

۱۳۔ ابوالکلام قاسمی (مدیر)، سہ ماہی امروز (شمارہ ۱۳) علی گڑھ (انڈیا) ص ۱۷۔

۱۴۔ ندیم صدیقی، پُرسہ، ص ۲۷۰۔

۱۵۔ ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ، حقائق شناسی مشمولہ فاران (سالنامہ) ۲۰۰۴ء، مدیر پروفیسر سیف اللہ خالد، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور، ص ۱۱۰۔

۱۶۔ شیر شاہ سوری [مقالہ] مشمولہ: اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۱ (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۵ء) ص ۸۸۴۔

۱۷۔ ڈاکٹر فرحت عباس، آج کا اُردو ادب اور ادیب مشمولہ: اُردو کالم، مدیران عابد سیال، ڈاکٹر فاخرہ نورین، شمارہ دسمبر ۲۰۱۵ء تا جنوری ۲۰۱۶ء (اسلام آباد: ادارہ تحقیقاتِ اُردو، مغل مارکیٹ، آئی ایٹ ون) ص ۹۔

۱۸۔ روزنامہ اُردو ٹائمز ممبئی (انڈیا) ۱۷ اپریل ۲۰۲۰۔

۱۹۔ ''علامہ شبلی کے مذہبی مقالات کا تنقیدی جائزہ'' ص ۶۵۔

۲۰۔ پروفیسر عبدالستار صدیقی، مقالاتِ عبدالستار صدیقی جلد اوّل، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب۔ ۲۰۱۷ء)، ص ۲۹۱۔

۲۱۔ ''علامہ شبلی کے مذہبی مقالات کا تنقیدی جائزہ''، ص ۶۹۔

۲۲۔ ڈاکٹر فرحت عباس، آج کا اُردو ادب اور ادیب، مشمولہ: اُردو کالم، ص ۹۔

۲۳۔ پاکستان بطور ایک فلاحی مملکت مشمولہ: مطالعہ پاکستان برائے جماعت نہم و دہم، باب نہم (لاہور: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، مارچ ۲۰۰۰ء)۔

۲۴۔ سُغد [مقالہ] مشمولہ: اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد ۱۱ (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۵ء)، ص ۶۵۔

اُردو کا عددی نظام
(لسانی تناظر میں)

زندگی کے ہر شعبے میں عددی نظام کی حیثیت مُسلّمہ رہی ہے۔ ہم، اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ ناموں کی طرح...... اشیا شماری کا شعور اور استعمال، لِسانی اور تہذیبی تلازمہ رہا ہے۔ آج، دنیا بھر کے انسانی معاشرے مختلف مذاہب، جغرافیائی ریاستوں، زبانوں، نسلوں، رنگوں اور کئی گوناں گوں خانوں میں تقسیم ہو کر، اختلافات اور فسادات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا میں اتنے اختلافات کے باوجود، چند چیزیں بنی نوعِ انسان میں حیرت انگیز طور پر مشترک بھی ہیں جیسے دنوں کی پہچان اور یادداشت کے لیے سات کا عدد دنیا بھر میں رائج ہے اور کسی ظاہری علامت کے بغیر سات کا چکر کاٹ کر وہی دن پھر واپس آ جاتا ہے۔ دوسری مشترکہ چیز یہ تصوّر کہ ہر چیز بالخصوص ہر فردِ بشر کی پہچان اور انفرادیت کے لیے اسے ایک مخصوص نام دیا جاتا ہے جو عام طور پر نہ صرف زندگی بھر اس کے تعارف کا پہلا حوالہ ہوتا ہے بلکہ موت کے بعد بھی کسی نہ کسی انداز میں اس کی یاد اور شناخت کا ذریعہ بنا رہتا ہے۔ تیسرا اشتراک گنتی اور اس کے نظام کا ہے۔ مثلاً جب ہم دس کہتے ہیں تو دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے لیے الگ الگ الفاظ تو ہوں گے لیکن اس سے مراد ہر معاشرے میں پانچ جمع پانچ یا دو کم بارہ ہی رہی ہوگی۔ ایک اَن پڑھ چرواہے سے لے کر آئین سٹائن جیسے نابغہ کا اس میں اختلاف نہیں ہوگا۔ گاؤں کے بالکل اَن پڑھ چرواہے کو اپنی بھیڑ بکریوں کی گنتی یا ان میں کمی بیشی کے حساب کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وہ بھی اپنے طور پر گنتی کے الفاظ اور اُن کی قیمتوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ اَن پڑھ چرواہے سے لے کر دنیا کی سب سے طاقت ور حکومت کے سربراہ تک ہر کوئی اپنے کاروبارِ حیات کے لیے گنتی اور اس کے استعمال کا محتاج ہوتا ہے۔

گنتی کا مطالعہ اور اصلاح کا عمل، ہر زبان میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے قاعدے اور مسائل، ہر زبان کے اپنے اپنے رہے ہیں اور اب بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ اُردو میں گنتی کو درست بولنے اور لکھنے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی جس کی ایک نمایاں وجہ مقامی زبانوں کی گنتیاں ہیں جو اُردو کی گنتی پر حاوی رہی ہیں۔ انگریزی زبان کے اثر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اہلِ زبان بھی بعض اوقات درست گنتی نہیں بول پاتے، انگریزی کی گنتی کا سہارا لیتے ہیں۔ تکلیف دِہ بات یہ ہے کہ لوگ انگلش کی گنتی میں غلطی نہیں کرتے، اُردو میں کر جاتے ہیں۔ گنتی کے معاملے میں یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہندسوں کی زبان الفاظ کی زبان سے آسان ہے۔ نظر اور ذہن، الفاظ کے بجائے ہندسوں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ کروڑوں، اربوں تک کی لمبی رقمیں، ہندسوں میں بڑی آسانی سے لکھ لی جاتی ہیں مگر الفاظ میں لکھتے ہوئے دِقت محسوس ہوتی ہے۔ اُردو گنتی میں بہت سی غیر منطقی اور سماعی شکلیں موجود ہیں جو اس زبان کو سیکھنے والے کے لیے اُلجھن پیدا کرتی ہیں اور کسی مرکب عدد کے نام کا تلفظ وہ کسی اصول، قیاس یا تک بندی سے نہیں کر سکتا۔ معروف ماہرِ لسانیات رشید حسن خان (۱۹۲۵ء-۲۰۰۶ء) اعداد کو الفاظ میں لکھنے کی مُشکلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اعداد کو جب ہندسوں کی شکل میں لکھا جاتا ہے تو اس صورت میں اِملا کی کسی الجھن سے سابقہ نہیں پڑتا، ہاں جب اِن کو الفاظ میں لکھتے ہیں تب بعض گنتیوں کے سلسلے میں اِملائی اُلجھنوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔''[۱]

اکثر پڑھے لکھے، اُردو کے عددی نظام کے قواعد اور اُصول سے ناآشنا ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اعداد، اُن کے مُتعلّقات اور مختلف پہلوؤں کو اُردو عبارت میں صحیح اور مناسب طور پر لکھنے سے قاصر ہیں۔ سال گرہ اور برسی کے موقعوں اور سالانہ جلسوں پر دعوتی کارڈ اور اشتہار بنواتے ہوئے صفتِ عددی کے الفاظ کی اِملا درست نہیں لکھ سکتے۔ اگر انھیں اکیانوِیں (۹۱ ویں) سال گرہ، دو ہزارویں برسی، اِکیاونواں (۵۱ واں) سالانہ جلسہ، اُنہتّر سالہ رپورٹ اور پینتیسواں ایڈیشن لکھنا پڑے تو تردّد میں پڑ جاتے ہیں۔ اعداد کو الفاظ میں لکھتے وقت کی جانے والی غلطیوں کی ذمہ داری بہت حد تک ورقی اور برقی میڈیا پر بھی ہے۔ لوگ، جو پڑھتے اور سنتے ہیں، بغیر تحقیق کیے اُسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اُردو کے مستند لسان شناس پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵-۱۹۷۲ء) اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر اصلاح کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا اپنی رائے کو

دخل دے کر ایک غلط راہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے بغیر تحقیق کیے ہوئے اُس کی غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی وہ اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں راہ پا گئی۔ عوام کے لیے یہ ایک بڑی سند ہوگئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہوں۔ بڑا گروہ مقلّدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے اور تدارک یا اصلاح کی ذمہ داری اہلِ تحقیق پر عائد ہوتی ہے۔ پس ایسی خرابیوں کا انسداد یوں ہی ہوسکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کر کے اِملا کے قاعدے بنائیں اور ہر ممکن ذریعے سے انھیں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔'' [۲]

اِس مقالے میں خالصتاً اُردو کے عددی نظام پر بحث کی گئی ہے۔ عربی اور فارسی کے اسمائے اعداد و صفات الفاظ کی شکل میں اگرچہ اُردو میں استعمال ہوتے رہتے ہیں جیسے واحد، ثلاثہ، اربعہ، خمسہ، عشرہ...... اوّل ثانی، ثالث، رابع، خامس، عاشر، ......مُثلّث، مُربّع، مُخمّس، مُسدّس، مُثمّن، ...... ثُلث، رُبع، خُمس، سُدس، عُشر اور سِہ، چہار، شش ہفت، ہشت، ...... دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم، نہم دہم وغیرہ لیکن مقالہ زیرِ بحث میں صرف اُردو کے عددی نظام سے سروکار رکھا گیا ہے۔

اُردو ہندی گنتی کی بنیاد سنسکرت اور پراکرت ہے جس کے اسمائے اعداد ہند آریائی زبانوں کی نہ جانے کتنی تقسیم اور پھر میل جول کے بعد موجودہ شکل میں ہم تک پہنچے ہیں۔ بنیادی ہندسے ۱......، ۲......، ۳......، ۴......، ۵......، ۶......، ۷......، ۸ اور ۹ ہی ہیں۔ ایک سے نو تک، نو اعداد کی قیمتوں کا تعین ہے جب کہ صفر کی اپنی کوئی قیمت نہ ہونے کے باوجود یہ ہندسوں کے گروہ کا ایک منفرد رکن ہے۔ بعض صورتوں میں اس کی اہمیت معینہ قیمت والے ہندسوں سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ دس علامتوں کا یہ مختصر سا گروہ حقیقت میں فنونِ انسان کی ریڑھ کی ہڈی اور تمام سائنسی علوم کا بنیادی پتھر ہے۔ اِن دس علامتوں کے جوڑ توڑ اور اِن کی ترتیب میں تبدیلی سے گنتی کا تحریری نظام وجود میں آتا ہے۔ گنتی، جس کی ابتدا اگر ایک فرض کر لی جائے تو اس سے پہلے صفر ہے جس کی حقیقت میں کوئی قیمت نہیں۔ اِسی طرح گنتی کی بھی کوئی انتہا نہیں یعنی اس کے انتہائی عدد کو نہ ہی تو کوئی نام دیا جاسکتا ہے اور نہ علامت مقرر کی جاسکتی ہے۔ [۳]

صفر (Zero) کے بغیر گنتی کا تصوّر ہی محال ہے۔ یہ ایک غیر معمولی ہندسہ ہے جس کے بغیر دنیا

میں کسی قسم کے کام کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنی اصل کے اعتبار سے عربی، لفظاً مذکر اور اسمِ صفت ہے۔ یہ گنتی اور پیمانے کا وہ نقطۂ آغاز ہے جسے حدِّ عدم کہتے ہیں۔ اس کا بنیادی معنٰی ''خالی'' ہے۔ کہنے کو تو یہ 'صفر' ہے مگر عددی نظام میں اس کی طاقت ایٹم بم سے کم نہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایک ہندسے کے بعد ایک صفر کا اضافہ کرنے یا ہٹا دینے سے اس ہندسہ کی قدر تبدیل ہو جاتی ہے۔ ذرا تصوّر کیجیے کہ آپ کی تنخواہ میں سے اگر ایک صفر نکال دیا جائے، یا اس میں ایک صفر کا اضافہ کر دیا جائے، تو آپ کی فکر مندی یا خوشی کی انتہا کیا ہو گی۔ یہ بڑے سے بڑے عدد کو صفر کر سکتا ہے مگر اپنا وجود اور اپنی قیمت برقرار رکھتا ہے۔ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے مطابق:

> ''صفر [ع] کے معنی عربی میں ''خالی'' کے ہیں، جس کے لیے سنسکرت میں سُونیا کا لفظ ہے، جو ہندوی- عربی علم الحساب میں مستعمل تھا اور جو انگریزی لفظ Zero کا مترادف ہے۔ عربوں کی ایجاد 'صفر' عددی ترقیم کی بنیادی ترقی کا نشان ہے۔ صفر ہی سے مغربی زبانوں کے الفاظ Cipher، Cifra، Ziffer، Chiffre اور Zero ماخوذ ہیں۔ سب سے قدیم عربی صفر ۲۶۰ھ کی ایک تحریر میں ملتا ہے۔ ہندوؤں اور مغربی عربوں کے ہاں صفر کی شکل ایک دائرہ ہے اور مشرقی عربوں کے ہاں ایک نقطہ؛ ایران- ہندوی رواج بھی غالباً یہی ہے۔'' [۴]

عدد، صفات ہی کی ایک قسم ہے جو مفہوم میں اضافہ اور اطلاق کو محدود کرنے کا کام دیتا ہے۔ جس طرح صفت اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے اِسی طرح عدد بھی معدود سے پہلے آتا ہے اور صفت ہی کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندی کے تمام عدد سنسکرت سے ماخوذ ہیں سوائے لفظ ہزار کے کہ ظاہر ظہور فارسی ہی سے لیا گیا ہے۔ عددوں کے مستقل نام بہت تھوڑے ہیں یعنی ایک سے لے کر دس تک اور پھر سو، ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب، کھرب وغیرہ، باقی سب مشتق ہیں یا مرکب۔ عقود یا دہائیوں کے نام اکائیوں سے مشتق ہیں جیسے بیس بے (بہ معنٰی دو) سے، تیس تین سے وغیرہ وغیرہ۔ ایک دہائی سے لے کر دوسری دہائی تک درمیانی عدد سب مرکب ہیں۔ [۵] عدد کی ماہیّت اور قسموں کے بارے میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''صفتِ عدد سے کسی اسم کی تعداد معلوم ہوتی ہے۔ تعداد دو قسم کی ہوتی ہے، ایک کسی شے کا ٹھیک عدد معلوم ہونا جیسے پانچ آدمی، چھے گھوڑے وغیرہ، اِسے تعدادِ معیّن کہتے ہیں۔ دوسرے جب ٹھیک ٹھیک تعداد کسی شے کی معلوم نہ ہو جیسے

ہزاروں کتابیں، چندلوگ وغیرہ۔ اِسے تعدادِ غیر معیّن کہتے ہیں۔''[۶]

معدود اور موصوف کے لحاظ سے عدد کی دو قسمیں ہیں جن میں پہلی قسم ذاتی ہے جس سے اشخاص اور اشیا کا شمار معلوم ہوتا ہے اور جس کا شمار معلوم ہوا اُسے معدود کہتے ہیں مثلاً: پانچ کتابیں۔ اس مثال میں پانچ عدد ہے اور کتابیں معدود۔ عدد کی دوسری قسم صفتی ہے جس سے اشخاص اور اشیا کی ترتیب یا درجہ معلوم ہوتا ہے جیسے پانچواں سبق۔ پانچواں عدد ہے جب کہ سبق موصوف ہے۔ اعدادِ معین کی اقسام میں سے اعدادِ معمولی (جیسے: ایک، دو تین چار......کُل گنتی) پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ اعدادِ ترتیبی، اعدادِ استغراقی، اعدادِ اضعافی اور اعدادِ کسری دوسری قسم سے۔[۷]

اَعدادِ غیر مُعَیَّن

وہ اعداد جو بغیر حد اور تعین کے اشیا اور اشخاص کی تعداد کو ظاہر کریں اعدادِ غیر معیّن کہلاتے ہیں جیسے: دسیوں، بیسیوں، پچاسوں، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں اور کھربوں۔ یہ واحد نہیں، جمع کی صورت میں ہوتے ہیں۔ اعدادِ غیر معین سے کثرت کا اظہار ہوتا ہے جیسے: مجھے دسیوں کام ہیں۔ اس مکان میں بیسیوں کمرے ہیں۔ ہر روز سیکڑوں آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے۔ ہزاروں آدمی جمع تھے۔ لاکھوں روپیہ صرف ہوگا۔ فلاں ملک کروڑوں کی آبادی پر مشتمل ہے وغیرہ۔ اِن اعداد کو بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اعدادِ معین کے ساتھ ''یوں'' اور ''وں'' کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے دسیوں، بیسیوں، سیکڑوں، ہزاروں وغیرہ۔ (۸) اعدادِ غیر معین کے ساتھ معدود کا لگانا ضروری ہے جیسے دسیوں مرتبہ، بیسیوں جانور، ہزاروں لوگ، لاکھوں روپے وغیرہ۔ تعدادِ غیر معین کے لیے کئی، کچھ، تھوڑا، تھوڑے، چند، بعض، بہت، سب، کُل، اتنا اور جتنا وغیرہ الفاظ بھی اکثر مستعمل ہیں جیسے: 'کئی کتابیں ایسی ہیں جن کا پڑھنا لازم ہے'۔ 'کچھ لوگ ابھی تک نہیں آئے'۔ 'بعض صاحبوں کا ایسا خیال ہے'۔ 'اِدھر صرف چند مکان ہیں'۔ 'بہت آدمی آ گئے'۔ 'سب کو یہاں سے اٹھالو'۔ 'کُل مہمان آ گئے'۔ 'اتنے آدمیوں کی سمائی کیوں کر ہوگی'۔ 'جتنے آدمی بلائے گئے تھے اُتنے ہی آ گئے ہیں'۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کے مطابق 'بہت سارے جانور'، 'سب انسان'، 'کچھ لوگ'، 'کئی افراد'، 'چند دوست'، 'بعض ادیب'، 'کُل رقم' اور 'تھوڑے لوگ' میں 'بہت'، 'سب'، 'کچھ'، 'کئی'، 'چند'، 'بعض'، 'کُل' اور 'تھوڑے' اگرچہ اعداد نہیں ہیں مگر معدود الفاظ کا سابقہ ہونے کی وجہ سے غیر معین اعداد کے قائم مقام ہیں اور اُسی زمرے میں آئیں گے۔[۹]

اعدادِ مُعَیَّن

قطعی اور حتمی اعداد کو اعدادِ مُعیّن کہا جاتا ہے، ان کی پانچ قسمیں ہیں:

۱۔ اعدادِ معمولی جیسے: دو، تین، چار......ننانوے، سو

۲۔ اعدادِ ترتیبی ۳۔ اعدادِ استغراقی ۴۔ اعدادِ کسری ۵۔ اعدادِ اضعافی

اعدادِ معمولی

اُردو کے یہ اعداد پراکرت سے ماخوذ ہیں۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ اور ۹ مفرد اعداد ہیں جو اعدادِ مُعیّن کی بنیاد بنتے ہیں۔ یہ اعداد ایک، دو، پانچ، دس، بیس، پچاس اور سو تک ہی نہیں، ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب اور معلوم حد کھرب تک جاتے ہیں مگر پھر بھی لامحدود رہتے ہیں۔ ایک سے لے کر سو تک، الفاظ کی صورت میں، اعدادِ معمولی درج ذیل ہیں:

ایک (۱)، دو (۲)، تین (۳)، چار (۴)، پانچ (۵)، چھے (۶)، سات (۷)، آٹھ (۸)، نو (۹)، دس (۱۰)، گیارہ (۱۱)، بارہ (۱۲)، تیرہ (۱۳)، چودہ (۱۴)، پندرہ (۱۵)، سولہ (۱۶)، سترہ (۱۷)، اٹھارہ (۱۸)، اُنیس (۱۹)، بیس (۲۰)، اکیس (۲۱)، بائیس (۲۲)، تئیس (۲۳)، چوبیس (۲۴)، پچیس (۲۵)، چھبیس (۲۶)، ستائیس (۲۷)، اٹھائیس (۲۸)، اُنتیس (۲۹)، تیس (۳۰)، اکتیس (۳۱)، بتیس (۳۲)، تینتیس (۳۳)، چونتیس (۳۴)، پینتیس (۳۵)، چھتیس (۳۶)، سینتیس (۳۷)، اڑتیس (۳۸)، انتالیس (۳۹)، چالیس (۴۰)، اکتالیس (۴۱)، بیالیس (۴۲)، تینتالیس (۴۳)، چوالیس (۴۴)، پینتالیس (۴۵)، چھیالیس (۴۶)، سینتالیس (۴۷)، اڑتالیس (۴۸)، اُنچاس (۴۹)، پچاس (۵۰)، اکیاون (۵۱)، باون (۵۲)، ترپن (۵۳)، چوّن (۵۴)، پچپن (۵۵)، چھپّن (۵۶)، ستاون (۵۷)، اٹھاون (۵۸)، انسٹھ (۵۹)، ساٹھ (۶۰)، اکسٹھ (۶۱)، باسٹھ (۶۲)، تریسٹھ (۶۳)، چونسٹھ (۶۴)، پینسٹھ (۶۵)، چھیاسٹھ (۶۶)، سرسٹھ (۶۷)، اڑسٹھ (۶۸)، اُنھتّر (۶۹)، ستر (۷۰)، اکہتر (۷۱)، بُہتر (۷۲)، تہتر (۷۳)، چوہتر (۷۴)، پچھتّر (۷۵)، چھہتر (۷۶)، ستتر (۷۷)، اٹھتر (۷۸)، اُناسی (۷۹)، اسّی (۸۰)، اکیاسی (۸۱)، بیاسی (۸۲)، تراسی (۸۳)، چوراسی (۸۴)، پچاسی (۸۵)، چھیاسی (۸۶)، ستاسی (۸۷)، اٹھاسی (۸۸)، نِواسی/ اُنانوے (۸۹)، نوے (۹۰)، اکیانوے (۹۱)، بانوے (۹۲)، ترانوے (۹۳)، چورانوے (۹۴)، پچانوے (۹۵)، چھیانوے (۹۶)، ستانوے (۹۷)، اٹھانوے (۹۸)، ننانوے (۹۹)، سو (۱۰۰)۔

اعدادِ معین کی قسم 'اعدادِ معمولی' کے مطالعے میں، درج ذیل قاعدوں اور ضابطوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ ایک سے نو تک کی گنتی، الفاظ کے بجائے ہندسوں میں لکھی جائے تو یہ مفرد صورت میں ہوگی کیونکہ یہ اعداد اپنی تخلیق کے اعتبار سے مفرد ہیں جیسے ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، اور ۹۔ یہی اعداد پورے عددی نظام کی بنیاد ہیں۔

۲۔ ۱ (ایک) کے داہنی طرف صفر لگانے سے ۱۰ کا ہندسہ وجود میں آتا ہے۔ یہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مرکب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸ اور ۹...... اپنی داہنی طرف صفر لگنے سے دس گنا بڑھ کر ۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰، ۶۰، ۷۰، ۸۰ اور ۹۰ بن جاتے ہیں۔ دوسری صفر لگانے سے سو اور تیسری سے ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ دو (۲) کا بھی عجیب معاملہ ہے۔ بارہ، بائیس، بتّیس، بیالیس، باون، باسٹھ، بُہتّر، بیاسی اور بانوے کی ''دو'' سے کوئی لفظی مناسبت نہیں ہے۔ 'دو' دال سے شروع ہوتا ہے جبکہ اس سے تشکیل پانے والے اعداد ''ب'' سے شروع ہوتے ہیں۔

۴۔ ۶ (چھے) کے ہندسے کو اُردو میں چھ یا چھے لکھنا مُتنا زَعٌ فیہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں 'چھ' لکھنے کا رواج چل نکلا ہے۔ راقم کے نزدیک چھے درست ہے اور یہی ادبی زبان کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں جناب رشید حسن خان کا موقف دو ٹوک ہے:

> ''چھے کو پہلے چھ بھی لکھا جاتا تھا۔ اب بھی اسے کچھ لوگ چھ لکھ رہے ہیں، مگر چھ تو کوئی لفظ ہی نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ جب تک کسی اور حرف کو شامل نہ کیا جائے اُس وقت تک یہ حرکت کو قبول کر ہی نہیں سکتا۔ جیسے ایک لفظ ہے 'پُوچھ' اِس میں آخری ٹکڑا ''چھ'' ہے۔ اس طرح تو یہ آ سکتا ہے، ایک مستقل لفظ کے طور پر نہیں آ سکتا۔ اب اس کو چھے ہی لکھنا چاہیے جیسے: چھے دن، چھے روپے وغیرہ۔''[۱۰]

چھے (۶) کا عدد پہلی دہائی (دس جمع چھے) میں ''سولہ'' اور چھٹی دہائی (چھے ضرب دس) میں ''ساٹھ'' کی شکل اختیار کرتا ہے۔ سولہ اور ساٹھ کا بظاہر چھے سے کوئی صوتی اور معنوی رشتہ نہیں ہے۔ باقی دہائیوں یعنی چھبیس، چھتیس، چھیالیس، چھپن، چھیاسٹھ، چھہتر، چھیاسی، چھیانوے میں چھے (۶) اپنی پوری صوتی و معنوی موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔

۵۔ گیارہ سے اٹھارہ تک کے اعداد کو الفاظ میں لکھنے کی بحث بہت دل چسپ ہے۔ اس میں مقامی لہجوں کو

بہت دخل ہے۔ گنتی کے معاملے میں اُردو پر، معاصر مقامی زبانوں کا گہرا اثر ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کیونکہ پاک و ہند میں علاقائی زبانیں بولنے والے، اُردو بھی بولتے اور لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس دل چسپ صورتِ حال کی بابت لکھتے ہیں:

''گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ اور سولہ کے کلمات ادا کرنے میں اہلِ پنجاب کا مَیلان مغنونہ کی طرف ہے جیسے یاراں، باراں، تیراں، چوداں اور سولاں۔ اُردو بولتے ہوئے بھی کچھ لوگ گیاراں، باراں، تیراں، چوداں اور سولاں بول جاتے ہیں۔ یہ لہجہ پنجابی میں تو جائز ہے اُردو کو یہ پسند نہیں۔''[۱۱]

اس بحث میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا نقطۂ نظر ہے کہ:

''گنتی کے لفظوں میں (۱۱ سے ۱۸ تک) اخیر کا حرف 'ہ' ہے۔ بعضے لوگ اُن کے آخر میں ''اں'' لکھ دیتے ہیں اس لیے کہ بعض خِطّوں میں ''گیاراں''، باراں'' وغیرہ بولتے ہیں۔ اور جو لوگ ''گیارا''''بارا'' بولتے ہیں وہ کبھی کبھی اُسی طرح لکھ جاتے ہیں مگر یہ درست نہیں، کس واسطے کہ ان لفظوں میں 'ہ' اصلی اور ملفوظ ہے۔ پس اِن گنتیوں کو 'ہ' کے ساتھ لکھنا چاہیے یعنی 'گیارہ'، 'بارہ'۔''[۱۲]

رشید حسن خان نے اس بحث کو بڑے واضح اور جامع انداز میں سمیٹا ہے:

''یہ بات خاص طور پر ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ گیارہ سے اٹھارہ تک جو گنتیاں ہیں، اُن کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے۔ تلفظ میں یہ 'ہ' کبھی واضح طور پر آتی ہے (جیسے: گیارہ) اور کبھی اس کی آواز کچھ ہلکی ہو جایا کرتی ہے (جیسے: اٹھارہ) لیکن یہ ہے ہائے ملفوظ۔ علاقائی تلفظ کے اثر سے کبھی اس 'ہ' کی آواز الف کے قریب بھی پہنچ جایا کرتی ہے اور کبھی نونِ غنّہ کی آواز بھی شامل ہو جایا کرتی ہے، تلفظ کے علاوہ کتابت میں بھی یہ صورت کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے؛ لیکن اب یہ سب غیر معیاری صورتیں ہیں۔ کتابت اور تلفظ کے یہ ایسے مسائل ہیں جن کا حقیقی تعلق اب مسائلِ تدوین سے ہے۔ اِن آٹھوں اعداد کی صحیح اور معیاری صورت (بہ لحاظِ تلفظ اور بہ لحاظِ اِملا) مع ہائے ملفوظ اس طرح ہے: گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ، سترہ، اٹھارہ۔''[۱۳]

''بعض علاقوں یا کچھ لوگوں کے تلفظ میں ان کی صورتیں بارا، تیرا اور باراں، تیراں

بھی پائی جاتی ہیں، مگر ادبی زبان میں اب ان اعدادِ معین کی صحیح صورت یہ ہے:

گیارہ، بارہ............''[۱۴]

ماہرِ لسانیات عصمت جاوید گیارہ سے اٹھارہ تک کے لفظوں میں پائے جانے والے صرفیوں اور لاحقوں پر اس طرح بحث کرتے ہیں:

''کچھ اُردو ہندسے مرکب ہیں اور کچھ میں صرفیے پائے جاتے ہیں۔ دس کے بعد اعداد میں تعلیقے اور لاحقے ملتے ہیں مثلاً چودہ اور سولہ میں ہ اور گیارہ بارہ تیرہ، پندرہ، سترہ، اٹھارہ میں رہ۔ اِن اعداد میں صرفیہ 'ہ' کی آواز نحیف ہے اور یہ گیارا، بارا......کی طرح ادا کیے جاتے ہیں لیکن لکھنے میں آخر میں 'الف' کے بجائے 'ہ' ہی آئے گی۔''[۱۵]

۶۔ اُنیس سے اڑتالیس تک کی گنتی میں آخری حرف ''س'' سے پہلے ''ی'' ہے جیسے: اُنیس، بیس، چونتیس، چالیس، چوالیس اور اڑتالیس وغیرہ۔

۷۔ ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۴۵، ۴۷ اور ۶۵ ایسے اعداد ہیں کہ جب انھیں لفظوں میں لکھا جائے گا تو اِن میں ''نونِ غُنّہ'' ضرور آئے گا جیسے: تینتیس، چونتیس......پینسٹھ۔

۸۔ ۶۹ سے ۷۸ تک کی گنتیوں میں سے کچھ میں ہائے مخلوط (ھ) آتی ہے بعض میں ہائے ملفوظ اور بعض میں ہ آتی ہی نہیں جیسے اُنھتّر، ستّر، اِکہتّر، بہتّر، تہتّر، چوہتّر، پچھتّر، چھہتّر، ستتّر، اٹھتّر۔ رشید حسن خان اِکہتّر اور چھہتّر کے بجائے اِکھتّر اور چھِیَتّر لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔[۱۶] لیکن اُن کا یہ موقف ہمارے ہاں مُرَوّج نہیں ہوسکا۔

۹۔ اُنیس، اُنتیس، اُنتالیس، اُنچاس، اُنسٹھ، اُنھتّر، اُناسی اور اُنانوے (اگر اسے نواسی کی جگہ اُردو کا عدد مانا جائے تو) میں ''اُن'' کا سابقہ ''نَو'' کا قائم مقام ہے۔ ''اُن'' کے لاحقے (مختلف شکلوں کے) ''لیس، ''تیس''، ''تالیس''، '' چاس''، ''سٹھ''، ''ہتّر''، ''اسی'' اور ''انوے'' بتدریج بیس، تیس، چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر، اَسّی اور نوّے کے قائم مقام ہیں بلکہ تیس، سٹھ اور اَسّی تو بالکل اپنی اصل حالت میں ہیں۔

۱۰۔ ہر دہائی کے نو (۹) کے ہندسے والا عدد، اپنے سے اگلی دہائی کا صوتی آہنگ اختیار کر لیتا ہے جیسے ۱۹ (جس کا تعلق ۱۱ سے ۱۹ تک کی دہائی سے ہے) اپنے سے اگلی دہائی (۲۱ سے ۲۹ تک) کی آواز دیتا ہے۔ اسی طرح ۲۹، ۳۹، ۴۹، ۵۹، ۶۹ اور ۷۹ کے اعداد کا معاملہ ہے۔ ۸۹ یعنی نواسی کا مسئلہ مذکورہ اعداد سے بالکل مختلف ہے۔ اُصولی طور پر ۸۹ کا صوتی آہنگ نوّے کی دہائی سے ملنا چاہیے تھا

مگر یہ صوتی اعتبار سے اپنی ہی دہائی میں رہتا ہے۔ اس معاملے میں پنجابی، سرائیکی، پہاڑی، ہندکو اور پوٹھوہاری میں بولے جانے والے 'اُنانوے' کی قدروقیمت شدومد سے واضح ہوتی ہے۔ راقم نے اپنے بزرگ دوست، مستند لسان شناس جناب محمد احسن خان[۱۷] سے فون پر بات کی کہ نِواسی کے بجائے اُنانوے ہی نوّے کی دہائی سے ہم آہنگ ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے فرمایا نِواسی اُردو کا روزمرّہ ہے اس پر بات نہیں ہوسکتی۔ پھر راقم نے اُردو، فارسی اور سرائیکی کے عالم، معروف شاعر اور ادیب پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری[۱۸] سے بات کی تو ان کی رائے 'اُنانوے' کے حق میں تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ نواسی، صوتی ہم آہنگی میں قرینے سے ہٹ کر ہے دوسرا یہ ذومعنٰی لفظ ہے یعنی بیٹی کی بیٹی۔ تیسرا یہ کہ پنجابی، سرائیکی اور دیگر کئی زبانوں میں 'اُنانوے' کثرت سے بولا جاتا ہے۔ اس کثرتِ استعمال کی بنا پر اکثر لوگ اُردو بولتے اور لکھتے ہوئے بھی 'اُنانوے' استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ صَوت اور اِبلاغ کا بھرپور ساتھ دیتا ہے۔ اُردو میں اسے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ایک اچھا اضافہ ہوگا۔

۱۱۔ اُردو الفاظ میں ۱۱ تا ۹۹ کے لاحقے بتدریج تبدیل ہوتے رہتے ہیں:

گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ، سترہ، اٹھارہ .... =رہ

سولہ .... =ہ

انیس، بیس، اکیس، بائیس، تیئس، چوبیس، پچیس، چھبیس، ستائیس اور اٹھائیس =یس

اُنتیس، تیس، اکتیس، بتیس، تینتیس، چونتیس، پینتیس، چھتیس، سینتیس اور اڑتیس =تیس

انتالیس، چالیس، اکتالیس، بیالیس، تینتالیس، چوالیس، پینتالیس، چھیالیس، سینتالیس اور اڑتالیس =الیس

انچاس، پچاس .... =چاس

اکیاون، باون .... =اون

ترپن، پچپن اور چھپن .... =پن

چوّن .... =ون

ستاون اور اٹھاون .... =اون

انسٹھ، اکسٹھ، باسٹھ، تریسٹھ، چونسٹھ، پینسٹھ، چھیاسٹھ، سرسٹھ، اڑسٹھ .... =سٹھ

ساٹھ .... = اٹھ

اُنھتّر، ستّر، اکہتر، بہتر، تہتر، چوہتر، پچھتر، چھہتر، ستتر، اٹھتّر .... =تر

اُناسی، اکیاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی، پچاسی، چھیاسی، ستاسی، اٹھاسی، نواسی =اسی

اسی .... =سی

نوّے .... =وے

اکیانوے، بانوے، ترانوے، چورانوے، پچانوے، چھیانوے، ستانوے، اٹھانوے، ننانوے =انوے

اَعدادِ ترتیبی

صفتِ عددی کی دوسری قسم صفتِ ترتیبی ہے جو موصوف کی ترتیب کا اظہار کرتی ہے۔ یہ وہ اعداد ہیں جو ایک سلسلے یا مجموعے میں کسی خاص چیز کے مقامِ معیّن کو بتاتے ہیں اور اعدادِ ترتیبی کہلاتے ہیں جیسے پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں وغیرہ۔ فارسی کے اعدادِ ترتیبی بھی اُردو میں استعمال ہوتے ہیں جیسے یکم، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم، ہفتم، ہشتم، نہم اور دہم وغیرہ۔ اِسی طرح عربی کے بھی استعمال ہوتے رہتے ہیں جیسے اوّل ثانی، ثالث، رابع، خامس، سادس، سابع، ثامن، تاسع، عاشر۔ ان کی تانیث بھی اُردو میں مستعمل ہے جیسے اُولیٰ، ثانیہ، ثالثہ وغیرہ۔ اُردو کے اعداد ترتیبی میں مندرجہ ذیل لاحقے پائے جاتے ہیں:

۱۔ ے ا (موصوف مذکر ہونے کی صورت میں) مثلاً: پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، چھٹا۔

۲۔ ے ی (موصوف مونث ہونے کی صورت میں) مثلاً: پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، چھٹی۔

۳۔ واں (موصوف مذکر ہونے کی صورت میں) مثلاً: پانچواں، ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں وغیرہ۔

۴۔ وِیں موصوف مونث ہونے کی صورت میں...... (یائے معروف کے ساتھ) جیسے پانچوِیں جماعت، ساتوِیں عورت، آٹھوِیں مجلس، نوِیں طالبہ، دسوِیں نشست وغیرہ۔

۵۔ ویں متغیر شکل (یائے مجہول کے ساتھ) جیسے پانچویں شخص نے، ساتویں آسمان پر، آٹھویں دروازے پر، نویں سال، دسویں طالب علم نے وغیرہ۔

مذکر موصوف کے لیے

پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا/ چھٹواں/ چھیواں، ساتواں، آٹھواں، نواں، دسواں، گیارھواں، بارھواں، تیرھواں، چودھواں، پندرھواں، سولھواں، سترھواں، اٹھارواں، انیسواں، بیسواں، اکیسواں، بائیسواں، تئیسواں، چوبیسواں، پچیسواں، چھبیسواں، ستائیسواں، اٹھائیسواں، اُنتیسواں، تیسواں، اکتیسواں، بتیسواں، تینتیسواں، چونتیسواں، پینتیسواں، چھتیسواں، سینتیسواں، اڑتیسواں، انتالیسواں، چالیسواں، اکتالیسواں، بیالیسواں، تینتالیسواں، چوالیسواں، پینتالیسواں، چھیالیسواں،

سینتالیسواں، اڑتالیسواں، اُنچاسواں، پچاسواں، اکیاونواں، باونواں، ترپنواں، چوّنواں، پچپنواں، چھپّنواں، ستاونواں، اٹھاونواں، انسٹھواں، ساٹھواں، اکسٹھواں، باسٹھواں، تریسٹھواں، چونسٹھواں، پینسٹھواں، چھیاسٹھواں، سرسٹھواں، اڑسٹھواں، اُنھتر واں، ستر واں، اکہتر واں، بُہتر واں، تہتر واں، چوہتر واں، پچھتر واں، چھہتر واں، ستتر واں، اٹھتر واں، اُناسی واں، اسی واں، اکیاسی واں، بیاسی واں، تراسی واں، چوراسی واں، پچاسی واں، چھیاسی واں، ستاسی واں، اٹھاسی واں، نوَاسی واں، نوّے واں، اکیانواں، بانواں، ترانواں، چورانواں، پچانواں، چھیانواں، ستانواں، اٹھانواں، ننانواں، سوواں۔

مونث موصوف کے لیے......(یائے معروف کے ساتھ)

پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی/ چھٹوِیں/ چھیوِیں، ساتوِیں، آٹھوِیں، نوِیں، دسوِیں، گیارھوِیں، بارھوِیں، تیرھوِیں، چودھوِیں، پندرھوِیں، سولھوِیں، سترھوِیں، اٹھاروِیں، انیسوِیں، بیسوِیں، اکیسوِیں، بائیسوِیں، تئیسوِیں، چوبیسوِیں، پچیسوِیں، چھبیسوِیں، ستائیسوِیں، اٹھائیسوِیں، اُنتیسوِیں، تیسوِیں، اکتیسوِیں، بتیسوِیں، تینتیسوِیں، چونتیسوِیں، پینتیسوِیں، چھتیسوِیں، سینتیسوِیں، اڑتیسوِیں، انتالیسوِیں، چالیسوِیں، اکتالیسوِیں، بیالیسوِیں، تینتالیسوِیں، چوالیسوِیں، پینتالیسوِیں، چھیالیسوِیں، سینتالیسوِیں، اڑتالیسوِیں، اُنچاسوِیں، پچاسوِیں، اکیاونوِیں، باونوِیں، ترپنوِیں، چوّنوِیں، پچپنوِیں، چھپّنوِیں، ستاونوِیں، اٹھاونوِیں، انسٹھوِیں، ساٹھوِیں، اکسٹھوِیں، باسٹھوِیں، تریسٹھوِیں، چونسٹھوِیں، پینسٹھوِیں، چھیاسٹھوِیں، سرسٹھوِیں، اڑسٹھوِیں، اُنہتروِیں، ستروِیں، اکہتروِیں، بہتروِیں، تہتروِیں، چوہتروِیں، پچھتّروِیں، چھہتروِیں، ستتروِیں، اٹھتروِیں، اُناسی وِیں، اسّی وِیں، اِکیاسی وِیں، بیاسی وِیں، تراسی وِیں، چوراسی وِیں، پچاسی وِیں، چھیاسی وِیں، ستاسی وِیں، اٹھاسی وِیں، نوَاسی وِیں، نوّے وِیں، اِکیانوِیں، بانوِیں، ترانوِیں، چورانوِیں، پچانوِیں، چھیانوِیں، ستانوِیں، اٹھانوِیں، ننانوِیں، سووِیں۔

متغیر شکل......(یائے مجہول کے ساتھ)

اعدادِ ترتیبی میں حروفِ روابط یا اُن کے توابع داخل ہوں تو اُن کا الف یائے مجہول سے تبدیل ہو جاتا ہے جیسے: پہلے لڑکے نے ساتویں درجے تک اُردو پڑھ کر انگریزی شروع کی۔ محمود ابھی آٹھویں درجے میں ہے۔ یہ اعداد مندرجہ ذیل ہیں:

پہلے، دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے/ چھٹویں/ چھیویں، ساتویں، آٹھویں، نویں،

دسویں، گیارھویں، بارھویں، تیرھویں، چودھویں، پندرھویں، سولھویں، سترھویں، اٹھارویں، انیسویں، بیسویں، اکیسویں، بائیسویں، تئیسویں، چوبیسویں، پچیسویں، چھبیسویں، ستائیسویں، اٹھائیسویں، اُنتیسویں، تیسویں، اکتیسویں، بتیسویں، تینتیسویں، چونتیسویں، پینتیسویں، چھتیسویں، سینتیسویں، اڑتیسویں، انتالیسویں، چالیسویں، اکتالیسویں، بیالیسویں، تینتالیسویں، چوالیسویں، پینتالیسویں، چھیالیسویں، سینتالیسویں، اڑتالیسویں، اُنچاسویں، پچاسویں، اکیاونویں، باونویں، ترپنویں، چوّنویں، پچپنویں، چھپّنویں، ستاونویں، اٹھاونویں، انسٹھویں، ساٹھویں، اکسٹھویں، باسٹھویں، تریسٹھویں، چونسٹھویں، پینسٹھویں، چھیاسٹھویں، سرسٹھویں، اڑسٹھویں، اُنھتر ویں، ستر ویں، اکہتر ویں، بُہتر ویں، تہتر ویں، چوہتر ویں، پچھتر ویں، چھہتر ویں، ستتر ویں، اٹھتر ویں، اُناسی ویں، اسی ویں، اکیاسی ویں، بیاسی ویں، تراسی ویں، چوراسی ویں، پچاسی ویں، چھیاسی ویں، ستاسی ویں، اٹھاسی ویں، نوَاسی ویں، نوّے ویں، اکیانویں، بانویں، ترانویں، چورانویں، پچانویں، چھیانویں، ستانویں، اٹھانویں، ننانویں، سوویں۔

گیارہ سے لے کر اٹھارہ تک کے اعدادِ معمولی، اعدادِ ترتیبی میں تبدیل ہوں گے تو ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط سے بدل جائے گی۔ جیسے بارہ سے بارھواں، بارھویں وغیرہ۔ اس میں اٹھارہ کے عدد کا استثنا ہے۔ قاعدے کے مطابق تو اس کو بھی بارھواں، بارھویں کی طرح اٹھارھواں، اٹھارھویں لکھا جانا چاہیے، لیکن تلفظ میں ہائے مخلوط ساتھ نہیں دیتی اور ان کو ھ کے بغیر ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔[۱۹] اِن آٹھوں اعدادِ ترتیبی کی صحیح صورت یہ ہے:

گیارھواں گیارھِویں، بارھواں بارھِویں، تیرھواں تیرھِویں، چودھواں چودھِویں، پندرھواں پندرھِویں، سولھواں سولھِویں، سترھواں سترھِویں، اٹھارواں اٹھارِویں۔

پہلا اور دوسرا سے لے کر اٹھتر واں اور اٹھتر وِیں تک اعدادِ ترتیبی کے لکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، البتہ ۷۹ سے ۹۹ تک کچھ الجھن محسوس ہو سکتی ہے۔ یہ الجھن محض اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ۷۹ سے لے کر ۹۹ تک کے اعداد، اعدادِ ترتیبی کی صورت میں عموماً استعمال میں نہیں آتے رہے ہیں اس بنا پر نامانوس پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں طریقہ یہ ہے کہ ۷۹ سے ۸۹ تک کے اعداد میں ''واں'' اور ''ویں'' کو منفصل لکھا جائے گا کیونکہ ان کے ملا کر لکھنے سے عددی وضاحت کم ہوتی ہے، الجھن اور التباس کا باعث بھی بنتا ہے مثلاً اُناسی واں اُناسی ویں۔ نوّے واں نوّے ویں بھی ٹھیک ہے لیکن اگر ۹۰ واں ۹۰ وِیں ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ نوّے واں نوّے وِیں قدرے غیر مانوس ہے۔ اس طرح ۷۹ واں، ۸۰ واں، ۸۱ واں اور ۸۲ واں بھی بہتر رہیں گے۔ ۹۱ سے ۱۰۰ تک کے اعداد کو یوں رکھا جائے: اکیانواں

اکیانوِیں، بانواں بانوِیں، ترانواں ترانوِیں، چورانواں چورانوِیں، پچانواں پچانوِیں، چھیانواں چھیانوِیں، ستانواں ستانوِیں، اٹھانواں اٹھانوِیں، ننانواں ننانوِیں، سوواں سووِیں۔

۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴ کو یوں لکھا جائے: ایک سو ایک واں، ایک سو دوواں، ایک سو تین واں، ایک سو چارواں۔ یہ بات یاد رہے کہ انھیں ایک سو پہلا، ایک سو دوسرا اور ایک سو تیسرا اور ایک سو چوتھا نہیں لکھنا چاہیے۔ اس طرح بھی زیادہ مناسب ہے: ۱۰۱واں، ۱۰۲واں، ۱۰۳واں، ۱۰۴واں، ۱۰۵واں، وغیرہ[۲۰] سال گرہ، برسی کے موقعوں اور سالانہ جلسوں پر دعوتی کارڈ اور اشتہار بنواتے ہوئے صفتِ عددی کے الفاظ کی اِملا اس طرح لکھنی چاہیے: اَسّی ویں سال گرہ، دو ہزارویں برسی، اِکیاونواں سالانہ جلسہ، پانچ سالہ رپورٹ اور کتاب کا پینتیسواں ایڈیشن وغیرہ۔

اَعدادِ اِستغراقی

وہ اعداد جن سے اظہارِ کلیت ہوتا ہو انھیں اَعدادِ شمولی یا استغراقی کہتے ہیں۔ یہ وہ اعداد ہیں جن سے، ایک سے زیادہ کے شمول کا مفہوم نکلتا ہے جیسے دونوں، تینوں، ساتوں اور دسوں وغیرہ۔[۲۱] ان کے بنانے کا عمومی قاعدہ یہ ہے کہ عددِ معمولی کے آگے ''وں'' بڑھا دیتے ہیں جیسے چار سے چاروں، پانچ سے پانچوں۔ (مستثنیات سے بحث نہیں، جیسے: دونوں) اِن اعداد میں ہائے ملفوظ کے بجائے ہائے مخلوط آتی ہے، بول چال میں بھی اور تحریر میں بھی۔ اِنھیں مع ہائے مخلوط مُرجّح سمجھنا چاہیے اور اِسی طرح لکھنا بھی چاہیے یعنی: گیارھوں، بارھوں، تیرھوں، چودھوں، پندرھوں، سولھوں، سترھوں۔ اٹھارہ کی اعدادِ ترتیبی والی مستثنا حیثیت یہاں بھی برقرار رہے گی کہ اسے بغیر ہائے مخلوط ہی لکھا جائے گا۔[۲۲] اعدادِ اِستغراقی میں سے تین اعداد دسوں، بیسوں اور پچاسوں اعدادِ استغراقی بھی ہیں اور اعدادِ جمع غیر معین بھی تصوّر کیے جائیں گے جبکہ دسیوں اور بیسیوں صرف اعدادِ جمع غیر معین کے لیے مخصوص ہیں۔

دونوں، تینوں، چاروں، پانچوں، چھیوں، ساتوں، آٹھوں، نووں، دسوں، گیارھوں، بارھوں، تیرھوں، چودھوں، پندرھوں، سولھوں، سترھوں، اٹھاروں، اُنیسوں، بیسوں، اِکیسوں، بائیسوں، تیئیسوں، چوبیسوں، پچیسوں، چھبیسوں، ستائیسوں، اٹھائیسوں، انتیسوں، تیسوں، اِکتیسوں، بتیسوں، تینتیسوں، چونتیسوں، پینتیسوں، چھتیسوں، سینتیسوں، اڑتیسوں، اُنتالیسوں، چالیسوں، اِکتالیسوں، بیالیسوں، تینتالیسوں، چوالیسوں، پینتالیسوں، چھیالیسوں، سینتالیسوں، اڑتالیسوں، اُنچاسوں، پچاسوں، اکیاونوں، باونوں، ترپنوں، چوّنوں، پچپنوں، چھپنوں، ستاونوں، اٹھاونوں، اُنسٹھوں، ساٹھوں، اِکسٹھوں، باسٹھوں،

تریسٹھوں، چونسٹھوں، پینسٹھوں، چھیاسٹھوں، سرسٹھوں، اڑسٹھوں، اُنھتر وں، ستّروں، اکہتروں، بُہتّروں، تہتروں، چوہتروں، پچھتّروں، چھہتروں، ستتروں، اٹھتروں، اُناسیوں، اَسّیوں، اکیاسیوں، بیاسیوں، تراسیوں، چوراسیوں، پچاسیوں، چھیاسیوں، ستاسیوں، اٹھاسیوں، نواسیوں، نوّیوں، اکیانووں، بانووں، ترانووں، چورانووں، پچانووں، چھیانووں، ستانوں، اٹھانوں، ننانووں، سَو وں۔

اَعدادِکسری

کسری اعداد، معین تعداد بتاتے ہیں۔ کسر کا معنٰی ہے اِکائی یعنی عددِ واحد کا کوئی حِصّہ یا حِصّے۔ علم الحساب کی رُو سے اِکائی کا کوئی ایک جزیا حِصّہ عددِ کسری کہلاتا ہے۔ اُردو الفاظ میں یہ اعداد عام طور پر دس تک لکھے جاتے ہیں:

دوسرا (نصف) ۲/۱، تیسرا/ایک تہائی (ثُلث) ۳/۱، چوتھا/ایک چوتھائی (رُبع) ۴/۱،
پانچواں (خُمس) ۵/۱، چھٹا/چھیواں (سُدس) ۶/۱، ساتواں (سُبع) ۷/۱،
آٹھواں (ثُمن) ۸/۱، نواں (تُسع) ۹/۱، دسواں (عُشر) ۱۰/۱۔

ان کے علاوہ: پاؤ ۱/۴، پَون ۳/۴، پَونے ۳/۴، سوا ۱ ۱/۴، ڈیڑھ ۱ ۱/۲، اڑھائی ۲ ۱/۲، اور ساڑھے ۱ ۱/۲ بھی مستعمل ہیں۔

اَعدادِاضعافی/تضعیفی

تعدادِ معیّن کی پانچویں قسم تعدادِ اضعافی ہے جس میں کسی عدد کا ایک یا ایک سے زائد بار دہرانا پایا جاتا ہے۔ اَضعاف، ضِعف کی جمع ہے۔ ضِعف اُس حاصلِ جمع کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو خود اُسی میں جوڑنے سے پیدا ہو۔ گنا اور گُنی کے لاحقے کے ساتھ یہ وہ اعداد ہیں جن کی قدر میں درجہ بدرجہ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جیسے: ایک گُنا، دُگنا، دُونا، تگنا، چَوگنا، پنج گُنا، ایک گُنی، دُگنی، دونی، تِگنی، چوگُنی اور پنج گُنی وغیرہ۔ دُونا، دوگنا کی مخفف شکل ہے۔

اَضعاف کا ایک مختصر سلسلہ اور بھی ہے جو تہ دار چیزوں کی پرتوں کو بتاتا ہے جیسے اکہرا، دُہرا، تہرا، چوہرا اور پچوہرا وغیرہ۔ فارسی کے اضعاف بھی اُردو میں مستعمل ہیں جیسے: دو چند، سہ چند، چہار چند وغیرہ۔ اعداد کے بعد 'گونہ' کا اضافہ کر کے بھی اضعاف بنائے جاتے ہیں جیسے: دوگونہ، سہ گونہ، اور چند گونہ وغیرہ۔ اسی طرح 'گانہ' کے ساتھ بھی جیسے: دوگانہ، سہ گانہ، چہار گانہ وغیرہ۔ عربی کے اضعاف اُردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے مُوحَّد، مُثنٰی، مُثلّث، مُربّع، مُخمّس، مُسدّس، مُسبّع اور مُثمّن وغیرہ۔

اکائیاں اور اُن کی اصل

ایک: ایک سے اِکّا بنا جیسے اکاون، اِکا سے اکیا بنا جیسے اکیاسی اور اکیانوے۔ اکیا کے شروع کے الف کو حذف کر کے کاف کو گاف سے بدلا تو 'گیا' ہو گیا جیسے: گیارہ۔ 'یا' کی تخفیف کر کے ایک سے اِک بنایا گیا جیسے: اکیس، اکتیس، اکتالیس، اکسٹھ، اکہتر۔

دو: دو سے 'وے' بنا۔ واؤ کو باء سے بدل کر 'بے' بنا لیا گیا۔ گجراتی میں ہمیشہ دو کی جگہ یہی ''بے'' بولتے ہیں جیسے ایک، دو، تین، چار، کی جگہ گجراتی گنتی ایک، بے، ترن، چار ہے۔ اِسی ''بے'' کی مختلف شکلیں مثلاً 'با' اور 'بے' تمام مرکبات میں پائی جاتی ہیں جیسے: بائیس، بہتر وغیرہ۔

تین: تین کا کہیں 'ترے' ہو گیا جیسے تریسٹھ کہیں 'تر' جیسے ترپن، کہیں ترا جیسے ترانوے، کہیں تین کے نون کو غُنّہ بنا دیا جیسے تینتالیس، کہیں نون کو اڑا کر 'تے' چھوڑ دیا جیسے تیرہ۔ کہیں ی نون دونوں کو اڑا کر حرف ت باقی رکھا جیسے تہتر۔

چار: چار سے چو کر لیا گیا جیسے چودہ۔ کہیں چو میں نونِ غُنّہ کی آواز پاس کے عدد کی رعایت سے بڑھا دی جیسے چونتیس۔ کہیں آخری رے کو واپس لا کر چور کر لیا جیسے چوراسی، یہ اصل میں چور+ اَسّی ہے۔ چور کے آخر میں الف بڑھا کر چورانوے کر لیا گیا۔

پانچ: الف اور نونِ غُنّہ اُڑا کر 'پچ' بنایا گیا جیسے پچھتّر، کہیں 'چ' کو اڑا کر 'پن' کیا اور پھر بعض دوسرے عددوں کے ساتھ تک ملانے کے لیے 'پ' اور اور نون کے درمیان ایک 'ی' اور لگا کر 'پین' کر لیا جیسے: پینتالیس۔ کہیں 'پن' میں 'دال' کا اضافہ کر کے 'پند' کر لیا جیسے: پندرہ۔ پچاسی اور پچانوے بنانے کے لیے 'پچ' کے آگے 'الف' بڑھا دیا گیا۔

چھے: چھے سے 'چھو' بنا۔ چھ 'سین' سے بدلی تو سو ہو گیا جیسے سولہ۔ کہیں چھ کے ساتھ 'الف' لگا کر 'چھا' بنایا۔ چھ اور الف کے درمیان 'ی' شامل کر کے 'چھیا' بنا لیا جیسے چھیالیس۔

سات: سات سے 'ستا' بنایا جیسے ستائیس۔ کہیں 'ت' کو مخفف کر کے 'ست' بنایا جیسے سترہ۔ کہیں 'ت' کو 'ڑ' سے بدل کر 'سڑ' کیا جیسے سڑسٹھ۔ کہیں اس کا 'تک' ملانے کے لیے 'سَین' کر لیا جیسے سینتالیس۔

آٹھ: آٹھ سے اٹّھا کر کے اٹھائیس بنایا۔ 'اٹھا' سے 'اٹھ' کر کے 'اٹھہتر' بنا لیا۔ کہیں 'ٹھ' کو 'ڑ' سے بدل کر 'اڑتالیس' بنا لیا گیا۔

نو: نو کا عدد اپنے پورے لفظ کے ساتھ حرف نواسی اور ننانوے میں پایا جاتا ہے۔ [۲۳]

دہائیاں اور اُن کی اصل

دس: اس کی اصل 'دش' ہے۔ 'شین' کو 'سین' سے بدلا تو دس ہوئے۔ 'سین' کو 'ہے' سے بدلا تو 'دَہ' بنا جو 'چودہ' میں موجود ہے۔ 'دال' کو 'رے' سے بدلا تو 'رہ' ہو گیا۔ یہی گیارہ سے لے کر اٹھارہ تک تمام عددوں میں پایا جاتا ہے سوائے چودہ کے۔ سولہ میں 'رے' کو 'لام' سے بدلا گیا۔ پراکرت میں اِسے 'سورہ' ہی کہتے ہیں۔

بیس: پراکرت میں اس کی اصل 'ویسا' ہے۔ 'ویسا' کے 'الف' کو اڑا کر 'ویس' کیا۔ 'واؤ' کو ہمزہ سے بدلا تو 'ئیس' ہو گیا۔ اکیس سے لے کر اٹھائیس تک زیادہ تر عددوں میں اس کی یہی صورت پائی جاتی ہے۔ 'ویس' کے واؤ کو 'بے' سے بدلا تو 'بیس' ہوا۔ چوبیس اور چھبیس میں یہی شکل ہے۔

تیس: اصل میں 'تیسا' ہے۔ 'تیسا' کے 'الف' کو دور کیا تو 'تیس' رہا۔ تمام مرکبات میں اِسی طرح پایا جاتا ہے۔

چالیس: اس کی اصل 'چتالیس' ہے۔ 'چتالیس' کا کہیں 'تالیس' رہ جاتا ہے جیسے اڑتالیس، کہیں صرف 'الیس' جیسے بیالیس۔ اِسی سے 'تک' ملانے کے لیے چھیالیس میں 'الف' سے پہلے 'یے' کا اضافہ ہو گیا۔

پچاس: پراکرت میں اس کی اصل 'پنّاسا' ہے۔ آخری حِصّہ 'ناسا' اڑا دیا تو 'پن' ہوا جیسے پچپن۔ 'پن' کی 'پے' کو 'بے' بنا کر واؤ سے بدلا تو 'ون' ہو گیا جیسے: باون۔

پچاس کی دہائی کے اعداد میں پنجابی گنتی کے اصول اُردو سے بہتر ہیں مثلاً 'پنجا' یا 'پنجاہ' (پچاس) کے بعد اِک ونجا، بِونجا، ترونجا، چرونجا، پچونجا (پنجونجا)، چھونجا (چھپنجا)، ستونجا، اٹھونجا سب میں 'پنجا' کی صوتی نسبت موجود ہے۔ [۲۴]

ساٹھ: پراکرت میں اس کی اصل 'سٹھی' ہے۔ 'سٹھی' کی 'یے' اڑا دی تو مخفف ہو کر 'سٹھ' رہ گیا۔ اکسٹھ سے لے کر اڑسٹھ تک تمام مرکبات میں یہی پایا جاتا ہے۔

ستّر: اس کی اصل 'ہتری' ہے۔ 'ہتری' کی 'یے' اڑا دی تو 'ہتر' رہا۔ اکہتر سے لے کر اُٹھتّر تک سب میں یہی پایا جاتا ہے۔ ستتر میں 'ہے' بھی اڑ جاتی ہے۔

اَسّی: یہ اصل میں 'اَسّی اِی' ہے۔ 'اَسّی اِی' میں سے 'اِی' دور کر دیا تو 'اَسّی' رہ گیا۔ مرکبات میں اس کا 'الف' ہندی قواعدِ تعلیل کے مطابق ساکن ہو جاتا ہے۔ اِسی صورت میں اکیاسی سے لے کر

نواسی تک سب مرکبات میں پایا جاتا ہے۔ اکیاسی اور چھیاسی میں 'الف' سے پہلے 'ی' بیاسی کی 'ریس' میں آئی ہے۔

نوّے: پراکرت میں اس کی اصل نواۓ ہے۔ نواۓ کے بعض حروف کو، معلوم ہوتا ہے کہ اِدھر اُدھر رکھ کر 'انوے' کرلیا گیا ہے۔ یہی شکل اس کی سب مرکبوں میں اکانوے سے لے کر اٹھانوے تک پائی جاتی ہے۔ صرف ننانوے میں تھوڑا سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ یہ اصل میں 'نوانوے' تھا۔ 'واؤ' کو مشدد کر کے 'نون' سے بدل دیا گیا ہے۔[۲۵]

اکائی اور دہائی پر مشتمل مرکبوں کا یہ اصول ہے کہ اکائی دہائی پر اضافہ کرتی ہے مثلاً تیرہ کہ دس پر 'تین' بڑھائے گئے ہیں۔ پچیس بتاتا ہے کہ بیس پر 'پانچ' بڑھائے گئے ہیں۔ صرف سات مرکب عدد ایسے ہیں جو اس ترکیب سے نہیں بنتے۔ بیس، تیس، چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر، اَسّی سے نیچے کے عدد یعنی انیس، انتیس، انتالیس، انچاس، انسٹھ، اُنھتّر اور اناسی انوکھی ساخت رکھتے ہیں، یہ بجائے جمع کے تفریق کو ظاہر کرتے ہیں۔ 'اُن' کا سابقہ 'ایک کم' کا معنٰی دیتا ہے مثلاً: اُنیس کے معنٰی ہیں ایک کم بیس۔ علیٰ ہٰذا القیاس اُنتیس کے معنی ہیں ایک کم تیس، انتالیس کے معنی ہیں ایک کم چالیس وغیرہ۔ نواسی اور ننانوے کا اصول بدل جاتا ہے اور وہ کمی کی بجائے دہائی پر اضافہ ظاہر کرتے ہیں جیسے نواسی یعنی نو جمع اَسّی اور ننانوے یعنی نو جمع نوّے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ رشید حسن خان، گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا، مشمولہ: سہ ماہی اُردو، جلد ۶۱، شمارہ ۴-۵، (کراچی: انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، ۱۹۸۵ء)، ص ۹۷۔

۲۔ پروفیسر عبدالستار صدیقی، مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد اوّل، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۵

۳۔ خواجہ محمد عارف، گنتی اور ہندسہ، [غیر مطبوعہ مضمون، مخزونہ راقم الحروف] مضمون نگار...... شاعر، ادیب اور لسان شناس ہیں۔ انگلستان میں مقیم ہیں۔

۴۔ اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، جلد ۱۲، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۲۶-۱۲۷۔

۵۔ پروفیسر فدا علی خان، قواعدِ اُردو، (پٹنہ۔ انڈیا: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، دسمبر ۱۹۹۳ء)، ص ۱۳۳۔

۶۔ مولوی عبدالحق (بابائے اُردو)، اُردو صَرف و نحو، (نئی دہلی: انجمن ترقیِ اُردو ہند، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۵-۳۶۔

۷۔ جمال الدین حیدر، قواعدِ اُردو، (اِلٰہ آباد: اگروال پبلشرز، ۱۹۲۳ء)، ص ۷۸۔۷۹۔

۸۔ رشید حسن خاں، گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا، ص ۱۰۱۔

۹۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، دکنی زبان، مشمولہ: اُردوئے مُعلّیٰ، جلد سوم، شمارہ ۴-۵ (دہلی: دہلی یونیورسٹی، نومبر ۱۹۶۱ء)، ص ۹۸۔

۱۰۔ رشید حسن خان، اُردو کیسے لکھیں، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، ۱۹۷۵ء)، ص ۹۰۔

۱۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستانِ زبانِ اُردو، (دہلی: چمن بک ڈپو، ۱۹۶۱ء)، ص ۶۹۔

۱۲۔ مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد اوّل، ص ۲۴۔ نیز دیکھیے: مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد دوم، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۱۵ء)، ص ۱۵۰۔

۱۳۔ رشید حسن خان، گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا، ص ۹۷-۹۸۔

۱۴۔ رشید حسن خان، اُردو املا، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۴۵۔ نیز دیکھیے: اُردو کیسے لکھیں، ص ۹۱۔

۱۵۔ عصمت جاوید، نئی اُردو قواعد، (نئی دہلی: ترقیِ اُردو بیورو، ۱۹۸۱ء)، ص ۲۷۰۔

۱۶۔ رشید حسن خان، اُردو کیسے لکھیں، ص ۹۲۔

۱۷۔ محمد احسن خان (پ ۲۵/جون ۱۹۳۴ء) مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ علم و ادب سے بھرپور دلچسپی ہے۔ پاک و ہند کے بڑے اور نامور ادیبوں سے رابطے اور خط کتابت

رہی۔آپ نے وارث سرہندی کے ساتھ مل کر ’’علمی اُردو لغت‘‘ مرتب کی اور اس کا انتساب خان صاحب کے نام ہے۔ پیش لفظ ’’سخن ہائے گفتنی‘‘ میں وارث سرہندی نے خان صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ادب کے تعلّق سے اِن کے ذوق اور وسیع مطالعے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اُردو لسانیات سے از حد دلچسپی اور اس کے حاصلات، اِن کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ آج کل علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں مقیم ہیں۔ راقم کی ان سے ملاقاتیں ہیں اور فون پر رابطہ رہتا ہے۔

۱۸۔ ڈاکٹر اسلم انصاری (پ ۱۹۳۹ء) نامور شاعر، ادیب، محقق، مدرس اور نقّاد۔ اُردو، فارسی سرائیکی اور پنجابی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ملتان شہر سے تعلق ہے۔ راقم کی ان سے ملاقات ہے اور اکثر اوقات فون پر رابطہ رہتا ہے۔

۱۹۔ رشید حسن خاں، گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا، ص۔ ۹۸-۹۹

۲۰۔ ....ایضاً............، ص۔ ۱۰۷

۲۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، دکنی زبان، ص ۹۷

۲۲۔ رشید حسن خاں، گنتیوں کو لفظوں میں لکھنا، ص۔ ۱۰۰

۲۳۔ پروفیسر فدا علی خان، قواعدِ اُردو، ص ۱۳۳-۱۳۵

۲۴۔ خواجہ محمد عارف، گنتی اور ہندسہ۔

۲۵۔ پروفیسر فدا علی خان، قواعدِ اُردو، ص ۱۳۶-۱۳۷

''یت'' کا لاحقہ...... کس حد تک جائز؟
(ایک لسانی مطالعہ)

زبان، انسان کی سوچ اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ الفاظ ہماری آواز ہی نہیں ہمارے خیالات، جذبات اور احساسات کی روح بھی ہوتے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے دوسروں تک اپنے دل کی دھڑکنیں پہنچاتے ہیں۔ ہر زمانے میں فُصحا وبُلَغا اور شُعَرا واُدَبا کی ایک جماعت، معیاری اور غیر معیاری زبان میں فرق کرتی رہی ہے۔ فصیح و بلیغ اور شُستہ وشائستہ زبان کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔ اِس جماعت نے ہر دور میں، اپنی لسانی قابلیت اور ادبی صلاحیتوں کے ذریعے، اپنی اپنی زبانوں کا معیار بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ہمارے آج کے اُردو اساتذہ، شُعَراء، اہلِ نقد اور اُدَباء میں سے آٹے میں نمک کے برابر لوگ ہیں جو بے عیب زبان لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں۔ بات سچ اور کڑوی ہے مگر سچ بات یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مجلّات و رسائل اور اخبارات و کتب اٹھا کر دیکھ لیجیے لسانی اور صرفی ونحوی غلطیوں کا ایک انبار نظر آئے گا۔ کسی سیمی نار یا کسی کانفرنس کے شُرَکاء کے مقالے اور تقریریں سن لیجیے آپ میری بات کی تائید کریں گے۔ اگر انھیں کسی لفظ کے صحیح تلفظ اور درست استعمال سے آگاہ کیا جائے یا اُن کی اصلاح کی کوشش کی جائے تو وہ بحث مباحثے اور کٹ حجتی پر اتر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا مَوقِف ہے کہ قواعد کی پابندیاں اُردو زبان کی ترقی کے لیے سدِّ راہ ہیں۔ اُن کے خیال میں اُردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ یہ پابندیاں ہٹا دی جائیں اور ہر کسی کو اختیار ہو کہ وہ اُردو کی درگت بناتا رہے۔ اُن کے مطابق یہ اُردو کی توسیع کا عمل ہے چاہے یہ خود ساختہ اور نام نہاد توسیع اُردو زبان کا دامن تار تار کر دے۔ اگر اسلوب کے نام پر ہر کوئی اپنے وضع کردہ الفاظ اور تراکیب استعمال کرنے لگے اور اس عمل کو توسیع قرار دے تو غیر معیاری اُردو معرضِ وجود میں آ جائے گی جسے اُس کے لکھنے والے کے

سوا کوئی اور سمجھ نہیں پائے گا۔

....

الفاظ جو معنوی تنوع اور لطافت کا خزانہ ہوتے ہیں، نباتات و حیوانات کی طرح ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں اور گروہِ خاندانی بناتے ہیں۔ لسانی انجذاب کا عمل جاری رہتا ہے اور مختلف بولیوں اور تہذیبوں کے امتزاج سے الفاظ بنتے رہتے ہیں۔ اُردو میں اسم صفت، اسمِ کیفیت اور مصدر بنانے کے قاعدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسم کے آخر میں ''یت'' کا لاحِقہ لگا دیا جائے۔ ''یت'' کے لاحقے کی بنیاد عربی زبان ہے۔ اس قاعدے کے تحت وضع کیے گئے اسماء اُردو، فارسی اور خود عربی زبان میں مستعمل ہیں جیسے جاہل سے جاہلیت، قابل سے قابلیت، آمر سے آمریت، خاص سے خاصیت، صالح سے صالحیت، صارف سے صارفیت، سالم سے سالمیت، خالص سے خالصیت، حاکم سے حاکمیت، جاذب سے جاذبیت...... مصروف سے مصروفیت، مقبول سے مقبولیت، معقول سے معقولیت، محکوم سے محکومیت...... اور صلاح سے صلاحیت، قوم سے قومیت وغیرہ۔ اسی طرح مقامی لفظوں، شہروں اور جگہوں کے ساتھ ''یت'' کے لاحِقے کا تصرف کیا جانے لگا۔ ان میں سے جن الفاظ کی تشکیل کسی قرینے اور ڈھب کے مطابق ہوئی وہ روزمرہ کا حِصہ بن گئے، جو کسی قاعدے اور کلیے پر پورے نہ اترے اہلِ ادب کے ہاں انھیں پذیرائی نہ مل سکی۔ اِسی نہج پر لوگوں نے ہندی، فارسی، انگریزی اور دیگر غیر عربی الفاظ کو بزعم خویش عربی لبادہ پہنا کر اُردو میں مروّج کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ذرا سا غور اور تامّل کرنے پر اِن کی غلط نہادی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ تراشیدہ اسماء فی الحقیقت، اپنی کوئی اصل اور بنیاد نہیں رکھتے۔ لسانی قواعد کے خلاف بنائے گئے اِن نادِر شگوفوں کو ذوقِ سلیم بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بعض 'توسیع پسند' ادیب اس عمل کو خلاّقانہ تصرّف میں شمار کرتے ہیں لیکن خوش ذوق اہلِ قلم کے مطابق یہ محض لفظی بازی گری ہے۔

یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ ''اَلف'' سے شروع ہونے والے اسموں کے ساتھ 'یت' کا لاحقہ کسی طور پر نہیں آتا۔ اسم کے پہلے حرف ''اَلف'' کے نیچے زیر آئے گی۔ اس لحاظ سے اِتفاق، اِثبات، اِجتہاد، اِحتیاط، اِحساس، اِختصاص، اِختصار، اِدراک، اِدّعاء، اِرتقاء، اِستدلال، اِستشراق، اِسرار، اِسلام، اِطلاق، اِظہار، اِکتشاف، اِمتناع، اِمتیاز، اِنتہاء، اِنحطاط، اِنکسار اور اِنکشاف وغیرہ 'یت' کی پخ کو قبول نہیں کرتے۔ شُعرا کا کلام اور نثری ادبِ عالیہ اس قاعدے کی سند ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اِتفاقیت، اِثباتیت، اِجتہادیت، اِحتیاطیت، اِحساسیت، اِختصاریت، اِختصاصیت، اِدراکیت، اِدّعائیت، اِرتقائیت، اِستدلالیت، اِستشراقیت، اِسراریت، اِسلامیت، اِطلاقیت، اِظہاریت، اِکتشافیت،

اِمتناعیت، اِمتیازیت، اِنتہائیت، اِنحطاطیت، اِنکساریت اور اِنکشافیت وغیرہ بالکل غلط ہیں۔

ایسے اسماء، جن سے اسمِ کیفیت اور اسمِ صفت وغیرہ بنانا مقصود ہو اُن کے آخر میں 'یت' کے بجائے صرف 'ی' کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے بادشاہ سے بادشاہی، باغبان سے باغبانی، بیباک سے بیباکی[۱]، بیزار سے بیزاری، بیگانہ سے بیگانگی، بین المتون سے بین المتونی، پُراَسرار سے پُراسراری، پُرشکم سے پُرشکمی، پریشان سے پریشانی، پسپا سے پسپائی، پہلودار سے پہلوداری، تبدیل سے تبدیلی، تجربہ سے تجربی، تہہ دار سے تہہ داری، جہانگیر سے جہانگیری، لاجہت سے لاجہتی، حضور سے حضوری، حکم ران سے حکم رانی، نیم حکیم سے نیم حکیمی، حیران سے حیرانی، خوشگوار سے خوشگواری، خوفناک سے خوفناکی، دستاویز سے دستاویزی، ڈراما سے ڈرامائی، زرخیز سے زرخیزی، سادہ سے سادگی، سفاک سے سفاکی، سنگین سے سنگینی، شہنشاہ سے شہنشاہی، سوگوار سے سوگواری، عاجز سے عاجزی (بمعنی عجز)، عالمگیر سے عالمگیری، عریاں سے عریانی، قربان سے قربانی، لادین سے لادینی، [۲]ماوراسے ماورائی، مایوس سے مایوسی، معذور سے معذوری، معروض سے معروضی، معیار سے معیاری، مغرور سے مغروری (بمعنٰی غرور)، ملفوف سے ملفوفی، موزوں سے موزونی (جیسے موزونیِ طبع)، ناگزیر سے ناگزیری، ناگوار سے ناگواری، نصب العین سے نصب العینی، ہمہ گیر سے ہمہ گیری، یکتا سے یکتائی، یک جہت سے یک جہتی، یک رنگ سے یک رنگی، یکساں سے یکسانی[۳] اور ریگانہ سے یگانگی وغیرہ۔

اس قاعدے کی رُو سے بادشاہیت، باغبانیت، بیباکیت، بیزاریت، بیگانگیت، بین المتونیت، پُراسراریت، پُرشکمیت، پسپائیت، پہلوداریت، تبدیلیت، تجربیّت تہہ داریت، جہانگیریت، لاجہتیت، حضوریت، حکمرانیت، نیم حکیمیت، حیرانیت، خوشگواریت، خوفناکیت، دستاویزیت، ڈرامائیت، زرخیزیت، سادگیت، سفاکیت، سنگینیت، سوگواریت، شہنشاہیت، عاجزیت، عالمگیریت، عریانیت، قربانیت، لادینیت، ماورائیت، مایوسیّت، معذوریت، معروضیت، معیاریت، مغروریت، ملفوفیت، موزونیت، ناگزیریت، ناگواریت، نصب العینیت، ہمہ گیریت، یکتائیت، یک جہتیت، یک رنگیت، یکسانیت، یگانگت وغیرہ اختراعات غلط قرار پاتی ہیں۔

کچھ اسماء، جو ازخود اسمِ صفت، اسمِ کیفیت اور اپنے معنٰی میں خود کفیل ہیں وہ ''یت'' کے لاحقے کے محتاج نہیں ہیں لیکن بدقسمتی سے اُن کے ساتھ 'یت' کی پخ لگا کر انھیں لفظی اور معنوی طور پر غلط کر دیا جاتا ہے جیسے: اثر، ادق، اکمل، اُنس، تاثیر، تجسیم (خدا کے مجسم ہونے کا عقیدہ)، تجویز، تخصیص، تعین، تفہیم، تکبر، تکفیر، تکمیل، تمثیل، توجہ، توجیہ، پسند، جلال، جمال، جنون، جواز، حصول، دوام، راز، رمز،

عرف، عرفان، غِناء، فتور، فِرار، فضول، فعل، قانون، قبول (مثلاً قبولِ عام)، کردار، کمال، مِثل، متعین، منطق، ہراس (بمعنٰی خوف اور ڈر......اسی سے ہراساں ہے یعنی خوف زدہ)، یاس اور یقین وغیرہ درست اسماء ہیں لیکن ان کے ساتھ 'یت' کا لاحقہ لگا کر اثریت، ادقیت، اکملیت، اُنسیت، تاثیریت، تجسیمیت، تجویزیت، تخصیصیت، تعیینیت، تفہیمیت، تکبریت، تکفیریت، تکمیلیت، تمثیلیّت، توحُّہیّت، توجیہیت، پسندیت، جلالیت، جمالیت، جنونیت، جوازیت، حصولیت، دوامیت، رازیت، رمزیت، عرفیت، عرفانیت، غنائیت، فتوریت، فِراریت، فضولیت، فعلیت، قانونیت، قبولیت، کرداریت، کمالیت، متعینیت، مثلّیت، منطقیت، ہراسیت، یاسیت اور یقینیت وغیرہ بنانے کا عمل راقم کے نزدیک مکروہِ تحریمی کا درجہ رکھتا ہے۔

صفتِ فاعلی ومفعولی اور 'یت' کے لاحقے کے امتزاج سے وضع کیے گئے کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو لسان شناسوں کی نگاہ میں غلط اور غیر ضروری ہیں جیسے ماخوذیت، ماخوذ (بمعنٰی لیا گیا، حاصل کیا گیا) سے وضع کیا جانے والا لفظ 'ماخوذیت' کا اُردو میں استعمال درست نہیں بلکہ محض تکلف ہے۔ مُتَناہیّت (انتہا کے معنٰی میں)، مثبتیت (اِثبات کے معنٰی میں)، مجذوبیت (دیوانگی کے معنٰی میں)، مجنونیت (جنون کے معنٰی میں)، محتاجیت (احتیاج کے معنٰی میں)، محدودیت (تحدید کے معنٰی میں)، محفوظیت (حفاظت کے معنٰی میں)، مخلوقیت (مخلوق کے معنٰی میں)، مرعوبیت (رعب کے معنٰی میں)، مشکوریت (شکرگزاری کے معنٰی میں)، مصنوعیت (تصنّع کے معنٰی میں)، معتبریت (اعتبار کے معنٰی میں)، معتزلیت (اِعتزال۔فرقہ معتزلہ کے نظریہ کے معنٰی میں)، معلومیّت (علم کے معنٰی میں)، مُلائمیت (مُلائمت کے معنٰی میں)، ممنونیت (اِمتنان کے معنٰی میں)، منحوسیت (نحوست کے معنٰی میں)، منفیت (نفی کے معنٰی میں)، مایوسیت (یاس کے معنٰی میں) موجودیت (وجود کے معنٰی میں) وغیرہ۔

....

آج کل اخبارات ورسائل اور ٹیلی وژن چینلز پر ''یت'' کے لاحقے پر مبنی ایسے ایسے الفاظ اور تراکیب پڑھنے اور سننے کو ملتی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ ایک تو معنوی اور لفظی اعتبار سے ترکیب غلط ہوتی ہے، دوسرا لکھنے میں لفظی اور بولنے میں تلفظ کی غلطی کر کے اُسے مزید 'مُجلّا' کر دیا جاتا ہے۔ ہماری قوم کا مزاج اور رویہ کچھ اس طرح کا ہو چکا ہے کہ لکھنے یا بولنے والا کوئی غلط لفظ استعمال کرے تو اس کی غلطی کی پیروی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی، وہ اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں راہ پا گئی۔ ایسی غلطیاں جن سے ہمیں آئے روز سابقہ پڑتا ہے اُن کی کچھ مثالیں جملوں اور نیم جملوں کی صورت میں پیش کی جاتی ہیں:

مُلک پر دراصل 'اشرافیت' کا قبضہ ہے

انگریزی اصطلاح ارسٹوکریسی (Aristocaracy) کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے اُردو میں آج کل اَشرافیّت کی ترکیب استعمال کی جارہی ہے۔اس مفہوم کے لیے پہلے سے موجود لفظ ''اَشرافیہ'' بھی سیاسیات (Political Science) کی اہم اصطلاح ہے بلکہ ایک نظامِ حکومت کے طور پر ماضی میں رائج رہا ہے، اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔'اشرافیہ' کے متوازی نئی اصطلاح 'اشرافیت' کو رائج کرنا غیر ضروری ہے۔راقم کے مطابق ''اشرافیہ'' کی اصطلاح بھی محلِّ نظر ہے۔ہمارے ہاں یہ رویہ عام ہو چلا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے، کسی لفظ پر من گھڑت مفہوم تھوپ دیا جاتا ہے۔ارسٹوکریسی کے مفہوم کے لیے 'اشرافیہ' استعمال کیا جائے تو خود اس لفظ کی تخفیف ہوتی ہے۔یہ اصطلاح اختراع کرنا، میرے نزدیک درست فیصلہ نہیں تھا۔قدیم یونان میں نسب اور دولت کی بنیاد پر اقتدار پر قبضہ رکھنے والے ارسٹوکریٹ تھے۔اصطلاح میں، حکومتوں کے قیام و استحکام یا خاص کارنامے انجام دینے اور ان کی بنا پر خاص مراعات و اختیارات پانے والے ارسٹوکریٹ کہلاتے ہیں۔اُردو میں شرف، اشراف، شرفاء، شرافت، شریف اور تشریف کے الفاظ مستعمل ہیں۔سہ حرفی مادہ 'ش ر ف' سے مشتق مذکورہ الفاظ شرافت، نجابت اور عزت و احترام کے معنی سے وابستہ ہیں۔[۴] ارسٹوکریسی کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے جس کسی نے 'اشرافیہ' کا لفظ وضع کیا ہے وہ نہ تو لسانیات سے واقف تھا اور نہ تاریخ کا علم رکھتا تھا۔اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ ارسٹوکریٹ کا طبقہ کیسے وجود میں آتا ہے اور اس کے کیا خواص ہیں۔موجودہ حالات کے تناظر میں ارسٹوکریٹ کے طبقے کو اشرافیہ کے بجائے ''ارذالیہ'' کہا جائے تو زیادہ مناسب حال ہوگا۔

اس نے حکمِ اِمتناعیّت جاری کروالیا

ایک زمانہ تھا کہ فیصلہ ہونے تک، کسی کام کو رُکوانے کے لیے، لوگ عدالت سے حکمِ اِمتناع جاری کرواتے تھے۔اِمتناع کا معنٰی ہے روکنا، منع کرنا۔بھلے وقتوں میں، عدالتی کارروائی میں، حکمِ امتناع کی اصطلاح ہی چلتی رہی۔عدالتی زبان اور اخبارات میں حکم اِمتناع ہی نظر آتا اور سنائی دیتا۔زمانہ بدلا، زبان پر بھی بگاڑ کے اثرات مرتب ہوئے تو حکمِ امتناع سے حکمِ امتناعی ہو گیا جیسے تقرّر (Appointment) سے تقرّری اور تنزّل (Demotion/Decline) سے تنزّلی۔اب خیر سے اس ترکیب کو حکمِ اِمتناعیّت کا درجہ مل گیا ہے۔

عقیدۂ خاتمیّتِ نبوّت

ختمِ نبوت کے عقیدے کے تحفّظ اور پاسداری کے لیے ہماری جان بھی حاضر ہے، مگر یہ

عقیدۂ خاتمیّتِ نبوت کیا ہے جو علماء کی تقریروں میں اور سوشل میڈیا پر سنا اور دیکھا جا رہا ہے؟ ''ختمِ نبوّت'' کے متوازی 'خاتمیّتِ نبوت' نام کی کوئی اصطلاح نہیں ہے سوائے لفظی بگاڑ کے۔

موسمِ گرما کی ختمیّت کے بعد میں کراچی جاؤں گا

''ختمیت'' بھی کوئی لفظ یا اصطلاح نہیں ہے۔ درست جملہ اس طرح ہوگا، ''موسمِ گرما کے اختتام کے بعد میں کراچی جاؤں گا'' یا ''......موسمِ گرما ختم ہونے کے بعد......۔''

اُس کے سر سے والد کا سایۂ عاطفیت اُٹھ گیا

سایۂ عاطفیت کے بجائے سایۂ عاطفت ہی درست ہے۔

اُس کے چہرے سے جلالیّت ٹپکتی ہے

جلالیّت کا تصرّف محض تکلّف ہے۔ درست جملہ اس طرح ہوگا: ''اس کے چہرے سے جلال جھلکتا ہے۔''

وہ اس فن میں کمالیّت تک پہنچ گیا

جملہ اس طرح درست ہوگا: ''اُس نے اس فن میں کمال حاصل کرلیا'' یا ''......، کمال تک پہنچ گیا۔''

اس میں جمالیت پسندی بہت ہے

صحیح جملہ اس طرح ہوگا، ''وہ بہت جمال پسند ہے۔''

اس نظریے کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی

صحیح جملہ اس طرح ہوگا، ''اس نظریے کو قبولِ عام حاصل ہوا۔''

اس نے تحقیقیت کا حق ادا کر دیا

صحیح جملہ اس طرح ہوگا، ''اس نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔''

تخلیقیت تنقید سے بالا ہے

صحیح جملہ اس طرح ہوگا، ''تخلیق، تنقید سے بالا ہے۔''

جبریّت کا دور ضرور ختم ہوگا

''جبریت'' کوئی لفظ یا اصطلاح نہیں ہے، درست جملہ اس طرح ہوگا، ''جبر کا دور ضرور ختم ہوگا۔''

ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس کھنڈر نما عمارت کی قدیمیت ثابت کی

'قدیمیت' کوئی لفظ نہیں ہے۔ درست جملہ اس طرح ہوگا، ''ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اس کھنڈر

نما عمارت کی قدامت ثابت کی۔''

علامہ اقبال کی اَفکاریّت دنیا میں تبدیلی کا باعث بنی

یہاں 'اَفکاریت' کے بجائے 'فکر' ہونی چاہیے۔ 'فکریت' اور اس کی جمع 'فکریات' بھی محلِ نظر ہیں۔

انحطاط پذیریت

اس کے بجائے 'انحطاط پذیری' درست ہے۔ 'انحطاطیت' کی طرح 'پذیریت' بھی غلط ہے۔

اُس کی جوہریت نکھر کر سامنے آ گئی

''اُس کا جوہر (بمعنی صلاحیت، لیاقت) نکھر کر سامنے آ گیا۔'' 'جوہریت' کی طرح 'جواہریت' بھی غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خالقیت پر شک کرنا کفر ہے

درست جملہ اس طرح ہوگا، ''اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے پر شک کرنا کفر ہے۔''

اس نے دشمنائیت کی انتہا کر دی

''اس نے دشمنی کی انتہا کر دی۔'' صحافتی دنیا میں ایک اور لفظ رائج ہے اور وہ ہے دشمنائزیشن جیسے: ''وہ دشمنائزیشن میں بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔''

اجمل نے بائیکاٹیت ختم کر دی

درست جملہ اس طرح ہوگا: ''اجمل نے بائیکاٹ ختم کر دیا۔'' اِسی طرح یہ جملہ بھی غلط ہے: ''میں اس کے بائیکاٹانہ رویّے سے تنگ آ گیا ہوں۔''

اُس نے ہٹلر کی ڈکٹیٹریت یاد دلا دی

ڈکٹیٹریت کی طرح ''ڈکٹیٹرانہ فیصلہ'' بھی غلط ہے۔ 'آمریت' اور 'آمرانہ فیصلہ' ہونا چاہیے۔

ذہنیتِ رسا

'ذہنیت' (بمعنی طبیعت کا رجحان) اُردو میں مستعمل ہے لیکن اس کے ساتھ 'رسا' نہیں آ سکتا، 'ذہنِ رسا' ہی درست ہوگا۔

اس نے اس کٹھن کام میں بہت ریاضیّت کی

'ریاضیت' کی جگہ 'ریاضت' (بمعنی محنت ومشقت) درست ہے۔

سہولیت

'سہولت' کے ہوتے ہوئے 'سہولیت' کی کوئی گنجائش نہیں، یہ محض تکلف ہوگا۔

طمانیت

درست لفظ طمانینت ہے طمانیت نہیں، لیکن یہ اُردو میں مستعمل نہیں ہے۔ اس کے متبادل 'اِطمینان' واضح اور سہل ہے۔

انجانیت

''فیروز انجانیت'' سے بولا۔ انجانیت سرے سے اُردو میں کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ صحیح جملہ اِس طرح ہوگا ''فیروز انجان بن کر بولا۔''

عِلّیّت

'عِلّت' کثیر الجہت لفظ ہے جس سے تصرّف کر کے 'عِلّیّت' بنانا غلط ہے۔

فراریت

''وہ اپنے فرائض سے ہمیشہ فراریت اختیار کرتا ہے۔'' فِرار کے ساتھ 'یت' کا تصرّف محض تکلف ہے۔ یاد رہے ِفرار کی فِ کے نیچے زیر ہے، زبر کے ساتھ پڑھنے سے 'رے' مشدد محسوس ہوگی۔

کُفریت

''یہ فعل کفریت کی حد میں داخل ہو جاتا ہے۔'' یہاں ''کفر کی حد میں'' ہی صحیح ہوگا۔

کراہیّت

''میں فلاں کام سے کراہیّت محسوس کرتا ہوں۔'' کراہیّت بالکل غلط ہے، یہاں 'کراہت' درست ہے۔

اجتماعیت

اس کے لیے اجتماع اور اسمِ کیفیت اجتماعی ہی مکتفی ہیں۔

نتائجیت

نتیجہ خیزی کے معنیٰ کے لیے یہ لفظ گھڑا گیا۔ اس کے بجائے نتیجہ خیزی ہی درست ہے۔

فرقہ واریت

فرقہ واریت کے بجائے فرقہ واری ہی درست ہے۔ اس کی سند درج ذیل ہے:

''یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ واری جو دوسری قوموں سے نفرت اور بدخواہی کی تعلیم دے اُس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔''[۵]

....

اُردو زبان و ادب کے کچھ ادیبوں نے اپنی تحریروں اور کتابوں میں ''یت'' کی اس بدعت کو فروغ دیا ہے جو محض تکلف کا شاخسانہ ہے۔ مشاہیر ادبا کے رشحاتِ قلم، بلاشبہ مشعلِ راہ کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اُن میں پائی جانے والی فروگذاشتوں کی نشاندہی کرنا سراسر علمی رویہ ہے۔ کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

- عربی اور اُردو کے معروف عالم نذیر حسین اپنے مقالے ''الشاّبی ابوالقاسم'' میں الشاّبی کی ایک نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس نظم میں رومانیت اور کلاسیکیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔''[۶]

رومانیت، تخیلی اور ماورائے حقیقت تصورات و واقعات کا مظہر یہ لفظ اصلاً انگریزی زبان کے لفظ Romance کی متغیر صورت ہے۔ رومانس سے فارسی زبان میں رومان بنایا گیا، بعد میں اس 'رومان' پر 'یت' کا اضافہ کر کے اسے عربی لبادے میں پیش کیا گیا۔ مصدر کے طور پر تراشیدہ یہ عربی نما لفظ 'رومانیت' جو کہیں کہیں 'رومانویت' کی صورت میں بھی نظر آتا ہے، فی الحقیقت عربی زبان میں اپنی کوئی اصل و بنیاد نہیں رکھتا۔ رہی 'کلاسیکیت' تو مصدری صورت میں نظر آنے والا عربی نما یہ لفظ بھی انگریزی زبان کے لفظ (Classic) 'کلاسک' پر 'یت' کا اضافہ کر کے بنایا گیا ہے۔ بعض اہلِ قلم اسے ادبیاتِ عالیہ اور قدیم ٹیکسالی معیار و سند کے حوالے اور استعارے پر استعمال کرتے ہیں۔

- سیّد احتشام حسین، جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جوشؔ کی زندگی اور اطوار میں کلاسیکیت اور رومانیت معین راستوں اور نئی جستجوؤں، قدامت اور جدّت کی ایسی آمیزش ہے کہ وہ بعض اوقات مجموعۂ اضداد نظر آنے لگتے ہیں۔''[۷]

- ڈاکٹر انور سدید ادبی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب اور زندگی میں بنیادی تحریکیں صرف دو ہیں، رومانویت کی تحریک، دوم کلاسیکیت کی تحریک، ......رومانویت، معاشرتی سطح پر ایک بڑی جنگ کا منظر پیش

کرتی ہے۔ کلاسکیت، نظم وضبط بحال کرتی اور طویل پُرامن اور پُرنشاط دور کی نقیب ہوتی ہے۔ ان سب کے امتزاج سے جدیدیت کی تحریک پیدا ہوئی جس نے رسوم و رواجات کی کلاسیکی سنگلاخیت کو توڑنے کے لیے اجتہاد اور تخلیقی اُپج سے کام لیا۔ جب ان شُعراء نے اپنے ہیرو کی عظمت کے ترانے گائے تو اُنھیں اس ہیرو میں اپنی ذات کا عکس بھی دکھائی دینے لگا، جس سے خود شناسی اور خود تعریفی کا جذبہ پیدا ہوا اور بعض شُعراء نرگسیت کا شکار نظر آنے لگے۔''[۸]

سنگلاخ (فارسی) + یت (عربی) اور نرگس (فارسی) + یت (عربی) از روئے قواعد ترکیب نہیں پا سکتے۔

- مدیرِ مجلّہ 'نگار' نیاز فتح پوری، ''مذاکراتِ نیاز'' میں رقاصہ کے کمالِ فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہی آنکھوں کو خیرہ کر کے جلد میں آب و تاب کے انعکاس سے خاص قسم کی مینائیت پیدا کر دینے والا بادلہ جو عام طور پر نظر آتا ہے، یہاں بھی تھا۔ اس کا پندار کمال تھا، اس کا وقار نسائیت اور ان سب سے زیادہ اس کے خدوخال کی ایک خاص کیفیت تھی۔''[۹]

اس اقتباس میں 'مینائیت' اور 'نسائیت' کی تراکیب پر غور کیجیے۔ 'مینا' فارسی زبان میں شراب کی بوتل یا صراحی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ اسے عربی مصدر سازی کے طریق پر 'یت' کا لاحِقہ لگا کر 'مینائیت' بنانا غلط ہے۔ اسی طرح 'نساء' کے ساتھ 'یت' لگا کر مصدر بنانا بھی طرفہ لطیفہ ہے۔

- ڈاکٹر یوسف حسین خان ''یادوں کی دنیا'' میں لکھتے ہیں:

۱۔ ''سب سے زیادہ چوٹ شفیق صاحب کی گاندھیت پرستی پر ہوتی۔''

۲۔ ''اس سلسلے میں فرانسیسیوں نے وسعتِ نظر اور عالمگیریت کا ثبوت دیا ہے۔''

۳۔ ''اس نراجیت کا ردّعمل موجودہ زمانے میں دی گال کی آمرانہ حکومت ہے جو جمہوریت کی آڑ میں شاہی کر رہا ہے۔''[۱۰]

اقتباسِ اوّل میں 'گاندھیت' گاندھی + یت (ہندی + عربی) خلافِ قاعدہ ترکیب ہے۔ اقتباسِ دوم میں 'عالمگیریت' عالمگیر (فارسی) + یت (عربی) بھی غلط ترکیب ہے، 'عالمگیری' کافی ہے۔ اقتباسِ سوم میں 'نراجیت' ن + راج (ہندی) + یت (عربی) بھی مہمل ترکیب ہے۔

○ ڈاکٹر عفت آرا شمسی ''خلیل الرحمٰن کی نثر نگاری'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

۱۔ ''غم کو برداشت کرنے کی صلاحیت، جس نے خواجہ میر درد کے اشعار میں بے پناہ نشتریت پیدا کردی۔''

۲۔ ''انھوں نے اپنی شخصیت کے تمام عناصر میں ایک زلزلیت پیدا کردی۔''

۳۔ ''ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تصوّر پرستی اور مقررہ نصب العینیت کے دائرہ کو زندگی نے کس بے دردی سے توڑ دیا ہے۔''[۱۱]

اقتباسِ اوّل میں نشتر (فارسی) + یت (عربی) غلط ترکیب ہے۔ اقتباسِ دوم میں 'زلزلیت' محض تکلف کا شاہکار ہے، 'تزلزل' اِنھیں معنوں میں نسبتاً درست اور سادہ ہے۔ اقتباسِ سوم میں 'نصب العینیت' بھی محض تکلف کا شاخسانہ ہے، نصب العینی لکھ دینا کافی تھا۔

○ پروفیسر نذیر احمد ''سیّد مسعود حسن رضوی ادیب'' نامی کتاب میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے انیسؔ کے مختلف مرثیوں میں بکھرے ہوئے واقعات کو ایک لڑی میں پرونے اور ایک سلسلے کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی تاکہ انیسؔ کے شاعرانہ کمال کی ڈرامائیت واضح ہو سکے۔''[۱۲]

لفظ 'ڈرامائیت'......ڈراما (انگریزی) + یت (عربی) کی ترکیبی غلطی بھی ازخود واضح ہے۔

○ فراق گورکھپوری، اپنی اور مجنوں گورکھپوری کی بعض خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے یہاں جس عنصر کو اوّلیت حاصل ہے مجنوں کے یہاں وہ عنصر ایک امکان کی صورت میں یا نیم خوابیدہ عالم میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اس لیے اسے اُن کے یہاں دوئمیت کی حیثیت حاصل رہی ہے اور عقلیت جسے میرے یہاں دوئمیت حاصل ہے، مجنوں کے یہاں اوّلیت کا مرتبہ رکھتی ہے۔ بہرحال عقلیت و وجدانیت ہم دونوں میں ایک قدرِ مشترک کی طرح کارفرما رہی ہیں۔''[۱۳]

'دوئمیت' اور 'وجدانیت' سراسر غلط ہیں۔ اس مقام پر دوئمیت کی جگہ 'ثانوی' اور وجدانیت کی جگہ 'وجدان' لکھنا چاہیے تھا جو درست اور خوب لفظ ہیں۔

○ فکر تونسوی، کنہیا لال کپور کے متعلق لکھتے ہیں:

''وہ شہروں میں رہتا ہے مگر دیہاتی خدوخال رکھتا ہے۔ اگر وہ کسی گاؤں کے جاگیردار کا بیٹا ہوتا تو ضلع کا مجسٹریٹ بن کر اپنی دیہاتیت کو چھپا لیتا مگر وہ تو ایک

غریب پٹواری کا بیٹا ہے۔''[۱۴]

دیہہ+ات=دیہات(فارسی)+یت(عربی) یہ ترکیب غلط اور ناموزوں ہے۔

- ضیاءالحسن علوی، یو۔پی میں انسپکٹر مدارس رہے، مولانا حالیؔ کا ذکر کرتے ہوئے ''یادِ ایام'' میں لکھتے ہیں:

''رگِ لکھنویت جوش میں آ گئی۔ جھٹ میں نے اُردوئے معلّٰی میں ایک مضمون لکھ مارا اور اپنے خیال میں حالیؔ کی اچھی گرفت کی۔''[۱۵]

لکھنوی+یت، یہ ترکیب بھی درست نہیں۔ پھر اس پر ''رگ'' کی اضافت مستزاد ہے۔ 'رگِ لکھنویت' کی جگہ 'لکھنوی مزاج' لکھنا بہتر تھا مگر مصنف نے شاید 'رگِ ظرافت' اور 'رگِ شاعری' وغیرہ کے پیشِ نظر 'رگِ لکھنویت' اختیار کرلیا۔

- داؤد طاہر کے سفرنامے ''شوق ہم سفر میرا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جمیل ملک لکھتے ہیں:

''اس سفرنامے کی بنیادی خوبی اس کا تنوع اور اس کی پہلو داریت اور جزئیات نگاری ہے۔''[۱۶]

یہاں 'پہلوداریت' کی جگہ 'پہلوداری' لکھنا بہتر اور درست ہوتا۔

- ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ''میر تقی میر......حیات اور شاعری'' میں رقمطراز ہیں:

''میر بخشی نے ۱۷۵۰ء سے ۱۷۵۱ء تک تمام وقت اس کوشش میں صرف کیا کہ راجپوتوں سے خراج وصول کر سکے اور دہلی کی شہنشاہیت منوا سکے۔''[۱۷]

یہاں بھی 'شہنشاہیت' کی جگہ 'شہنشاہی' لکھنا درست اور بہتر ہوتا۔

- کلکتہ (انڈیا) سے تعلق رکھنے والے ادیب اور ماہ نامہ ''اِنشا'' کے مدیر ف۔س۔اعجاز کے ایک مضمون کا عنوان ہے ''سنسنی خیزیت اور احمد سعید ملیح آبادی۔''[۱۸] ترکیب میں 'خیزیت' محلِّ نظر ہے۔ 'سنسنی' کا معنٰی ہے وہ آواز جو مٹی کے کورے برتن میں پہلی دفعہ پانی ڈالنے سے پیدا ہو۔ اس کے علاوہ کانوں میں گونجنے والی سائیں سائیں کی آواز۔ اُردو میں عام طور پر اس سے اضطراب، ہیجان، بےچینی اور خوف مراد لیا جاتا ہے۔ سنسنی کے ساتھ خیز کا لاحقہ لگائیں تو یہ اسم فاعل بن جاتا ہے یعنی سنسنی خیز۔ آخر میں 'ی' لگا کر 'سنسنی خیزی' کیا جائے تو یہ مصدر کا معنٰی دیتا ہے۔ مضمون نگار 'سنسنی خیزیت' کو چھوڑ کر اگر 'سنسنی خیزی' لکھتے تو ''یت'' کی بےمعنٰی پخ کے عیب سے بچ جاتے۔

- فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری کی نثر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اندازاً دس بارہ سو صفحات کی نثر جو مجنوں نے ہمیں دی ہے، وہ اپنی حساس

منطقیت اور زندہ عقلیت کے لحاظ سے اُردو زبان میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔'' [۱۹]

اس اقتباس میں 'منطقیت' لکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے، 'منطق' ہی سے بات پوری ہو جاتی ہے۔ فارسی لفظ 'اندازہ' کو تنوین کے ذریعے 'اندازاً' کر دینا نہایت درجہ کی بے خبری ہے کیونکہ تنوین کا قاعدہ صرف عربی کا ہے اور عربی کے اسم پر ہی آ سکتی ہے۔

- سندھ یونی ورسٹی جامشورو کی پروفیسر، ڈاکٹر مرحب قاسمی، افسانوں کے ایک مجموعے کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''اِن کے افسانوں میں کوئی مبہمائیت نہیں ہے۔'' [۲۰]

مبہمائیت...... حد درجہ مُضحِک اور خلافِ قرینہ اختراع ہے۔ 'مُبہم' کے ساتھ 'ایت' کا اضافہ کر کے اس نادرۂ روزگار اختراع کا وجود عمل میں لایا گیا۔ مبہم کا معنٰی 'پیچیدہ' اور 'غیر واضح' ہے۔ پیش لفظ نگار، دراصل کہنا چاہتی ہیں کہ اِن کے افسانوں میں کوئی اِبہام نہیں ہے۔ اسم مصدر 'اِبہام' ہی اس مفہوم کو بہتر طور پر واضح کر سکتا ہے۔ اس جملے کے مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا جا سکتا ہے: ''ان کے افسانوں کا اُسلوب، خیال یا مُدَّعا مبہم نہیں ہے۔''

- معروف نعت گو شاعر، ڈاکٹر عزیز احسن کا شعر ہے:

یاسیّت ہی کی رِدا سر پہ مسلمان کے ہے
عزم کے دیپ بُجھا ڈالے ہوا نے کب سے [۲۱]

شاعر مذکور نے 'یاسیّت' کا تصرف 'یاس' سے کیا ہے۔ یاس کا معنٰی مایوسی، محرومی اور ناامیدی ہے۔ اس کی موجودگی میں 'یاسیّت' کا استعمال محض تکلّف اور طُرفہ لطیفہ ہے۔ اکبر اِلٰہ آبادی نے کہا تھا:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکؔبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

ایک مشہور شاعر یاس یگانہ چنگیزی گزرے ہیں مگر کسی شاعر یا شاعرہ کا تخلص 'یاسیّت' نہیں پڑھا۔

- لیجیے، امریکہ میں مقیم ایک شاعرہ سیما عابدی کے ایک شعر میں ''خوشگواریت'' کو گوارا کیجیے:

وہ بہاروں کی خوشگواریّت
کِھلتے پھولوں میں مہک اس کی ہے [۲۲]

شاعرہ محترمہ کو ''خوشگواری'' شاید ناگوار گزرتی ہے۔

- ڈاکٹر شمیم حنفی نے باقر مہدی کے بارے میں لکھا:

''اس قسم کی زندگی فطری طور پر ایک طرح کی غیر محفوظیت اور اکیلا پن اور اداسی کا تاثر بھی پیدا کرتی ہے۔''[۲۳]

ڈاکٹر شمیم حنفی بڑے ادیب اور ادب شناس ہیں۔ اگر وہ 'غیر محفوظیت' کی جگہ 'عدمِ تحفظ' لکھتے تو ہم جیسے طالب علم نافہمی کے خلجان کا شکار نہ ہوتے۔

- ممبئی (انڈیا) سے ہمارے کرم فرما جناب ندیم صدیقی (شاعر، ادیب اور صحافی) اپنی لسان شناسی اور نکتہ آفرینی میں راقم کو بھی شریک کرتے رہتے ہیں۔ ایک نئی اختراع 'لاتبدیلیت' کا انکشاف ہونے پر انھوں نے راقم کو ایک اقتباس بھیجا:

''کوئی بھی مَوقِف کسی عہد یا زمانہ میں یکساں معنیٰ نہیں رکھتا ہے۔ ہر دور کے لیے اپنے معیار ہوتے ہیں اس اعتبار سے فکر و خیال بدل جاتے ہیں مگر اس تبدیلی کی لامتناہی رفتار کے مرکز میں بے پناہ سکون اور لاتبدیلیت شامل رہتی ہے۔''[۲۴]

- زُہد (بمعنیٰ تقویٰ اور تورُّع) سے مُختَرَع ایک نادِر لفظ 'زاہدیّت' نظر سے گزرا تو راقم کو گمان ہوا کہ ایسی اختراع کرنے والا، لفظوں کا کوئی تھوک بیوپاری ہے۔[۲۵] اُس کا خیال ہوگا کہ بھاری بھرکم الفاظ میں سے زیادہ معنی کشید کیے جا سکتے ہیں، تین حرفوں پر مشتمل 'زُہد' ایک چھوٹا لفظ ہے جس سے (اُن کے خیال کے مطابق) معنیٰ کم برآمد ہوتے ہیں جب کہ 'زاہدیت' میں چھے حروف ہیں۔ کاش اُنھیں معلوم ہوتا کہ جو لفظی حسن اور معنویت زُہد میں ہے وہ زاہدیت میں کہاں۔

- جناب ندیم صدیقی نے راقم کو واٹس ایپ کے ذریعے، ایک ہندوستانی روزنامے کے ادبی صفحے میں شامل مضمون کی سُرخی بھیجی:

''تخیلی قوت، شاعری کو نئے انکشاف اور جذباتی پُراسراریت عطا کرے گی۔''

- جناب ندیم صدیقی نے راقم کو لفظ 'پُراسراریت' پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہوئے لکھا کہ:

''غازی صاحب! مضمون کی سُرخی میں 'پُراسراریت' دیکھیے جب کہ صرف 'اسرار' ہی سے بات پوری ہو رہی ہے۔ دراصل ہم لفظ کے بے جا صَرف اور اس کی معنوی کیفیت سے لاپروا رہتے ہیں۔''

جناب ندیم صدیقی نے درست فرمایا کہ 'پُراسراریت' کے بجائے 'اسرار' ہی سے بات پوری ہو رہی ہے۔ مضمون نگار اگر 'پُراسراری' لکھتے تو بھی بات بن جاتی۔

- لفظ کی طاقت، تاثیر اور لطافت کو نظر انداز کر کے بے جا تصرف کر دیا جائے تو خوبصورتی چِھن جاتی

ہے، اس کا حُسن گہنا جاتا ہے، لکھنے بولنے اور سمجھنے میں معاملہ مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 'دوام' (بمعنٰی ہمیشگی، ابد اور استقلال) کو لے لیجیے، ایک متناسِب اور مؤثر لفظ ہے۔ اسے اگر 'دوامیت' میں تبدیل کر دیں تو بیان کردہ سبھی خوبیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک بڑے ادیب کا جملہ ملاحظہ کیجیے:

> ''ہم بھول جاتے ہیں کہ ادب اور اس کی دوامیّت کے فیصلے دس بیس برسوں کے اندر نہیں ہوتے۔''[۲۶]

- ایک مضمون نظر سے گزرا جس کا بھاری بھرکم عنوان اپنی حدود سے باہر نکلا چاہتا تھا، ......''ادبی صحافت کی نئی تخلیقیت افروز فکر و آ گہی کی ماہِ تمام ڈاکٹر رضیہ حامد۔'' غُلو و تحسین سے لبریز یہ عنوان، مضمون کے مُندرجات کے بغیر ہی، ممدوحہ کے لیے کافی ہے۔ اس مضمون کا صِرف ایک جملہ قارئین کی نذر ہے جسے دیکھ کر معلوم ہوگا کہ اُردو پر ناز کرنے والے اور اس کی محبت میں گھُلنے والے اُردو کی کس قدر درگت بنا رہے ہیں:

> ''اُردو کو اپنی اس تخلیقی اُردوئیت پر جتنا بھی ناز ہو کم ہے۔''[۲۷]

- لفظ کے حُسنِ دلنواز کو مجروح کرنے والی ایک اور مثال دیکھیے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ آدمی ایک اِمکان ہے مگر موجودہ دنیا اپنی محدودیتوں کے ساتھ اس امکان کے ظہور کے لیے ناکافی ہے۔''[۲۸]

یہاں لفظ 'حدود' بآسانی وہی معنٰی دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، اگر کوئی ٹوکے تو جواب ملے گا، ''آپ لفظ میں کیوں الجھتے ہیں اصل تو مفہوم ہے وہ آپ تک پہنچ گیا۔'' مگر ہمارا مسئلہ لفظ ''محدودیت'' بھی ہے۔

- بات محدودیّت کی چلی ہے تو امجد اسلام امجد کے ایک جملے پر بھی غور کیجیے:

> ''کالم کی گنجائش کی محدودیت کے باعث میں نے ایسے لطیفوں کو ترجیح دی ہے جو زیادہ لمبے نہ ہوں۔''[۲۹]

یہاں محدودیت کے بجائے بآسانی ''کمی'' لکھا جا سکتا تھا۔

- سری نگر (مقبوضہ کشمیر) سے نامور اُردو ادیب حامدی کاشمیری (مرحوم) کا مضمون بعنوان ''تفہیمِ کلامِ غالب......اکتشافی تنقید کے تناظر میں'' نظر سے گزرا۔ بڑا اہم، قیمتی اور پُر مغز مضمون ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں زرخیزی، اِظہار، اِدراک، اِحساس، عِلم، ترسیل، لاجہتی، جبر، اکتشاف، رمز، ارض اور اسرار کو معنٰی کے اعتبار سے ناکافی اور غیر مؤثر سمجھتے ہوئے زرخیزیت، اظہاریت،

ادراکیت، احساسیت، علمیت، ترسیلیت، لاجہتیت، جبریت، اکتشافیت، رمزیت، ارضیت اور اسراریت کا تصرف کر کے بزعمِ خویش گیسوئے اُردو کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔

- مولانا عبدالماجد دریابادی، بہت بڑے عالمِ دین اور اُردو زبان و ادب کا فخر ہیں۔ اُن کی ایک تحریر میں بھی نیچریت، فرنگیت، موجودیت اور معلومیت جیسے تصرفات راقم کو نظر آئے۔
- ''معذوری'' ایک عام فہم، سادہ اور مفہوم کو خوش اسلوبی سے واضح کرنے والا لفظ ہے۔ اس میں تصرف کر کے اگر کوئی ''معذوریت'' لکھے اور بولے تو محض تکلف اور طُرفہ لطیفہ ہوگا۔ ممبئی (انڈیا) سے شائع ہونے والے اُردو کے معروف ماہ نامہ ''شاعر'' کے نائب مدیر اور سیماب اکبرآبادی کے پوتے جناب حامد اقبال صدیقی لکھتے ہیں:

''۲۰۱۶ء کے ایکٹ کے تحت معذوریت کی اکیس قسموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔''[۳۰]

....

راقم لسانی معاملات اور علمی نِکات سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی سے رہنمائی لیتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے راقم کے ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے خط میں لکھا:

> ''جہاں تک 'یت' کی پخ کا تعلق ہے میرے نزدیک نہ تو یہ ممنوعات کے ذیل میں آتا ہے اور نہ اس کی کھلی اجازت دی جاسکتی ہے ورنہ ایک طوفانِ بدتمیزی اُٹھ کھڑا ہوگا۔ آپ اِن الفاظ کا فرداً فرداً جائزہ لیجیے۔ آپ نے بطور مثال جو الفاظ درج کیے ہیں، میں اُن کا جائزہ لوں گا۔ 'معتبریت' بالکل غلط، زیادہ سے زیادہ معتبری برداشت ہوسکتا ہے۔ معتبری اور اعتبار میں باریک سا فرق بھی ہے۔ علمیت، موزونیت اور غذائیت غلط العام فصیح کے ذیل میں آتے ہیں اور معنٰی کے لحاظ سے بھی یہ تینوں لفظ علم، توازن اور غذا سے ذرا مختلف ہیں مثلاً توازن کا اطلاق عمومی اور وسیع ہے، شعری توازن کے لیے موزونیت بنایا گیا۔ مجذوبیت (جذب و مستی) کا بھی کسی حد تک یہی حال ہے۔ مُبہَمائیت اور جوازیت پر لعنت...... نیز ماخوذیت، تصوریت، حقیقیت اور جنونیت پر۔''[۳۱]

لسان شناسی میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے۔ راقم کے نام اُن کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''آپ نے لکھا ہے کہ آج کل کے اُردو اخبارات و جرائد جو نت نئ (بلکہ غلط کہنا

چاہیے) تراکیب اورالفاظ اِختراع فرمارہے ہیں انھیں آپ کا ذوق، سماعت اور نظر قبول نہیں کرتے۔تو بھائی صاحب کس کافر کا کرتا ہے؟ کون بدذوق ایسی احمقانہ تراکیب مثلاً جوازیت یا عاجزیت وغیرہ کو مانتا ہے۔ میں بھی اس اذّیت سے گزرتا رہتا ہوں۔'' [۳۲]

مرقومہ بالا دونوں معتبر حوالے ''یت'' کے لاحقے کے استعمال کی بابت خوب روشنی ڈالتے ہیں۔ تحریر وتقریر، اِنسانی شخصیت کا ثقافتی تلازمہ ہے۔اہلِ ذوق اِس امر کا اہتمام کرتے ہیں کہ زبان و بیان، مسلّمہ اُصول ومعیارات سے ہم آہنگ رہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ 'بیباکی' کی سند کے لیے علاّمہ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی

....

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

بحوالہ کلیاتِ اقبال مع اشاریہ و کشف الابیات، مرتب: احمد رضا (لاہور: ادارہ اہلِ قلم، علامہ اقبال ٹاؤن، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۵۳ نیز دیکھیے: ص ۳۸۶۔

۲۔ 'لادینی' کی سند کے لیے پروفیسر حمید احمد خان کا جملہ ملاحظہ ہو: ''کٹر قسم کی مُلاّ ئیت سے کٹر قسم کی لادینی تک ہر رنگ اور ہر عقیدے کے متحارب فریق اب ہمارے ادب کے قدردانوں اور ناقدردانوں میں موجود ہیں۔'' بحوالہ پروفیسر حمید احمد خان، تعلیم و تہذیب، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۶ء) ص ۱۸۰

۳۔ 'یک رنگی اور یکسانی' کی سند کے لیے ملاحظہ ہو معروف ماہرِ لسانیات پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۸۸۵ء-۱۹۷۲ء) کا جملہ: ''اگر قاعدے معیّن نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی اور یکسانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہوگا۔'' بحوالہ پروفیسر عبدالستار صدیقی، مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد اول (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۵۔

۴۔ الیسوعی، لویس معلوف، المنجد، (بیروت: دارالمشرق، ۱۹۷۳ء)، ص ۳۸۳-۳۸۴۔
نیز دیکھیے: بلیاوی، مولانا عبدالحفیظ، مصباح اللغات، (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء) ص ۴۲۸-۴۲۹

۵۔ مولانا حامد علی خان، اِداریہ ماہ نامہ الحمراء، بابت اپریل ۱۹۵۵ء۔

۶۔ نذیر حسین، 'الشابی ابوالقاسم' [مقالہ]، مشمولہ: اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۷۵ء) ص ۵۴۹۔

۷۔ سیّد احتشام حسین، 'جوش ملیح آبادی' مشمولہ: نقوش شخصیات نمبر (لاہور: سن ندارد)، ص ۶۲۲۔

۸۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی تحریکیں، (کراچی: انجمن ترقیِ اُردو، ۲۰۰۴ء) ص ۶۷۔

۹۔ پروفیسر محمد بشیر متین 'زبان و بیان کی گوہر افشانیاں' مشمولہ: فاران، (لاہور: گورنمنٹ کالج سول لائنز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۰۵۔

۱۰۔ ......ایضاً......،ص۱۰۶۔

۱۱۔ ......ایضاً......،ص۱۰۶۔

۱۲۔ ......ایضاً......،ص۱۰۶۔

۱۳۔ فراق گورکھپوری، 'مجنوں گورکھپوری' مشمولہ نقوش،شخصیات نمبر،ص۳۰۶۔

۱۴۔ فکرتونسوی، ''کنہیالال کپور'' مشمولہ: نقوش شخصیات نمبر،ص۴۸۷۔

۱۵۔ 'زبان وبیان کی گوہرافشانیاں'، مشمولہفاران،۲۰۰۴ء،ص۱۰۷

۱۶۔ ......ایضاً......،ص۱۰۷۔

۱۷۔ ......ایضاً......،ص۱۰۷۔

۱۸۔ ف۔س اعجاز، 'سنسنی خیزیت اوراحمد سعید ملیح آبادی' مشمولہ: ماہ نامہ انشا (احمد سعید ملیح آبادی نمبر) مدیر ف۔س اعجاز، کلکتہ شمارہ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۷ء،ص۱۲۴۔

۱۹۔ فراق گورکھپوری، 'مجنوں گورکھپوری' مشمولہ: نقوش،شخصیات نمبر،ص۳۰۵۔

۲۰۔ ڈاکٹرشکیل احمد خان، خواب اور طرح کے، (حیدرآباد: ادارہ لوحِ ادب،۲۰۱۲ء)،ص۷۔

۲۱۔ سیّدصبیح رحمانی، کلیاتِ عزیز احسن، (کراچی: نعت ریسرچ سنٹر،نومبر۲۰۱۷ء)،ص۱۰۷۔

۲۲۔ بحوالہ ندیم صدیقی، ممبئی (انڈیا)۔اُن کے مطابق یہ غزل روزنامہ ''انقلاب''،ممبئی کے ادبی صفحہ میں شائع ہوئی۔سن اشاعت،اُن کے مطابق ۲۰۰۵ء ہے۔

۲۳۔ ڈاکٹرشمیم حنفی نامورادیب،نقاداورمحقق......دہلی-انڈیا۔

۲۴۔ رمیش چندردویدی عُرف شوقؔ مرزاپوری، میں نے فراق کودیکھا تھا،ص۱۰۷۔

۲۵۔ ڈاکٹرآفتاب احمد، 'شاعری میں کفر' مشمولہ: ماہ نامہ اشارات، کراچی بابت اگست ۱۹۹۶ء،ص۳۱۔

۲۶۔ یہ جملہ ''ذہنِ جدید'' کے مدیر، معروف شاعر، ادیب اور براڈکاسٹر زبیر رضوی مرحوم کا ہے جو ندیم صدیقی صاحب کے ذریعے راقم تک پہنچا ہے۔

۲۷۔ یہ جملہ نظام صدیقی کے مذکورہ مضمون سے اخذ کر کے جناب ندیم صدیقی نے راقم کو بھیجا۔

۲۸۔ یہ جملہ بھی، کسی نامعلوم ادیب کا، جناب ندیم صدیقی نے بھیجا ہے۔

۲۹۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ایکسپریس، کراچی، اتوار۱۹/اپریل۲۰۲۰ء۔

۳۰۔ حامد اقبال صدیقی، ماہ نامہ شاعر، بمبئی۔(انڈیا)۔

۳۱۔ حفیظ الرحمٰن احسن، مشاہیرِ ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین، (فیصل آباد: مثال پبلشرز،۲۰۱۹ء)،ص۶۱۔

۳۲۔ ......ایضاً......،ص۳۸۵۔

اُردو میں اِمالہ......ایک مطالعہ

(لسانی تناظر میں)

اِمالہ کیا ہے؟ اُردو میں وہ کون سے اسما ہیں جو اِمالہ قبول کرتے ہیں؟ وہ کون سے الفاظ ہیں جنھیں اس تغیر سے اِستثنا حاصل ہے؟ تحریر و تقریر میں، اِمالے کے ضمن میں، کون سی مشکلات پیش آتی ہیں؟ یہ اور ایسے کئی سوال ہیں جن کا جواب زیرِ نظر مضمون میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ راقم السطور اپنے مطالعے اور تحقیق کی بنیاد پر، اِمالے کے کچھ قواعد زیرِ بحث لا رہا ہے۔ ان قاعدوں کو مکمل تو نہیں کہا جا سکتا، پھر بھی اس موضوع کو اُردو قواعد کا ایک سبق بنانے کے لیے کچھ اشارے ضرور ملیں گے۔

''اِمالہ'' کا پس منظر

زبانوں کی تاریخ اور اُن کے عروج و زوال کے اسباب و محرکات کا کھوج لگایا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زبانیں بھی قوموں کے مماثل ہیں۔ جس طرح قومیں ترقی و تنزل اور عروج و زوال کے عمل سے گزرتی ہیں، زبانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آتا ہے۔ کوئی زبان جس علاقے میں جنم لیتی ہے اس سے پہلے وہاں کسی نہ کسی زبان کا وجود ضرور ہوتا ہے۔ جنم لینے والی زبان اپنی طاقت کے بل پر پھیلتی جاتی ہے اور دوسرے خطوں اور علاقوں کو اپنے تسلط میں لے لیتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لہجے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زبان ایک ہی ہوتی ہے لیکن صوتی آہنگ میں تبدیلیاں رُونما ہو جاتی ہیں۔ صوتی آہنگ میں تبدیلیوں کی واضح مثال ''اِمالہ'' کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اِمالے کا تصور عربی زبان سے ہمارے ہاں آیا ہے۔ عربی میں اس کا استعمال بہت ہے مگر قواعد کے مطابق ہے۔ قرآنِ مجید کے لہجوں کو سبعۃ اَحرف سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سبعۃ اَحرف کی تفصیل کے لیے

تفسیر اور تجوید کی کتابوں سے رہنمائی لیتے ہیں تو ہمیں نتیجے کے طور پر ''اِمالہ'' بھی ملتا ہے کیونکہ ایک قراءت کو دوسری قراءت سے ممتاز کرنے میں اس کا بہت بڑا کردار ہے۔ حجاز اور پاک و ہند میں حفص کی روایت پر عمل کیا جاتا ہے جس میں اِمالہ نہیں بلکہ فتحہ کی قراءت پائی جاتی ہے۔ حجاز کے برعکس دوسرے قبیلے یعنی تمیم، اسد، طے اور قیس کے لہجے میں اِمالہ پایا جاتا ہے اور وہ ہے الف کو یا اور فتحہ کو کسرہ کی جانب مائل کرنا۔

فارسی میں بھی اِمالے کا وجود رہا ہے لیکن ایرانی فارسی میں یائے مجہول کے ختم ہونے سے اِمالہ تحریر سے بھی ناپید ہوگیا ہے۔ مگر بول چال میں اب بھی اتنا رچا بسا ہے کہ ''جامہ'' کا تلفظ ''جامے'' کیا جاتا ہے اگرچہ تحریر میں ایسے نہیں آتا۔ فارسی میں اِمالہ، اُردو میں امالہ کے مزاج سے یکسر مختلف ہے۔ فارسی میں عام طور پر لفظ کے وسط میں اِمالہ آیا ہے جیسے کتاب سے کِتیب، رکاب سے رُکیب، خضاب سے خضیب، نہاب سے نہیب وغیرہ۔ فارسی میں یہ صرف تکلّم و ترنّم ہی میں نہیں، قافیہ میں بھی آتا ہے لیکن موجودہ دور کی اُردو کی طرح، ہر مقام پر نظر نہیں آتا بلکہ اتنا کم ہے کہ اسے شاذ سے اوپر کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

لُغوی اور اصطلاحی مفہوم

''اِمالہ'' عربی زبان کا لفظ ہے جو میل (م ی ل) کے مادے سے مشتق ہے جس کا لُغوی معنی مائل کرنا اور جھکانا ہے۔[۱] اِس کی جامع تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

> ''اِمالہ'' کے معنی یہ ہیں کہ فتحہ (زبر) کو کسرہ (زیر) کی جانب خفیف طور پر مائل کیا جائے گویا وہ فتحہ اور کسرہ کے مابین ہو۔ اِسی طرح الف کو یاء کی جانب مائل کیا جاتا ہے۔''[۲]

لُغت نامہ دِہ خدا کے مطابق اس کی تعریف یوں ہے:

> ''مَیل دادن فتحہ بسوئے کسرہ وصوتِ الف بہ یائے مجہول مانندِ نہاب ......نَہَیب، خضاب ......خَضَیب وغیرہ''[۳]

انگریزی میں اسے declension اور اس عمل کو to decline کہا جاتا ہے۔[۴] اِصطلاحاً یہ ایک صوتی تغیر ہے جو زبر کو زیر اور الف کو یائے مجہول ''ے'' کی طرف جھکا کر ادا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ''اِمالہ'' کے وسیع تر مفہوم میں حروفِ ربط یعنی نے، سے، پر، تک، کو، میں، کا، کے، کی وغیرہ جب اَلِف یا ہائے ہوّز پر ختم ہونے والے کسی اسم کے بعد آتے ہیں تو اس اسم کی شکل بدل جاتی ہے۔ اِس اعتبار سے ان حروف کو حروفِ عاملہ یا حروفِ مغیّرہ کہتے ہیں یعنی تغیر پیدا کرنے والے حروف۔ اَلِف کی آواز پر ختم ہونے والے اسما کے بعد اگر حروفِ ربط میں سے کوئی آجائے تو اَلِف کی اختتامی آواز یائے مجہول ''ے''

میں بدل جاتی ہے مثال کے طور پر ''لڑکا'' کے بعد اگر نے، سے، کو، پر، تک اور کا وغیرہ آجائیں تو ''لڑکا'' کی شکل تبدیل ہوکر ''لڑکے'' بن جائے گی جیسے لڑکے نے کہا، لڑکے سے کہو، لڑکے پر بھروسہ کرو، لڑکے تک بات نہ پہنچے، لڑکے کو بلاؤ، لڑکے میں کیا خرابی ہے، لڑکے کا نام کیا ہے وغیرہ۔ اِن جملوں میں ''لڑکے'' جمع کے صیغے میں نہیں ہیں بلکہ واحد کے صیغے میں ہیں، صرف صوتی تغیر واقع ہوا ہے۔ اس طرح کی تبدیلی کو اصطلاح میں ''اِمالہ'' کہتے ہیں۔

کوئی اسم اگر زبر والے حرف سے شروع ہو رہا ہو اور اس کے بعد والا یعنی دوسرا حرف حاء (ح) ہے تو یہاں بھی اِمالہ کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر وحشی (Wahshi)، وحشت (Wahshat)، محفوظ (Mahfooz)، بحث (Bah,s) وغیرہ کو اِمالہ دے کر، قدرے تغیر کے ساتھ، وحشی (Wehshi)، وحشت (Wehshat)، محفوظ (Mehfooz)، بحث (Beh,s) وغیرہ ادا کیا جائے گا۔ پہلے حرف کے بعد، بولنے میں دو نقطوں والی ''ی'' کا شائبہ ہے لیکن یہ لکھنے میں نہیں آتی۔

اِمالے کے لیے بنیادی اصول صوتیاتی ہے یعنی اسم کے آخر میں الف کی آواز ہونی چاہیے جو کہ الف کے علاوہ ہائے مختفی، گول ''ہ'' اور ''ع'' سے بھی پیدا ہوسکتی ہے جیسے:

یہ اچھا موقع ہے.................اس موقعے سے فائدہ اٹھایئے۔
کالا برقع کس کا ہے؟..........کالے برقعے میں کون ہے؟
یہ رقعہ اُسے دے دو.............اِس رقعے میں ایک ضروری بات لکھی ہے۔
ہر ذرّہ چمک رہا ہے............ہر ذرّے کی چمک قابلِ دید ہے۔
میرا حِصّہ مجھے دے دو............میرے حصّے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

اِمالہ یا اِنصراف؟

پروفیسر آسی ضیائی (مرحوم) نے ''اِمالہ'' کو اِنصراف کا نام دیا ہے اور لکھا ہے:

''لغت اور قواعد کی بعض کتابوں میں انصراف کو ''اِمالہ'' بھی لکھا گیا ہے، اور بعض حضرات اِسے تغیر بھی کہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک اس کا سب سے موزوں نام اِنصراف ہی ہے۔'' [۵]

اِنصراف (امالہ) کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر آسی ضیائی لکھتے ہیں:

''اِنصراف اُس کلّی یا جزئی تبدیلی کا نام ہے جو کسی لفظ کے حالتِ مجروری میں آنے

سے پیدا ہوتی ہے۔ حالتِ مجروری اُس حالت کا نام ہے جب کسی لفظ پر حرفِ جار مثلاً سے، تک، میں، کا، پر، نے، کو وغیرہ لایا جائے۔ جو الفاظ اِس طرح حرف جار آنے سے شکل بدل لیتے ہیں وہ ''مُنصرِف'' کہلاتے ہیں۔ جن الفاظ کی شکل حالتِ مجروری میں نہیں بدلتی وہ ''غیر منصرف'' کہلاتے ہیں۔ فعل پر اِنصراف کا عمل بالکل نہیں ہوتا، کیونکہ فعل پر حرفِ جار لایا ہی نہیں جاتا۔ اِنصراف کے عمل کے سمجھنے کے لیے کُلّی تبدیلی کی مثال ملاحظہ کیجیے:

ا۔ وہ شخص یہاں آیا تھا۔ ۲۔ اُس شخص کو بلاؤ۔

پہلے جملے کا ''وہ'' دوسرے جملے میں ''اُس'' بن گیا کیونکہ اس کے اوپر حرفِ جار ''کو'' لایا گیا۔

اب جزئی تبدیلی کی مثال ملاحظہ ہو:

ا۔ لڑکا کرسی پر بیٹھا ہے۔ ۲۔ لڑکے سے غلطی ہوگئی۔

پہلے جملے کا ''لڑکا'' دوسرے جملے میں حرفِ جار ''سے'' آنے سے ''لڑکے'' بن گیا یعنی صرف آخری الف بدل کر ''ے'' ہوگیا۔[٦]

اِصطلاحاتِ اِمالہ

موضوعِ زیرِ بحث یعنی ''اِمالہ'' کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے، ضروری ہے کہ کچھ ایسی اِصطلاحات کا مطالعہ کرلیا جائے جن کا ''اِمالہ'' سے گہرا تعلق ہے:

ا۔ اَلِف: بہ اِعتبارِ اصطلاح، یہاں اَلِف سے مراد وہ اَلِف ہے جو لفظ کے اخیر میں آئے۔ یہ چھوٹی آواز کا اَلِف ہوتا ہے جس پر مد نہیں آتی جیسے دنیا، اجالا، اندھیرا، سویرا وغیرہ۔

۲۔ ہائے مُختفی: ہائے مختفی مستقل حرف کی حیثیت نہیں رکھتی اور اس کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ یہ اپنے سے پہلے والے حرف کو اس طرح سہارا دیتی ہے کہ اُس کی حرکت (زبر) قائم رہ سکے۔ اس طرح اس کی حیثیت علامت کی سی ہے۔ اسے ہائے مکتوبی بھی کہتے ہیں جیسے بہانہ، پروانہ، ہالہ، نالہ، روّیہ، جلسہ، فِدیہ، خانہ، کعبہ وغیرہ۔

۳۔ یائے مجہول: جس کے اوّل کسرۂ خالص نہ ہو اور خوب ظاہر بھی نہ پڑھی جائے۔ اِسے یائے معکوس بھی کہتے ہیں۔ عرفِ عام میں اسے بڑی ''ے'' کہا جاتا ہے۔

۴۔حروفِ ربط: یہ وہ حروف ہیں جو ایک لفظ کا تعلق کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں جیسے نے، سے، پر، تک، کو، میں، کا، کے، کی وغیرہ۔

''اِمالہ'' لہجے کا موضوع ہے

یہاں یہ بات واضح کر دینا بہت ضروری ہے کہ اِمالہ لہجے کا موضوع ہے۔ یہ زبان کا وہ اُسلوب ہے جس سے ایک لہجے کو دوسرے لہجے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ لہجہ، ہر علاقے میں مختلف ہوتا ہے۔ کہیں ایک ہی لفظ میں ایک علاقے میں اِمالہ مستعمل ہے تو کہیں دوسرے مقام پر اس کو اختیار نہیں کیا جاتا جیسے دادا اور تایا میں عموماً امالہ نہیں کرتے لیکن بعض علاقوں میں، اِن میں بھی اِمالہ نظر آتا ہے۔ اِسی طرح سے کوئی لفظ کسی عہد میں اِمالے کے دائرے میں نہیں آتا لیکن بعد کے زمانے میں آ جاتا ہے خواہ سماعت کو بہتر محسوس ہو یا ناپسندیدہ لگے۔

راقم السّطور کا، برسوں پر مبنی مشاہدہ ہے کہ آزاد کشمیر کے ایک مخصوص علاقے (راولاکوٹ اور پلندری) کا مقامی لہجہ اُردو زبان پر اس قدر غالب ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اُردو بولتے ہوئے بہت سے لفظوں کا اِمالہ کرتے ہیں مثلاً اب، جب اور کب کو اَیب، جَیب اور کَیب (eb....jeb...keb) ہی کہتے ہیں۔ ناموں میں اجمل، اسلم، اشرف، اصغر، اکبر، اکرم، اکمل، امجد اور انور کو بالترتیب Emjad..Ekmal..Ekram..Ekbar..Esghar..Eshraf..Eslam..Ejmal اور Enwar ہی کہتے ہیں حالانکہ ان ناموں میں اَلِف کے بعد کہیں بھی حا اور ہا نہیں ہے۔ اُن کا لہجہ ہی ایسا ہے اور اُنھیں مَوردِ اِلزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ وہ زبان کے بگاڑ میں کوشاں ہیں۔

محلِّ اِمالہ

امالے کے قواعد کی رُو سے، ترتیب کے ساتھ، کچھ ایسے اسما اور الفاظ دیے جا رہے ہیں جو اِنصراف اور اِمالہ کو قبول کرتے ہیں:

ا۔ عربی کے کچھ الفاظ جن کے آخر میں، اصل میں یائے تحتانی (ی) ہے اور اُردو میں عموماً اَلِف مقصورہ سے لکھے جاتے ہیں، امالہ قبول کرتے ہیں جیسے عربی میں اصل اِملا ماجریٰ، معّمٰی، ہیولیٰ، مجلّٰی، مصلّٰی، تقاضیٰ اور تماشیٰ ہے مگر اردو میں ماجرا، معمّا، ہیولا، مجلّا، مصلّا، تقاضا اور تماشا لکھتے ہیں۔ یہ الفاظ اردو میں امالہ قبول کرتے ہیں مثلاً ماجرا سے ماجرے، معمّا سے معمّے، ہیولا سے ہیولے، مجلّا سے مجلّے، مُصلّا سے مُصلّے، تقاضا سے تقاضے، تماشا سے تماشے وغیرہ۔

۲۔ عربی، فارسی اور ترکی کے بعض لفظ جن کے آخر میں چھوٹی آواز کا اَلِف ہے، امالہ قبول کرتے ہیں جیسے شوربا سے شوربے، خرما سے خرمے، چُغا سے چُغے، تمغا سے تمغے، مچلکا سے مچلکے، بقایا سے بقائے، قورما سے قورمے، ناشتا سے ناشتے، الجبرا سے الجبرے اور طُغرا سے طُغرے۔

۳۔ عربی الفاظ جن کے آخر میں ہائے ہوّز ہے، اِمالے کی صورت میں یائے مجہول (ے) سے لکھے اور بولے جاتے ہیں جیسے تذکرہ سے تذکرے، تبصرہ سے تبصرے، جلسہ سے جلسے، فتحہ سے فتحے اور کسرہ سے کسرے۔

۴۔ عربی کے بعض اسموں کے آخر میں ایک حرف ''ہ'' کی شکل کا آتا ہے جسے عموماً ''ت'' پڑھا جاتا ہے۔ اصل میں اس کی شکل ''ۃ'' ہے۔ اس کا تلفظ ملفوظ ''ہ'' کا سا ہے۔ اُردو میں بڑی ''ے'' (یائے مجہول) سے بدل کر امالہ کرتے ہیں جیسے کعبہ سے کعبے، مدینہ سے مدینے، مدرسہ سے مدرسے، درجہ سے درجے، ادارہ سے ادارے اور اِفاقہ سے اِفاقے۔

۵۔ عربی کے کچھ لفظوں کے آخر میں تائے مدوّرہ ہے لیکن فارسی اور اردو میں ہائے مختفی ''ہ'' سے لکھے جاتے ہیں۔ امالے کی صورت میں ہائے مختفی کو یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں جیسے دَورہ سے دَورے، ارادہ سے ارادے، فائدہ سے فائدے، قاعدہ سے قاعدے اور ادارہ سے ادارے وغیرہ۔

۶۔ اردو کے وہ الفاظ جن کے آخر میں ہائے مختفی نہیں ہے بلکہ چھوٹی آواز کا الفِ ہے، امالہ قبول کرتے ہیں جیسے انگارا سے انگارے، انڈا سے انڈے، پنکھا سے پنکھے، تارا سے تارے، جالا سے جالے، جنگلا سے جنگلے، جھنڈا سے جھنڈے، دلاسا سے دلاسے، ڈھکنا سے ڈھکنے، سمجھوتا سے سمجھوتے، گھونسلا سے گھونسلے، مہینا سے مہینے، ناتا سے ناتے اور نکمّا سے نکمّے۔

۷۔ بہت سے ایسے مرکبات جن کا ایک جز عربی یا فارسی ہے، یا دونوں جز فارسی یا عربی کے ہیں یا جن کے دونوں جز نہ عربی کے ہیں نہ فارسی کے، اُن کا آخری حرف الف ہے تو امالہ قبول کرتے ہیں جیسے اُٹھائی گیرا، ادلا بدلا، امام باڑا، اتا پتا، بے اصولا، بے استادا، بے صبرا، بن شاخا، جیب کترا، چت کبرا، چوکھٹا، چوبارا، دورُخا، دُم کٹا، ست رنگا، نولکھا، نمک پارا، مَیل خورا، ناشکرا وغیرہ۔

۸۔ ایسے مرکبات جن کے دونوں جز فارسی یا عربی ہیں اور وہ اُردو میں فارسی اور عربی کی طرح آخر میں ''ہ'' سے لکھے جاتے ہیں، امالہ قبول کرتے ہیں جیسے دوغزلہ، دوگونہ، دوچوبہ، دوراہہ، دوشاخہ، دوشنبہ، دولت خانہ وغیرہ۔

۹۔ شہروں اور جگہوں کے وہ نام، جن کے آخر میں ہائے مختفی لکھی جاتی ہے اور بولنے میں الف کی آواز نکلتی

ہے، اِمالے کی صورت میں ہائے مختفی کو یائے مجہول سے بدل دیا جاتا ہے جیسے آگرہ سے آگرے اور پٹنہ سے پٹنے۔ یہی معاملہ امروہہ، مارہرہ، گلبرگہ، لدھیانہ، بڑودہ، دربھنگہ، بنگالہ، ہریانہ وغیرہ کے ساتھ ہوگا۔

۱۰۔ اُردو کے جن مصادر میں دو ''نُون'' یک جا ہیں اُن کا امالہ ہوگا۔ محرّف صورت میں دونوں ''نون'' برقرار رہیں گے اور اَلِف کو ''ے'' سے بدل دیں گے جیسے بَننا سے بَننے، سُننا سے سُننے، ماننا سے ماننے، چھیننا سے چھیننے، گِننا سے گِننے، چھاننا سے چھاننے، جاننا سے جاننے، بُھوننا سے بھوننے اور پہچاننا سے پہچاننے۔

۱۱۔ ایسے اُردو مصادر جن میں نُونِ غُنّہ جُز وِلفظ ہے اور ایک نُون علامتِ مصدر ''نا'' کا جز ہے، محرّف صورت میں اَلِف کو ''ے'' سے بدلیں گے جیسے اُمنڈنا سے اُمنڈنے، اُنڈیلنا سے اُنڈیلنے، اُونگھنا سے اُونگھنے، پھنسنا سے پھنسنے، ڈھونڈنا سے ڈھونڈنے، سنوارنا سے سنوارنے، مانگنا سے مانگنے اور ہنسنا سے ہنسنے۔

۱۲۔ جن لفظوں کے آخر میں دو ''ہ'' ہیں، اس طرح کہ آخر میں ہائے مختفی ہے اور اُس سے پہلے ہائے ملفوظِ متحرک ہے، امالے کی صورت میں ہائے مختفی ''ے'' سے بدل جائے گی جیسے قہقہہ سے قہقہے، شُبہہ سے شُبہے، جَبہہ سے جَبہے وغیرہ۔

۱۳۔ بعض الفاظ میں ہائے مختفی سے پہلے حائے حُطّی (ح) ہے، اِمالے کی صورت میں ''ح'' باقی رہتا ہے جب کہ ہائے مختفی ''ے'' سے بدل جاتی ہے جیسے فاتحہ سے فاتحے، مصافحہ سے مصافحے اور سانحہ سے سانحے۔

۱۴۔ فارسی یا عربی کے ایسے لفظ جو ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں اور ہائے مختفی سے پہلے والے حرف پر زبر ہوتا ہے، اِمالے کی صورت میں ہائے مختفی کو ''ے'' سے بدل دیتے ہیں اور زبر کو زیر سے جیسے زمزمہ سے زمزمے، نغمہ سے نغمے، جادہ سے جادے، جلوہ سے جلوے، نقطہ سے نقطے، بت کدہ سے بت کدے، نظریہ سے نظریے، کعبہ سے کعبے، عرصہ سے عرصے، مرثیہ سے مرثیے، زاویہ سے زاویے، پردہ سے پردے، پیمانہ سے پیمانے، وقفہ سے وقفے، حلیہ سے حلیے، دہریہ سے دہریے وغیرہ۔

۱۵۔ عین پر ختم ہونے والے ایسے الفاظ جن میں عین سے پہلے والے حرف پر زبر ہوتا ہے، اِمالے کی صورت میں زبر کو زیر سے بدل دیتے ہیں اور یائے مجہول کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے مصرع سے مصرعے، موقع موقعے، ضلع سے ضلعے، مقطع سے مقطعے، مطلع سے مطلعے، مجمع سے مجمعے اور مرقع سے

مرقعے۔ ایسے لفظ عموماً چار حرفی ہوتے ہیں (ضلع کو استثنا حاصل ہے) اور عموماً ''میم'' سے شروع ہوتے ہیں۔

۱۶۔ یورپی زبانوں کے وہ الفاظ جنھوں نے اردو کا جامہ پہن لیا ہے، اِمالہ قبول کرتے ہیں جیسے تانگا سے تانگے، رکشا سے رکشے، کیمرا سے کیمرے، ڈراما سے ڈرامے اور سوڈا سے سوڈے۔

۱۷۔ درج ذیل رشتے اِمالہ قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا سے بیٹے، بھانجا سے بھانجے، بھتیجا سے بھتیجے، پوتا سے پوتے، نواسا سے نواسے، لڑکا سے لڑکے۔

۱۸۔ اُردو اور ہندی کے اسما و صفات، جن کے آخر میں اَلف ہوتا ہے، ان کا اِمالہ جائز ہے جیسے بھلا سے بھلے، اچھا سے اچھے، نیلا سے نیلے، پیلا سے پیلے وغیرہ۔[۷]

۱۹۔ تمام اُردو مصادر مثلاً کرنا، لانا، رونا، آنا، جانا وغیرہ کا اِمالہ ہوسکتا ہے۔ اِمالہ کرنے سے یہ کرنے، لانے، رونے، آنے، جانے بن جاتے ہیں۔[۸]

۲۰۔ پاک و ہند کے اُن تمام شہروں اور گاؤں کے ناموں کا اِمالہ کیا جاسکتا ہے جن کے آخر میں اَلف یا ''ہ'' ہو مثلاً سرگودھا، گوجرہ، ڈسکہ، گوجرانوالا، پونا، آگرہ، کلکتہ، پٹنہ وغیرہ۔ سوائے اُن کے جو کسی مذہبی یا تاریخی اہمیت کے حامل ہوں۔[۹]

۲۱۔ جن واحد مذکر لفظوں کے آخر میں ''ہ'' یا اَلف ہو اور فوراً بعد کوئی حرفِ عاملہ آجائے تو اِمالہ کیا جائے گا مثلاً آپ کے بارہ میں......اس افسانہ کا......تمھارے بھروسا پر......وہ چوراہا میں کھڑا تھا کے بجائے یوں لکھنا صحیح ہوگا: آپ کے بارے میں، اس افسانے کا، تمھارے بھروسے پر، وہ چوراہے میں کھڑا تھا۔[۱۰]

۲۲۔ اُردو میں مستعمل کسی عربی اسم کی اُردو قاعدے سے بنائی گئی جمع کا اِمالہ ہوسکتا ہے جیسے ''وہ ایک جنگجو قبیلہ ہے'' سے ''وہ جنگجو قبیلے سے تعلق رکھتا ہے'' مگر اس کی عربی جمع قبائل کا اِمالہ جائز نہیں۔

۲۳۔ اُردو میں مستعمل انگریزی اسما کے بارے میں کوئی خاص قاعدہ نہیں۔ کسی انگریزی اسم کا اِمالہ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اس بات کو پیشِ نظر رکھ کر کیا جاسکتا ہے کہ اِمالہ کرنے سے ناگوار صورت تو نہ بنے گی؟

مستثنیات

اب ایسے الفاظ کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو اِمالے سے واقع ہونے والے تغیر کو قبول نہیں کرتے:

۱۔ عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ جن میں اَلف اصلی ہو، اِمالہ قبول نہیں کرتے جیسے دُعا، دَغا، وفا، قضا، جزا، پیدا، مرزا، صحرا اور آپا (بمعنیٰ خواہر)۔

۲۔ عربی الفاظ کے جمع میں اِمالہ نہیں ہوگا جیسے انبیا، اتقیا، اولیا، اصفیا، شرفا، علما اور طلبہ وغیرہ۔

۳۔ عربی کے مختلف ابواب (مثلاً اِفعال اِفتعال، اِنفعال) کے وہ اسما جو اُردو میں بہت زیادہ مستعمل ہیں اور اپنے اخیر میں اَلف بھی رکھتے ہیں، اردو والے اِن کو اِمالہ کے ضمن میں نہیں لاتے جیسے اِخفا، اِجرا، اِحیا، انتہا، ابتدا، ارتقا، انخلا وغیرہ۔

۴۔ الفِ مقصورہ والے لفظوں میں اِمالہ نہیں ہوسکتا جیسے صغریٰ، کبریٰ، عظمیٰ، ادنیٰ، اعلیٰ، طوبیٰ وغیرہ۔ کچھ الفاظ مثلاً دعویٰ، تقویٰ وغیرہ کو استثنا حاصل ہے کہ وہ اِمالے کے ساتھ دعوے، تقوے وغیرہ کی صورت میں مستعمل ہیں۔

۵۔ القاب وخطابات اِمالہ قبول نہیں کرتے جیسے خلیفہ، آقا، آغا، مولانا، مُلّا، پیشوا وغیرہ۔

۶۔ نام میں اِمالہ نہیں ہوسکتا جیسے رضیہ، سلطانہ، فرزانہ، رشیدہ وغیرہ۔

۷۔ اعدادِ لفظی میں اِمالہ نہیں کر سکتے جیسے گیارہ سے اٹھارہ تک۔ اِن اعداد میں اِمالہ نہ ہونے کی واضح دلیل یہ ہے کہ ان اعداد میں جو ''ہ'' استعمال ہوا ہے وہ ہائے ملفوظ ہے نہ کہ ہائے خفی۔[۱۱]

۸۔ اسمائے تصغیر میں اِمالہ نہیں ہوسکتا جیسے کھٹیا، چدریا، چُنریا، بٹیا، بچھیا، پُڑیا اور لٹیا وغیرہ۔

۹۔ جو لفظ مفرد صورت میں اِمالہ کو قبول کرتا ہے اگر وہی لفظ مرکب صورت میں مستعمل ہو رہا ہے تو اس سے اِمالہ ساقط ہو جاتا ہے جیسے کعبہ کے بعد اگر حرفِ ربط آرہا ہے تو اِمالہ ہوتا ہے لیکن اگر مرکب صورت میں اس طرح استعمال کیا جائے جیسے ''غلافِ کعبہ کے اوپر'' تو یہاں کعبہ کا اِمالہ نہیں ہوگا۔

۱۰۔ اُردو میں مستعمل فارسی کے اسمِ فاعل، مفعول اور اسمائے صفات میں اِمالہ نہیں کیا جاسکتا جیسے آئندہ، تابندہ، رخشندہ، شنیدہ، دانا، بینا، توانا، گزشتہ اور پیوستہ وغیرہ۔ اگر یہی اسماء کسی مقام کے نام کی صورت اختیار کرلیں تو پھر ان میں اِمالہ آئے گا مثلاً 'تابندہ' ایک مقام کا نام ہے اور جملہ اس طرح ہوگا، ''وہ تابندے سے واپس آرہا ہے۔''

۱۱۔ ایسے توصیفی الفاظ جن کے اخیر میں الف نون اور ہائے خفی (آنہ) کا اضافہ ہوتا ہے ان میں اِمالہ نہیں ہوسکتا جیسے عاشقانہ، جاہلانہ، مجاہدانہ وغیرہ۔ لیکن جن میں یہ لاحقہ نہ ہو بلکہ جُزِ لفظ ہو ان میں اِمالہ ہوتا ہے جیسے دیوانہ سے دیوانے، پروانہ سے پروانے اور جرمانہ سے جرمانے۔

۱۲۔ عربی کے بابِ افعال کے جو مصدر اردو میں مستعمل ہیں اور جن کے آخر میں الف بھی ہے جیسے

اِملا، انشا وغیرہ، ان میں امالہ نہیں ہوتا یعنی الف ''ے'' سے نہیں بدلتا۔ ''املا'' کو لوگ غلطی سے ''اِملے'' لکھتے اور بولتے ہیں مثلاً ''اِملے کی غلطی'' یہ درست نہیں ہے۔ ایسی ہی صورت لفظ ''انشا'' کی ہے۔ ناواقفیت کی وجہ سے لوگ اس کا بھی اِمالہ کردیتے ہیں جیسے ''اِنشے کی کاپی''۔ ایسے بولنا اور لکھنا غلط ہے۔

۱۳۔ عربی کے اسم فاعل اور اسم مفعول میں کوئی تصرف جائز نہیں جیسے مُجتہد، مُفکِّر، مُصطفٰی، مُجتبیٰ، مُرتضٰی وغیرہ[۱۲]

۱۴۔ آدمیوں اور شہروں کے ناموں میں امالہ جائز نہیں ہے جیسے کلوا، چندا۔ شہروں کے ناموں میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ کلکتہ، آگرہ وغیرہ میں امالہ جائز ہے جب کہ بعض کہتے ہیں کہ بوجہ اِسم عَلَم ہونے کے اِمالہ جائز نہیں۔

۱۵۔ ہندی کے الفاظ داتا اور دَیا میں اِمالہ نہیں ہوتا۔

۱۶۔ ہندی زبان کے رشتوں میں اِمالہ نہیں ہوتا جیسے دادا، نانا، چچا، پھوپھا، ابّا، بابا وغیرہ۔

۱۷۔ سنسکرت کے کسی اسم مثلاً دیوتا، راجا، بابا وغیرہ کا اِمالہ نہیں ہوسکتا۔

۱۸۔ واحد اسمائے ذات میں سے جتنے مونث ہیں مثلاً خادمہ، اہلیہ، بیوہ، گڑیا، خالہ وغیرہ، اِن کا اِمالہ نہیں ہوسکتا۔[۱۳]

۱۹۔ جن اسمائے نکرہ کے آخر میں ہائے ہوز (ہ) سے پہلے اَلِف یا واوٗ ہو مثلاً تباہ، شاہ، ماہ، راہ، بیاہ، کوہ وغیرہ اِن کا اِمالہ نہیں ہوسکتا۔

۲۰۔ دریاؤں، پہاڑوں، ملکوں اور صوبوں کے ناموں کا اِمالہ نہیں ہوتا۔

۲۱۔ کسی قوم یا ذات کے ناموں مثلاً خواجہ، راجا، مرزا، چاولہ، شرما وغیرہ کا امالہ نہیں ہوتا۔

۲۲۔ اردو میں مستعمل عربی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں عین ہوتا ہے جیسے مصرع، مقطع، مطبع اور مطلع وغیرہ، اس قسم کے الفاظ میں بحرلکھنوی، عشرت لکھنوی اور نیّر کاکوروی یائے مجہول کے اضافے سے امالہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ عین کو کسرہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان کے برخلاف ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی عبدالحق عین کے بعد امالہ کے لیے یائے مجہول کے اضافے کو بہتر سمجھتے ہیں۔

رشید حسن خان ان لفظوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''برقع، مجمع، مصرع، مطلع، مطبع، مقطع، موقع .... اِن سب لفظوں کو جمع کی صورت میں اور محرف صورت میں ''ے'' کے اضافے کے ساتھ لکھنا چاہیے جیسے

برقعے، مجمعے، مصرعے، مطلع مطبعے، مقطعے، موقعے وغیرہ'' [۱۴]

میری نظر میں، ان تمام مقامات پر جہاں اخیر میں عین آتا ہے، قدیم تحریروں میں عین کے بعد ہائے خفی کا بھی اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس لیے شاید ہائے خفی کو دیکھتے ہوئے ان تمام لفظوں میں اِمالے کے لیے ''ے'' کا اضافہ کیا گیا نیز جمع کے لیے بھی، جس کا استعمال بہت کم نظر آتا ہے۔ جہاں بھی آجاتا ہے وہاں زبان پر بہت مشکل سے رواں ہوتا ہے جیسے قصبے کے وزن پر ضلعے، موقعے اور بُرقعے وغیرہ۔ ان تمام لفظوں میں ''ے'' کا اضافہ بہت ہی گراں گزرتا ہے۔

مرکب توصیفی کا اِمالہ

اُردو ترکیب میں صفت اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے۔ موصوف سے پہلے اگر صفت بھی ''اِلف'' کی آواز پر ختم ہو رہی ہو تو ساتھ اس کا بھی اِمالہ ہو جاتا ہے جیسے:

''موٹا لڑکا بہت تنگ کرتا ہے''

اِمالہ دے کر کہیں گے:

''موٹے لڑکے نے بہت تنگ کیا''

اُردو کے برعکس عربی ترکیب میں صفت اپنے موصوف کے بعد آتی ہے۔ موصوف کا اِمالہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن صفت کا اِمالہ کسی طور پر جائز نہیں۔ کچھ لوگ اِمالے کے دیوانے ہوتے ہیں جو اِسی محبت میں کہہ دیتے ہیں :

۱۔ ''میں مدینے منوّرے جارہا ہوں''

۲۔ ''وہ مکّے مکرّمے سے واپس آیا''

یہاں مدینہ کی صفت منوّرہ اور مکّہ کی صفت مکرّمہ کا اِمالہ منوّرے اور مکرّمے کی صورت میں کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ ''میں مدینہ منورہ جارہا ہوں'' یا ''میں مدینے جارہا ہوں'' درست ہوگا۔ اسی طرح ''وہ مکّہ مکرمہ سے واپس آیا'' یا ''وہ مکّے سے واپس آیا'' درست ہوگا۔

یائے مجہول کے ضمن میں غلط فہمی

جہاں بھی یائے مجہول نظر آئے، اُسے اِمالہ سمجھ لینا سراسر غلطی ہے۔ اس کے محلِ استعمال کون کون سے ہیں اس امر کی وضاحت کرنا ضروری ہے:

۱۔ یائے مجہول کا استعمال اُردو میں سب سے زیادہ جمع بنانے کے لیے آتا ہے جیسے لڑکا سے لڑکے، پیسا سے پیسے، شکوہ سے شکوے، گِلہ سے گِلے وغیرہ۔

۲۔ یائے مجہول کا استعمال اعدادِ لفظی میں وصف کے طور پر بھی آتا ہے جیسے پہلا، پہلے، پہلی ......دوسرا، دوسرے، دوسری...... چھٹا، چھٹے، چھٹی وغیرہ۔ ان تمام مثالوں میں یائے مجہول کا استعمال عددِ وصفی کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

۳۔ اسی طریقے سے ''بعض'' سے مشتق ''بعضے'' کو بھی ہم اِمالہ میں شمار نہیں کر سکتے۔ یہاں پر یائے مجہول کو نکرہ کے معنی پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے کیونکہ ''بعض'' سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوسکتا جو''بعضے'' سے ادا ہو رہا ہے۔

۴۔ اسی طرح ''قدرے'' میں یائے مجہول کا استعمال تناسب کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے جیسے قدرے کم، قدرے زیادہ وغیرہ۔

۵۔ یائے مجہول کا استعمال جمع کے بجائے اظہارِ عظمت کے لیے بھی کرتے ہیں جیسے ''آپ آتے ہیں''، ''آپ کھانا کھاتے ہیں'' وغیرہ۔

''اِمالہ'' کی ایک خودساختہ صورت

بعض لوگ قواعد سے ہٹ کر، اُردو میں ''توسیع'' کا عمل جاری رکھنے کے حق میں ہیں۔ یہ لوگ خود قواعد سے نابلد ہیں اس لیے قواعد کی پابندیوں کو اُردو کی ترقی کے لیے سدِّ راہ تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے اِفتعال اور اِفعال کے وزن پر آنے والے الفاظ کو ادا کرنے کی بابت اپنے طور پر ایک انوکھا اسلوب اپنا لیا ہے۔ وہ اِن الفاظ کو پہلے حرف یعنی اَلف کے کسرہ (زیر) کو فتحہ (زبر) کی طرف اُٹھا کر ادا کرتے ہیں مثلاً اِحتجاج، اِحترام، اِحتیاط اور اِحسان وغیرہ کو اَیحتجاج، اَیحترام، اَیحتیاط اور اَیحسان کے آہنگ میں ادا کرتے ہیں۔ اِس اِختراع کا زیادہ چلن اہلِ پنجاب میں ہے۔ قواعد سے ناآشنا اس عمل کو بھی اِمالہ کہتے ہیں حالاں کہ اِسے اِمالہ سے تعبیر کرنا جہالت کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اِمالہ کے برعکس کوئی دوسرا عمل ہے۔

''اِمالہ'' سے بے اعتنائی کا رویّہ

ایک اہم موضوع ہوتے ہوئے بھی، نہ جانے کیوں امالے سے اتنی بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ ماہرینِ لسانیات کے امالہ پر زور دینے کے باوجود اردو میں اس کا التزام بہت کم دیکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں ممتاز لسان شناس جناب ندیم صدیقی ایک واقعہ لکھتے ہیں:

> ''چند سطروں پہلے ہم نے 'مطلع' کا اِملا مطلعے لکھا ہے۔ جو لوگ قواعد کے طالب علم رہے ہیں وہ قواعد کی ایک اصطلاح 'اِمالے' سے بھی ضرور واقف ہوں گے۔ مندرجہ بالا مطلعے میں اسی امالے کا استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں جوشؔ ملیح آبادی کا

ایک سبق یاد آ گیا، مخاطَب تھے ممتاز جدید شاعر و ادیب احمد ہمیش، جو مطلع اور مطلعے
پر جوشؔ سے بحث پر آمادہ تھے اور امالے سے ناواقفیت کے سبب اڑے ہوئے
تھے۔ جوشؔ نے تنگ آ کر کہا کہ میاں! مثلاً آپ کے دادا جان کو گھڑ سواری کا شوق
تھا اور ایک دن اس شوق نے ان کی جان لے لی تو آپ یہ کہیں گے کہ میرے دادا
گھوڑا سے ِگر کے مر گئے یا کہ میرے دادا گھوڑے سے گر کر مَر گئے۔؟'' [۱۵]

اُردو میں اس ضمن میں بڑا انتشار پایا جاتا ہے جو بول چال میں تو خیر کم ہی ہے لیکن تحریر میں بڑی بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اس انتشار کے اسباب میں ناواقفیت، کم علمی، کاہلی اور زودنویسی قابلِ ذکر ہیں۔ معروف ادیبوں کی تحریروں میں سے چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ ''برسوں کی تحقیق، مطالعہ اور سوچ بچار کے نتیجے اس کتاب میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔''
اِمالے کی رُو سے یہاں ''مطالعہ'' کے بجائے ''مطالعے'' ہونا چاہیے تھا۔

۲۔ ''زبانوں کی اصل یا سرچشمہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔''
یہاں ''سرچشمے'' ہونا چاہیے۔

۳۔ ''زمانہ نے کروٹ بدلی''۔
یہاں ''زمانے'' لکھنا چاہیے تھا۔

۴۔ ''جو حالات لفظ اور لب ولہجہ میں تغیر پیدا کرتے ہیں''۔
''لب و لہجے'' میں فصاحت ہے۔

۵۔ ''ایک طبقہ کے تعلقات دوسرے طبقہ کے ساتھ''
دونوں جگہ ''طبقے'' ہونا چاہیے۔

۶۔ ''ہر میوہ کا کچھ حصہ کھایا جاتا ہے''
یہاں ''میوے'' ہونا چاہیے۔

۷۔ ''اس کتاب میں ضمیمہ کے طور پر اُنھیں شامل کر دوں'' اور ''خواہ وہ قافیہ کی پابند ہو یا نہ ہو''
ان دونوں جملوں میں ''ضمیمے'' اور ''قافیے'' لکھنا چاہیے تھا۔

اِمالہ نہ کرنے کی یہ چند ہی مثالیں ہیں جو اہم ادیبوں کی کتابوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ اِمالے کے ضمن میں انتشار کی بابت جن وجوہ کی نشان دہی کی گئی ہے، بعض کی کارفرمائی اِن مثالوں میں نظر آتی ہے۔ یہاں کاتبوں کو مَوردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مقامات کے ناموں پر اِمالے کا قانون لاگو کرنے یا اُنھیں استثنا دینے کے سلسلے میں کوئی مستند اصول وضع نہیں ہو سکا ہے۔ کچھ ماہرینِ لسانیات مقامات کے ناموں کا اِمالہ کرتے ہیں چنانچہ کوئٹہ، پونا ،اوٹاوہ، سماسٹہ، اوکاڑہ، سرگودھا، چونڈہ، کاہنا کاچھا اور کمالیہ کے بعد اگر حروفِ عاملہ سے، پر، تک، کو وغیرہ آجائیں تو یہ نام کوئٹے ، پونے ،اوٹاوے ، سمے سٹے ،اوکاڑے، سرگودھے، چونڈے ، کاہنے کاچھے اور کمالیے میں بدل جاتے ہیں۔تاہم کچھ زبان دان ان ناموں کا اِمالہ پسند نہیں کرتے اور یوں کہتے ہیں:

''میں کوئٹہ سے آرہا ہوں''

'ذرا اوکاڑہ تک لے چلو'

یہ اندازِ بیان ہمیں پسند نہ بھی آئے تو ہم اعتراض نہیں کر سکتے کیونکہ اِمالہ کا سو فیصد اطلاق اُردو پر نہیں ہوتا۔

رشتے داروں کے ضمن میں بھی ہمیں اِسی مخمصے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ کچھ ماہرینِ لسانیات ابّا ، چچا، تایا، نانا، دادا، پھوپھا وغیرہ کو اِمالہ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں لیکن اہلِ پنجاب ان کا اِمالہ کرتے ہیں اور ''دادے کی جوتیاں''، ''نانے کی بیماری'' اور ''تائے کا لڑکا'' عام سننے کو ملتا ہے۔ بات پنجاب ہی پر ختم نہیں ہوتی خود یُو پی کے بعض حصّوں میں رشتے داری کے الفاظ جب مرکب شکل میں استعمال ہوتے ہیں تو اُن کے پہلے حصّے کا امالہ ہو جاتا ہے جب کہ دوسرا حصّہ جوں کا توں رہتا ہے مثلاً ''دادے ابّا کو بلاؤ''، ''تائے ابّو نے عیدی نہیں بھیجی''، ''نانے ابّا کو تنگ نہ کرو'' وغیرہ۔

میر تقی میر کا ایک شعر ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

مکے گیا مدینے گیا کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسے ہی چل پھر کے آ گیا

اس شعر میں مکہ اور مدینہ کا اِمالہ تو ہوا ہے، لیکن کربلا کا نہیں، حالانکہ اس کے آخر میں الف ہے۔
اِس صورتِ حال پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اِمالہ کا تصور عربی سے اردو میں آیا ہے اور اس کا اطلاق اہلِ اُردو عربی جیسی قطعیت کے ساتھ نہیں کر سکے۔ اس کے قواعد و قوانین پر عمل کر بھی لیا جائے تو اتنے مستثنیات ہیں کہ اُردو کا نو آموز طالب علم، یا فارسی و عربی سے نابلد محض اردو جاننے والا، پریشان ہو جائے گا کہ اِمالہ کی ضرورت کہاں پڑے گی اور کہاں نہیں؟

حواشی اور حوالے

۱۔ بلیاوی، عبدالحفیظ، مصباح اللغات (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)، ص ۸۴۵۔

۲۔ ابنِ باذش، اقناع بحوالہ ''اُردو زبان میں امالہ'' از امیر حمزہ، مشمولہ ماہ نامہ ایوانِ اُردو، شمارہ اکتوبر ۲۰۱۷ء، اُردو اکیڈمی، دہلی (انڈیا)، ص ۴۲۔

۳۔ علی اکبر دِہ خدا، لغت نامہ دِہ خدا، جلد اوّل، مؤسسہ لغت نامہ، تہران (ایران) ۱۳۶۵ھ۔

۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اُردو لغت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء)، ص ۵۳۰۔

۵۔ آسی ضیائی، پروفیسر، درست اُردو (لاہور: ادارہ معارفِ اسلامی، ۱۹۹۹ء)، ص ۸۰۔

۶۔ ....ایضاً............ص ۸۰۔۸۱۔

۷۔ نُور الحسن نیرّ، مولوی، نور اللغات، جلد اوّل (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۷۳۔

۸۔ طالب الہاشمی، اصلاحِ تلفظ و املا (لاہور: القمر انٹر پرائزز، اُردو بازار، ۲۰۰۱ء)، ص ۷۷۔

۹۔ ....ایضاً............ص ۷۸۔

۱۰۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، ''اُردو اِملا کی بے قاعدگیاں'' [مضمون] مشمولہ ماہ نامہ اخبارِ اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، شمارہ جُون ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ خلیق الزّماں، ''اِمالہ'' [مضمون]، مشمولہ فکر و تحقیق، شمارہ ۴، جلد ۱۷، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، دہلی (انڈیا)۔

۱۲۔ نُور اللغات، جلد اوّل، ص ۳۷۳۔

۱۳۔ اِصلاحِ تلفظ و املا، ص ۷۷۔

۱۴۔ رشید حسن خان، اُردو اِملا (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۷ء)، ص ۴۴۱۔

۱۵۔ ندیم صدیقی، پُرسہ، (ممبرا (تھانے۔انڈیا)، اُردو قبیلہ، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۷۷۔

کلمۂ ربط ''سے'' کی معنوی جہتیں

اجزائے کلام صرف تین ہیں......اسم، فعل اور حرف۔ بامعنی لفظ جس میں زمانہ نہ پایا جائے، اسم کہلاتا ہے۔ ضمیر اور صفت، دراصل اسم ہی کی جزوی قسمیں ہیں۔ بامعنی لفظ جس میں کسی کام کا کرنا اور ہونا پایا جائے اور اس میں تین زمانوں میں سے کوئی ایک زمانہ بھی موجود ہو، فعل کہلاتا ہے۔ وہ لفظ جو اسم اور فعل سے ملے بغیر اپنا کوئی مفہوم ادا نہ کرسکے، حرف کہلاتا ہے۔ حرف کی کئی قسمیں ہیں۔ اسے کلمۂ ربط بھی کہتے ہیں۔

کلماتِ ربط از قسم حروفِ جار (کو، نے، میں، پر، سے، تک)، حروفِ اضافت (کا، کے، کی) اور دیگر حروف (کہ، بھی، مگر، لیکن وغیرہ) بظاہر اسم اور فعل سے ربط رکھے بغیر اپنے کوئی معنے نہیں رکھتے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ کلمات اپنے باطن میں دھنک رنگ معنوی جہتیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ شعر اور نثر پارے میں، ان کا ذرا سا تغیر، معنوی رنگ اور مفہوم بدل دیتا ہے۔ جو لوگ ''سے'' کی مختلف معنوی پرتوں اور اس کے نحوی استعمال سے کما حقہٗ شناسا نہیں ہیں، تفہیمِ شعر میں اُلجھن کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس میدان میں مبتدی اور ادیب، دونوں ٹھوکر کھاتے ہیں۔

اُردو زبان وادب میں، اُصول وقواعد کے اعتبار سے، حرفِ جار ''سے'' کے صرفی ونحوی تعملات کی کئی جہتیں ہیں اور ہر جہت سے اس کے معنوی اَبعاد وابستہ ہیں مثلاً 'چُھری سے سبزی کاٹو' میں ''سے'' کا جو محل ہے وہ 'بچہ چھت سے گرا' کے ''سے'' کا ہرگز نہیں۔ 'تم سے اچھا کون ہے؟' اس استفہامیہ جملے میں ''سے'' کے جو معنی مستنبط ہوتے ہیں......وہی معنی 'ملک میں بہت سے کارخانے ہیں' میں موجود ''سے'' سے نہیں لیے جاسکتے۔ گویا جملے کی نحوی ترکیب میں مختلف انداز سے استعمال ہونے والے حرفِ جار ''سے'' کے مختلف معنی ہوسکتے ہیں لیکن ان مختلف الجہات معنوں میں تمیز کرنے کا کوئی مستقل اصول اردو قواعد میں

دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ہم ''سے'' کا استعمال ہونے والے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کر لیں تو ''سے'' کے قوس قزحی خوب صورت رنگ واضح دکھائی دیں گے۔ اردو کے صرف ایک حرف ''سے'' کے لیے عام طور پر انگریزی میں یہ Prepositions استعمال ہوتے ہیں:

from, to, with, by, than, through, along

''سے'' کے استعمال میں بعض مقامات پر ان Prepositions کا مفہوم بھی آ جاتا ہے:

beyond, out of, since, of, for, at

ان کے علاوہ like اور as بھی حرفِ تشبیہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے قواعد نویسوں اور ناقدین نے ان کلمات پر توجہ نہیں دی اور نہ اس نہج پر کام کیا ہے۔ آیئے ''سے'' کے استعمال کی نیرنگیوں پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کی معنی آفرینی پر غور و خوض کرتے ہیں:

آغاز اور ابتدا کے لیے (اشارۂ زمانی)

حرفِ جار ''سے'' ابتدا اور آغاز کے لیے آتا ہے۔ اس سے وقت کا تعین کرنے اور اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے جیسے میں کل سے آپ کی راہ دیکھ رہا ہوں، پرسوں سے رمضان شروع ہو رہا ہے، صبح سے شام تک بارش ہو رہی ہے، قانونِ فطرت ازل سے چلا آ رہا ہے، میں ایک عُمر سے مصیبتیں برداشت کر رہا ہوں وغیرہ۔ وقت کے نشانِ کار کے طور پر ''سے'' کا استعمال غالبؔ کے اس شعر میں بھی ملاحظہ کیجیے:

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی ملے داد
کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

ابتدا اور آغاز کے لیے (اشارۂ مکانی)

کبھی کبھی جگہ کا اندازہ لگانے کے لیے بھی ''سے'' کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے گھر سے نکلے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے، لاہور سے مہمان آئے ہوئے ہیں، وہ دفتر سے جلدی گھر آ گیا وغیرہ۔ مکانی اشارہ گر کی صورت میں ''سے'' کا استعمال غالبؔ کے اس شعر میں بھی ملاحظہ کیجیے:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بیان کے لیے ''کی'' کی جگہ استعمال

جیسے اُسے کھانے پینے، کپڑے پیسے سے کیا کمی ہے۔ عام طور پر اس جگہ ''کی'' ہی مستعمل ہوتا ہے۔

سبب یا علّت کے لیے

حرف ''سے'' جب وجہِ عمل کی نشان دہی کرتا ہے تو وہاں وہ علامتِ علّت گردانا جاتا ہے جیسے غُل سے کان پھٹے جاتے ہیں (یعنی غُل کے سبب)، آپ کی آمد سے خوشی ہوئی، علم سے عزت ملتی ہے وغیرہ۔ اس معنی میں بعض اوقات وجہ، مقصد، اس خیال سے، اس وجہ سے جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

بعض یا بعضیت کے واسطے

''سے'' ایک دوسرے حرف ''میں'' کے ساتھ منجملہ کے معنے دیتا ہے جیسے ہندوؤں میں سے ایک وہ بھی ہے، احمد شریف قوم میں سے ہے وغیرہ۔

''سے'' بمعنی مدد سے، وسیلے سے، ذریعے سے

جیسے سپہ سالار نے سوسواروں سے قلعہ فتح کر لیا، اپنے ہاتھ سے قلم اٹھالو وغیرہ۔

''سے'' کا استعمال علامتِ مفعول کے لیے

جیسے میں نے زید سے کہا۔ اس جملے میں 'میں' فاعل اور زید مفعول ہے۔ اسی طرح میں نے خالد سے پوچھا، میں نے زید سے محبت کی، میں نے اللہ سے دعا کی، میں نے استاد سے عرض کی اور میں نے گستاخ لڑکے سے درگزر کیا وغیرہ۔ ان جملوں میں مفعول کے ساتھ ''سے'' علامتِ مفعول کے طور پر آئی ہے۔

''سے'' بطور سنگ اور معیت

معیت، ہمرہی، سنگ اور مصاحبت کے معنوں میں بھی ''سے'' استعمال ہوتا ہے۔ اس قسم کی ترکیب میں ''سے'' کے معنی ''کے ساتھ'' ہوتے ہیں۔ یہ ترکیب فصیح اور بلیغ نہیں ہے اور نہ روزمرہ، بلکہ عام بول چال کی زبان کا ایک طرز ہے جو اکثر قواعد سے میل نہیں کھاتا مثلاً میں نے سالن سے روٹی کھائی، حامد نے محمود سے بہت اچھا سلوک کیا۔ غالب جیسے شاعر نے بھی اسے برت کر اپنی شاعری میں شعریت پیدا کی ہے:

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبد صورتِ دیوار میں آوے

باہمی اِنفصال (جدائی اور دُوری) کو ظاہر کرنے کے لیے

دو چیزوں میں باہمی انفصال کے اظہار کے لیے ''سے'' کا استعمال کچھ اس طرح سے کیا جاتا ہے کہ دو چیزوں میں جدائی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جیسے گیند ہاتھ سے پھینک دیں، تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا۔

بقول غالبؔ:

ہر قدم دُور ہی منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

علیحدگی اور انتخاب کے معنوں میں

جیسے دس سیبوں میں سے پانچ لے لو، بیس کتابوں میں سے دس پھٹی ہوئی ہیں وغیرہ۔ یہاں زیادہ چیزوں میں سے کچھ کے انتخاب کے نشانِ کار کے طور پر ''سے'' استعمال ہوا ہے۔

تقابُل اور تفوق کے لیے

دو چیزوں کے درمیان تقابل کے لیے ''سے'' کا استعمال حرفِ تفوق کے طور پر بھی کیا گیا ہے۔ ''سے'' کے اس استعمال سے دو چیزوں میں سے ایک کی فوقیت ثابت ہوتی ہے جیسے یہ چیز اُس سے اچھی ہے، ایک سے دو بھلے، زید خالد سے لائق ہے وغیرہ۔ غالبؔ نے اس مناسبت سے حرف ''سے'' کا استعمال اس طرح کیا ہے:

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہاں حرفِ جار ''سے'' کے ذریعے جامِ سفال کو جامِ جم پر فوقیت اور ترجیح دی گئی ہے۔

بعد، پس اور پھر کی جگہ ''سے'' کا استعمال

''سے'' کی معنی آفرینیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ بعد، پس اور پھر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اب سے جھوٹ مت بولنا۔ یہاں ''سے'' کا معنی 'اب کے بعد' ہے۔

''سے'' بمعنی اوپر سے

جیسے وہ کوٹھے سے گرا (یعنی کوٹھے کے اوپر سے)، پھل درخت سے گرا وغیرہ۔

''سے'' بمعنی طرف اور جانب

جیسے مغرب سے ابر اٹھا، وہ پُورب سے چلا وغیرہ۔ یہاں ''سے'' کا مفہوم 'از طرف' اور 'از جانب' ہے۔

''سے'' بمعنی اندر سے

جیسے ہنڈیا سے سالن نکالیں، دیگچی سے گھی نکالیں، صندوق سے کپڑے نکالیں وغیرہ۔ ان تینوں جملوں میں ''سے''، ''کے اندر سے'' کے معنوں میں آیا ہے۔

کثرت اور افراط کے لیے

حرف ''سے'' کثرت مقدار کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے جیسے رنج سے رنج ہیں، وہاں چور سے چور ہیں، اور اُس شہر میں بدمعاش سے بدمعاش ہیں۔ وغیرہ ایک شاعر نے اس مفہوم کو اس طرح باندھا ہے:

ہے مرا داغِ دلِ سوزاں وہ پُر نور آفتاب
جس سے ڈر کر بھاگتا ہے دُور سے دُور آفتاب

(صابرؔ بحوالہ نور اللغات ص:۳۹۹)

''سے'' بطور حرفِ تشبیہ

اُردو زبان و ادب میں ''سے'' کا استعمال بطور حرفِ تشبیہ عام ملتا ہے۔ ''سے'' کو حرفِ تشبیہ مانا جائے تو اس کا معنی ہوگا مثل، مانند، جیسا، موافق، نظیر، مماثل، ثانی، ہمتا، ہمسر، مشابہ، مطابق اور برابر وغیرہ۔ ''کی طرح'' اور ''کی مانند'' کی جگہ ''سے'' کے اس خوب اور موزوں استعمال کو ملاحظہ کیجیے:

ع ہزاروں داغ مرے آفتاب سے چمکے

ناسخ کے اس مصرعے میں آفتاب سے چمکے کا مطلب ہے آفتاب کی طرح چمکے۔ یہاں ''سے'' حرفِ تشبیہ ہے۔

غالبؔ نے ''سے'' کو بطور حرفِ تشبیہ اس طرح استعمال کیا ہے:

سرگراں مجھ سے سبک رَو کے، نہ، رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب، مثلِ صدا جاتا ہوں

یعنی مجھ جیسے سبک رو کے رہنے سے تم سرگراں نہ رہو۔ میں لبوں کی ایک جنبش سے نکلنے والی

آواز کی مانند چلا جاؤں گا۔

'سا'، ''سے'' کی متغیر شکل ہے اور یہ بھی حرفِ تشبیہ ہے۔ یہ فارسی میں ساں اور آسا کا مخفف ہے۔ اس کا معنی بھی مانند، مماثل، مشابہ وغیرہ ہے جیسے تم سا، اُن سا، کالا سا، گورا سا وغیرہ۔ حکیم مومن خان مومن نے ''سا'' کا خوب استعمال کیا ہے:

نجاؤں گا کبھی جنت میں مَیں نجاؤں گا
اگر نہوئے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا

داغ دہلوی کہتے ہیں:

سینے میں اب کہاں وہ جوش وہ بھی تھا اِک اُبال سا
بیٹھ گیا کچھ اُٹھتے ہی چھوڑ گیا خیال سا

'سی' بھی ''سے'' کی ایک متغیر صورت ہے۔ یہ حرفِ تشبیہ مونث کے صیغے میں آتا ہے جیسے ماں سی دشمن نہ ماں سی دوست، یہاں ماں سی کا مطلب ماں جیسی ہے۔

''سے'' بمعنی سمیت:

جیسے میں دس آدمیوں سے وہاں گیا۔ یعنی دس آدمیوں سمیت۔

''سے'' بمعنی حالت میں

جیسے استاد ذوقؔ نے کہا:

چل میکدے میں شیخ بسر کر مہِ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

''تک'' کے ساتھ آنا اور شمول کا فائدہ دینا

کبھی ''سے'' اور ''تک'' دو متضاد چیزوں پر آتے ہیں اور شمول کا فائدہ دیتے ہیں جیسے عالم سے لے کر جاہل تک اور بادشاہ سے لے کر فقیر تک۔

''سے'' بمعنی لے کر

کبھی کسی چیز کے استعمال کرنے کے لیے ''سے'' کو ''لے کر'' کی جگہ بولتے ہیں جیسے غالبؔ نے کہا:

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

''سے'' کا محذوف ہونا

کبھی محاورہ میں حرف ''سے'' محذوف بھی ہوتا ہے جیسے ذوقؔ نے کہا:

لائی حیات، آئے ، قضا لے چلی ، چلے
اپنی خوشی نہ آئے ، نہ اپنی خوشی چلے

''سے'' ربطِ کلام کے لیے

جیسے، ناسخؔ نے کہا: بیعتِ خدا سے مجھ کو ہے بے واسطہ نصیب
دستِ خدا ہے نام مرے دستگیر کا

''سے'' بطور علامتِ صفت

حرف ''سے'' کبھی کبھی علامتِ صفت کا نشان گر بن جاتا ہے اور وہ اسم کی حالت اور کیفیت کی نشان دہی کرتا ہے جیسے فطرت سے کمینہ ، صورت سے بے وقوف ، زبان سے لچر ، عمل سے کورا ، کانوں سے بہرا ، آنکھوں سے اندھا اور زبان سے گونگا وغیرہ۔

''سے'' علامتِ آلہ

حرف ''سے'' کبھی کبھی ذریعۂ فعل (Source of Verb) کی شناخت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے چُھری سے سیب کاٹو، گاڑی پٹرول سے چلتی ہے اور کارخانہ بجلی سے چلتا ہے وغیرہ۔

غالبؔ نے ''سے'' کو علامتِ آلہ کے طور پر اس طرح استعمال کیا ہے:

چشمِ نرگس میں نمک بھرتی ہے شبنم سے بہار
فرصتِ نشوونما ، ساز شکیبائی نہیں

غالبؔ نے چشمِ نرگس میں شبنم کے ذریعے نمک بھرنے پر بہار کا گلہ کیا ہے۔ اس شعر میں ''ذریعہ فعل'' کی نشان دہی کے لیے حرف ''سے'' کو استعمال کیا گیا ہے۔

فعل کی مجہولی ساخت کے لیے ''سے'' کا استعمال

جیسے مجھ سے خط لکھا گیا، طالب علم سے کتاب پڑھی گئی، احمد سے آم کھائے گئے۔ مذکورہ بالا جملوں میں فعل کی معروفی ساخت اس طرح ہوگی میں نے خط لکھا، طالب علم نے کتاب پڑھی، احمد نے آم کھائے۔ فعل کی معروفی ساخت میں ہمیشہ ''نے'' حرفِ جار کا استعمال ہوتا ہے۔

تمیزی حالت

اُردو قواعد میں فعل کی خصوصیت کی نشان دہی کبھی کبھی ''سے'' کے ذریعے بھی کی جاتی ہے جیسے عاشق کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے، تمھیں آم کھانے سے غرض ہے، اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاتی ہے۔ غالبؔ تمیزی حالت کے لیے ''سے'' کو اس طرح استعمال کرتا ہے:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس شعر میں زندگی گزرنے کی حالت کو واضح کیا گیا ہے اور اس وصف کا نشانِ کار ''سے'' ہے۔

''سے'' بطور علامتِ تبادل

اُردو شاعری اور نثر میں، بعض اوقات تبدیلیِ حالات کے بیان میں حرفِ جار ''سے'' اپنے اصل معنی سے ہٹ کر کچھ مختلف معنی دینے لگتا ہے، جیسے: کیا سے کیا ہوگیا، عصا سے اژدہا بن گیا،

ع محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اردو محاوروں میں بھی اس قسم کی تراکیب استعمال ہوئی ہیں جیسے: ٹس سے مس نہ ہونا، آپے سے باہر ہونا، جان سے جانا، جان سے ہاتھ دھونا۔

مندرجہ بالا مثالوں میں حرفِ جار ''سے'' کے ذریعے تبدیلیِ کیفیات کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں کیا گیا ہے۔ یہاں ''سے'' کے وہ معنی قطعی نہیں ہیں جو حرفِ جار ''سے'' سے لیے جاتے ہیں۔

مضمونِ زیرِ نظر میں حرف ''سے'' کی معنوی جہتوں کو تلاش کرنے اور ان سے پیدا ہونے والے تغیرات کا جائزہ لینے کی سعی کی گئی ہے۔ راقم السطور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ''سے'' کی دھنک رنگ جہتوں سے معنوں کے نئے جہان آباد ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان جہانوں کو قریب سے دیکھا جائے اور اُن کی سیر کی جائے۔ یہ تبھی ممکن ہوسکتا ہے کہ فرہنگوں کی موہوم دنیا سے ایسے الفاظ کو نکال کر طبعی دنیا کے حقیقی ماحول میں لایا جائے اور ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔

جمع کے تعلُق سے بعض لِسانی مُغالطے

الفاظ میں ناروا تغیر اور تصرف کر کے، اُردو زبان اور اس کے شعر و ادب کو خارزاروں میں اُلجھایا جا رہا ہے۔ اِس بگاڑ کے سبب، اُردو زبان و ادب کا حلیہ کیسے کیسے عجیب رُوپ دھار رہا ہے۔ فکر و اظہار میں کوئی ربط، رشتہ ناتا اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ شعر و ادب میں راہ پانے والے اس بگاڑ کا احتساب نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ عنقریب اُردو ادب، جو باغ و بہار ادب ہے، ایک اُجاڑ جنگل بلکہ مرگھٹ بن کر رہ جائے گا۔

واحد جمع کا باب، ہر زبان میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ عمومی طور پر ہر زبان میں، واحد کے بعد جمع ہی کا تصور ہے سوائے عربی کے۔ عربی زبان میں واحد اور جمع کے درمیان تثنیہ کا وجود ہے جیسے طرف واحد کے لیے، طرفَین (دو طرفیں) تثنیہ کے لیے اور اطراف جمع ہے۔ تھوڑا سا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اُردو میں عربی نژاد الفاظ تثنیہ کے طور پر بھی بہت مستعمل ہیں جیسے فریقین، والِدَین، طرفَین، جانبَین، کریمَین، حَسَنَین، ذُوالنُّو رَین اور ثَقلَین وغیرہ۔ عربی میں جمع کی دو قسمیں ہیں سالم اور مکسّر۔ یہی جمعیں اُردو میں بھی مستعمل ہیں۔ اُردو میں مستعمل جمع الفاظ کافروں، بالغوں، جاہلوں، ظالموں، مومنوں وغیرہ عربی کے جمع سالم اسماء کافرُون، بالغُون، جاہلُون، ظالمُون اور مُومِنُون کی واضح مثالیں ہیں۔ عربی جمع مکسّر کے اوزان پر سیکڑوں اسم اُردو میں بھی رائج ہیں جن میں سے چند کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

اَفَاعِل:	اکابر، اماکن، اوائل۔	اَفَاعِیل:	اسالیب، اقانیم، اساطیر۔
اَفْعَال:	اخبار، اصنام، اشراف۔	اَفعِلاء:	اقرباء، انبیاء، اصفیاء۔
اَفعِلہ:	امثلہ، ازمنہ، اَدعیہ۔	تَفَاعِیل:	تفاصیل، تفاسیر، تقاریر، تصانیف۔
فِعَال:	کِبار، کِرام، خِصال، نِکات۔	فُعّال:	حُکّام، عُمّال، عُشّاق، خُدّام۔
فعَالِل:	عساکر، کواکب، نوادر۔	فَعَالِلَہ:	اساتذہ، فلاسِفہ، ملائکہ۔

فَعَالِیل: قوانین، اقالیم، صنادید۔ فَعَائِل: عزائم، دلائل، فضائل۔
فُعَل: صُوَر، اُمَم، سُنَن، دُوَل۔ فِعَل: حِصَص، قِصَص، فِتَن۔
فُعُل: کُتُب، مُدُن، رُسُل، صُحُف۔ فُعَلاء: علماء، حکماء، شعراء۔
فُعُول: نفوس، نجوم، نقوش، رسوم۔ فَوَاعِل: حوادِث، موانع، خواتم۔
مَفَاعِل: مجالِس، مساجِد، مواقع۔ مَفَاعِیل: مکاتیب، مضامین، مفاہیم۔

ذیل میں، جمع کے غلط استعمال کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اس بحث میں راقم السّطور کا اپنا لسانی نقطۂ نظر ہے جس پر اختلافی آرا وارِد ہو سکتی ہیں:

''جات'' کے لاحقے سے خود ساختہ جمع

راقم نے بہت غور کیا، لسان شناسوں سے پوچھا اور ادیبوں کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ ''جات'' کے لاحقے سے جمع، آخر کس قاعدے، کُلیے اور قرینے سے بنائی گئی ہے؟ کہیں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ اخباروں، رسالوں سے لے کر تحقیقی کتابوں اور مقالوں تک ''جات'' کے لاحقے سے بنی ہوئی جمع کا راج ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالے بھی مقالہ جات، حوالہ جات، ضمیمہ جات، نتیجہ جات، وثیقہ جات وغیرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ ٹیلی وژن چینلز بھی ''جات'' کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ ٹیلی وژن پر مُندَرجات جو مُندَرَج اور مُندَرَجہ کی جمع ہے اِسے مَندرجات (Mandar Jat) پڑھا جاتا ہے جس سے مندر کی جمع کا شائبہ ہوتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جس طرح مقالہ جات، صدقہ جات اور پُرزہ جات نام نہاد جمع کی مثالیں ہیں اِسی طرز پر مندر کی جمع مندر جات ہے۔ یہ لطیفہ نہیں امرِ واقعی ہے کہ تھانے کا محرّر رپورٹ درج کرتا ہے، ''غنڈے ڈنڈا جات لے کر حملہ آور ہوئے''۔

''جات'' نے ''جاتی'' کا رُوپ دھار کر کئی خرابیاں پیدا کیں۔ ایک ''محقق'' نے کہا، ''میرا مقالہ جاتی کام مکمل ہو گیا ہے۔'' ''حوالہ جاتی'' بھی اِسی بدعت کا شاخسانہ ہے۔ آزاد کشمیر کی آزاد حکومت نے اُردو کو بطور دفتری زبان اِختیار کیا ہوا ہے۔ ایک سرکاری مُراسلے میں یہ لکھا ہوا پڑھا، ''فلاں کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کی جائے گی''۔ سرکار کے نزدیک گویا ''محکمانہ کارروائی'' زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ اس خبر کو بہت دفعہ اخباروں کی زینت بنتے دیکھا، ''حکومت فاضِل (Fazil) پرزہ جات برآمد کرے گی''۔ اس جملے میں ایک تو نام نہاد جمع ''پرزہ جات'' ذہن پر گراں گزرتی ہے دوسرا فاضِل (Fazil) اور فاضَل (Fazal) کا فرق ہر کسی کو معلوم نہیں۔ فاضِل، عالِم کے مفہوم میں ہے جبکہ فاضَل کا معنی ہے فالتو، ضرورت سے زیادہ۔ حکومتِ پنجاب کے ایک اہم محکمے کا نام ''محکمہ جیل خانہ جات'' ہے۔ یہ ترکیب کسی طبّاع اور ذہین و

فطین شخص ہی کی اختراع ہوسکتی ہے۔ جیل کے ساتھ خانہ کا اضافہ، جو لفظی اور معنوی تکرار کی بھی مثال ہے، ''ذہانت وفطانت'' کا شاہکار ہے۔ آخر میں جات کے اضافے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

آیئے! ''جات'' سے بنی کچھ نادِر جمعیں ملاحظہ کیجیے جو اُردو زبان و ادب میں ''گراں قدر'' اضافہ ہے:

''آلہ جات، ادارہ جات، باغیچہ جات، پارچہ جات، پُرزہ جات، جیل خانہ جات،
حوالہ جات، شعبہ جات، صحیفہ جات، صدقہ جات، صوبہ جات، ضمیمہ جات،
علاقہ جات، فیصلہ جات، کمرہ جات، محکمہ جات، مدرسہ جات، مسالہ جات،
مقابلہ جات، مقالہ جات، مقدمہ جات، منصوبہ جات، موضع جات، میوہ جات،
نتیجہ جات اور وثیقہ جات وغیرہ۔''

اِن نام نہاد جمعوں کے مقابل، اُردو میں پہلے سے مستعمل عمدہ اور موزوں جمعیں موجود ہیں جیسے آلات، صحائف، صدقات، ضمائم، مدارس، مقالات، نتائج، وثائق، ادارے اداروں، پُرزے پرزوں، حوالے حوالوں، شعبے شعبوں، صحیفے صحیفوں، علاقے علاقوں، فیصلے فیصلوں، محکمے محکموں، مسالے مسالوں، مقابلے مقابلوں، مقدمے مقدموں، منصوبے منصوبوں، میوے میووں وغیرہ۔

اِن عمدہ، موزوں اور بامعنی جمعوں کے ہوتے ہوئے جات کے لاحقے سے مُتشکِّل نام نہاد جمعیں غیر ضروری، ناروا اور غیر مانوس ہیں۔ فارسی کے قاعدے کے مطابق ''ہا'' کے لاحقے سے بنی جمع بھی اُردو میں مستعمل ہے جیسے شعبہ ہائے زندگی اور میوہ ہائے رنگا رنگ وغیرہ۔ تن ہا (تنہا) بھی فارسی قاعدے کے مطابق جمع ہے لیکن بدقسمتی سے اُردو میں آ کر تنہائی بلکہ یکتائی کا شکار ہوگئی ہے۔

شعاع، خزاں اور کہکشاں کی جمع

آج کل شاعری میں شعاؤں، خزاؤں اور کہکشاؤں کو شعاع، خزاں اور کہکشاں کی جمع کے طور پر باندھا جا رہا ہے۔ کئی ادیب اور مصنف بھی اپنی نثر میں شعاؤں، خزاؤں اور کہکشاؤں ہی رقم کر رہے ہیں۔ تشویش اس امر کی ہے کہ اُن کا دھیان قواعد اور لسانی نزاکتوں کی طرف نہیں جاتا۔ شعاع عربی لفظ ہے جس کا آخری حرف عین حرفِ اصلی ہے۔ جمع بناتے ہوئے اس عین کو کسی طور پر بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا نہ ہی اِسے ہمزہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اُردو قاعدے کے مطابق اس کی جمع شعائیں اور شعاؤں نہیں، شعاعیں اور شعاعوں ہوگی۔ اب خزاں اور کہکشاں کی طرف آتے ہیں۔

ایک شاعرہ کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

میں کہکشاؤں کو تسخیر کر دکھاؤں گی
اگر وہ ایک ستارہ میرے مدار میں ہو

راقم کی ناقص رائے میں، کہکشاں کی جمع کہکشاؤں اور خزاں کی جمع خزاؤں درست نہیں ہے۔ قاعدے کے مطابق 'نُون' یا 'نُون غُنّہ' پر ختم ہونے والے اسماء کی جمع بنانے کے لیے، اُس 'نُون' یا 'نُون غنہ' کے بعد 'واؤ نُون' کا اضافہ کرنا پڑے گا جیسے مجنون سے مجنوؤں نہیں مجنونوں، مکان سے مکاؤں نہیں مکانوں، ایوان سے ایواؤں نہیں ایوانوں، کسان سے کساؤں نہیں کسانوں، نادان سے ناداؤں نہیں نادانوں، دُکان سے دُکاؤں نہیں دُکانوں، اذان سے اذاؤں نہیں اذانوں، فغاں سے فغاؤں نہیں فغانوں اور آسمان سے آسماؤں نہیں آسمانوں ہوگا۔ اس قاعدے کُلیے کے تحت خزاں سے خزانوں اور کہکشاں سے کہکشانوں درست تصور کیا جائے گا۔

کبھی کبھی مصنوعی طور سے ایجاد کردہ کوئی غلط چیز ایسے چل پڑتی ہے کہ آدمی حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ خزاؤں اور کہکشاؤں کو خزاں اور کہکشاں کی جمع کے طور پر استعمال کرنا جہالت کے ساتھ ساتھ جدّت طرازی کا بھی شاخسانہ ہے۔ ایسی حرکت لغت اور قواعد کی شکست و ریخت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ خزاں اور کہکشاں اس قبیل کے لفظ نہیں ہیں جس کے تحت وفا سے وفاؤں، جفا سے جفاؤں، دوا سے دواؤں، ناخدا سے ناخداؤں، آشنا سے آشناؤں، ہوا سے ہواؤں، گھٹا سے گھٹاؤں اور صدا سے صداؤں اسمائے جمع آئیں۔ یہ اسمائے جمع جن واحد اسموں یعنی وفا، جفا، دوا، ناخدا، آشنا، ہوا، صدا اور گھٹا سے بنے ہیں اُن کے آخر میں نون نہیں ہے۔

خزاؤں اور کہکشاؤں کے حق میں جدّت طرازوں کا یہ گروہ دلیل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ماں کی جمع ماؤں کیسے ہوگئی؟ یہاں تو نون غنہ موجود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ماں عربی اور فارسی کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہاں کا مقامی لفظ ہے۔ ہندی نژاد ایسے کئی اور الفاظ بھی ہیں جن کی جمع ماؤں کی طرح آتی ہے مگر اُردو میں مستعمل فارسی اور عربی کے الفاظ کی جمع ایسے نہیں آتی۔ اِن جدّت طرازوں سے استفسار کیا جاسکتا ہے کہ اگر اُن کے نزدیک ماں کی جمع ماؤں درست ہے تو کیا اُنھوں نے کبھی دکان کی جمع دکاؤں، اذان کی جمع اذاؤں، فغاں کی جمع فغاؤں اور آسمان کی جمع آسماؤں اپنے کانوں سے سنی یا آنکھوں سے پڑھی ہے؟ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ خزاں کی جمع خزاؤں، خزانہ کی جمع خزانوں سے الگ کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خزانہ کی جمع ویسے تو خزائن ہے لیکن اگر اُردو کے قاعدے کے مطابق

خَزانوں لائیں گے تو یہ 'خ' کی فتحہ (زبر) سے ہوگا اور خزاں کی جمع 'خ' کے کسرہ (زیر) سے یعنی خِزانوں۔

کسی مروّج غلطی کا دروازہ بند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کہکشاؤں اور خزاؤں کی گردان کرنے والے شاعر اور نثر نگار لغت اور قواعد کے خلاف چلنے پر بضد ہیں۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ ''جان'' کی جمع ''جاؤں'' اور ''انسان'' کی جمع ''انساؤں'' لکھیں گے۔

ہر لفظ کی جمع نہیں بنائی جا سکتی

ہر لفظ کی جمع نہیں بنائی جا سکتی لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں، ہر لفظ کی جمع بنانے کی نہ جانے کیا ضرورت آن پڑتی ہے۔ ایک صاحب نے ''بے سکونیوں'' لکھ کر ہمارے سکون کی جھیل میں کنکر نہیں پتھر دے مارا۔ کتنے ہی ایسے الفاظ ہیں جن کی جمع لانا درست نہیں جیسے سوچ، غیرت، احساس، مرضی، فصاحت، بلاغت، نفاست، ذکاوت، حراست، قساوت اور طلاقت وغیرہ۔ یہ اسما اگرچہ واحد ہیں لیکن جمع کے مفہوم کو بھی واضح کرتے ہیں۔ سوچ سے سوچوں اور سوچیں، غیرت سے غیرتوں اور غیرتیں، احساس سے احساسات، مرضی سے مرضیوں اور مرضیاں، فصاحت سے فصاحتوں اور فصاحتیں، بلاغت سے بلاغتوں اور بلاغتیں، نفاست سے نفاستوں اور نفاستیں، ذکاوت سے ذکاوتوں اور ذکاوتیں، حراست سے حراستوں اور حراستیں، قساوت سے قساوتوں اور قساوتیں اور طلاقت سے طلاقتوں اور طلاقتیں بنانا غیر فصیح اور غیر مانوس ہے نیز ذوقِ سلیم کے خلاف بھی۔

ایک ادیب نے لکھا، ''یہ بات ازلوں سے چلی آ رہی ہے۔'' اُنھیں نہیں معلوم کہ ازل صرف ایک ہے، وہ لا تعداد ازل سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح ایک کالم نویس نے لکھا، ''یہ رویّہ تفریقیاں اور تقسیمیاں پیدا کرتا ہے۔'' وہ تقسیم سے تقسیموں، تقسیمیں، تقسیمیاں اور تفریق سے تفریقوں، تفریقیں اور تفریقیاں گوارا کر سکتے ہیں مگر زبان کی نزاکتیں سمجھنے والوں کے لیے گوارا نہیں۔ ایک صاحب نے اپنی (ادبی) عبارت میں اِستعمالات اور تلفّظات لکھ کر ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔

اُردو قاعدے سے خلافِ قرینہ جمع الجمع بنانا

آج کل، اُردو میں مستعمل عربی اسما کی جمع کو، خود ساختہ اردو قاعدے سے جمع الجمع بنانے کا غلط رجحان بڑھ رہا ہے جو قواعد سے کھلم کھلا انحراف ہے۔ ورقی اور برقی ذرائع ابلاغ پر آئے روز ایسے تماشے ہوتے رہتے ہیں جیسے علماء سے علماؤں، اعمال سے اعمالوں، شعرا سے شعراؤں، اشعار سے اشعاروں، اقالیم سے اقالیموں، اشخاص سے اشخاصوں، مہاجرین سے مہاجرینوں، سلاطین سے سلاطینوں، الفاظ سے

الفاظوں ،مواقع سے مواقعوں، مکاتب سے مکاتبوں،اسباب سے اسبابوں اور اسبابات، تجاویز سے تجاویزات اور تجویزات اور واقعات سے واقعاتوں وغیرہ۔ اُردو میں ہم نہایت آسانی سے انھیں عالموں، شاعروں ،شعروں ، اقلیموں ،شخصوں ، مہاجروں ، سلطانوں ،لفظوں ،موقعوں اور واقعوں لکھ اور بول سکتے ہیں۔

اُردو کے معروف شاعر جناب بشیر بدر کی یادداشت آج کل بہت کمزور ہو چکی ہے۔ اُن کی اس حالت کے بارے میں ایک دستاویزی پروگرام نشر کیا گیا۔ پروگرام کے میزبان نے کہا ''الفاظوں کا جادوگر لفظوں کا محتاج ہوا چاہتا ہے۔''

اُردو میں بعض الفاظ کی جمع بطور واحد استعمال ہوتی ہے۔ ہم اپنی نادانی اور نافہمی سے انھیں جمع بنانے کی سعیِ مذموم کرتے ہیں حالانکہ ان کو بطور جمع استعمال کرنا زبان کے مزاج کے خلاف ہے جیسے کائنات سے کائناتوں، اخلاق سے اخلاقوں، واردات سے وارداتوں، اولاد سے اولادوں، خیرات سے خیراتوں اور رعایا سے رعایوں وغیرہ۔

بعض اسما کی جمع ''یات'' لگا کر بنانے کا رواج چل نکلا ہے حالانکہ پہلے سے اُن کی جمع عربی اور اردو، ہر دو قاعدوں کے مطابق اُردو میں مستعمل ہے مثلاً شکل سے اشکال اور شکلیں شکلوں، قسم سے اَقسام اور قِسمیں قِسموں، لفظ سے الفاظ اور لفظوں، جسم سے اجسام اور جسموں، کتاب سے کتب اور کتابیں کتابوں، دوا سے ادویہ اور دوائیں دواؤں، معنی سے معانی اور معنے معنوں، نعت سے نعوت اور نعتیں نعتوں، لُغت سے لُغات اور لُغتیں لُغتوں وغیرہ۔ آج کل بغیر سوچے سمجھے شکل سے شکلیات، قسم سے قسمیات، لفظ سے لفظیات، حیات سے حیاتیات، جسم سے جسمیات، کتاب سے کتابیات، دوا سے ادویات، معنی سے معنیات، نعت سے نعتیات، لُغت سے لُغتیات، اُردو سے اُردویات، غزل سے غزلیات اور ہزل سے ہزلیات جمع بنائی جارہی ہے۔ معروف ادیب، نقاد اور مترجم محمد سلیم الرحمٰن نے حیاتیات (Biology) کی اصطلاح پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ حیاتیات سے ''ح'' کو الگ کردیں تو باقی ''یات یات'' بچتا ہے۔ بولی، جو عربی اور فارسی لفظ نہیں ہے، خالص اُردو لفظ ہے، اس کی جمع بولیات لکھنے اور سننے میں ہمیں مل رہی ہے۔

ترکی، فارسی اور ہندی الفاظ کی عربی قاعدے کے مطابق جمع بنانے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ ایسی جمعیں قاعدے اور قرینے سے ہٹ کر ہیں لیکن اُردو میں یہ مروّج ہو چکی ہیں اور اب انھیں کوئی شریف آدمی بدل نہیں سکتا جیسے مُہر (Stamp) سے مواہیر (Stamps)، نرخ (Rate) سے انراخ، آلائش سے آلائشات، مغز سے مغزیات، سفارش سے سفارشات، نگارش سے نگارشات، پیغام سے پیغامات،

فرمان سے فرامین، کھنڈر سے کھنڈرات، جنگل سے جنگلات اور گلی سے گلیات وغیرہ۔

جمع کی کفالت کرنے والے واحد اسما

لکھنے اور عام بول چال میں، قاعدے کے مطابق اور موقع محل کی مناسبت سے، واحد اسما جو جمع کی کفایت کرتے ہیں، اُنھیں خواہ مخواہ جمع بنا کر جملے میں استعمال کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل زبان کو ناروا اور غیر مانوس بنا دیتا ہے جیسے:

۱۔ اس کا بھائی تین مہینوں سے لاہور میں ہے۔(درست: تین مہینے سے)

۲۔ چھے دنوں تک کام مکمل ہو جائے گا۔ (درست: چھے دن تک)

۳۔ اس نے صرف چار گھنٹوں میں مضمون لکھ لیا۔(درست: چار گھنٹے میں)

۴۔ طالب علم نے یہ کتاب سات روپوں میں خریدی۔ (درست: سات روپے میں)

۵۔ یہ مقالہ دو سو صفحوں یعنی سو ورقوں پر مشتمل ہے۔(درست: یہ مقالہ دو سو صفحے یعنی سو ورق پر مشتمل ہے۔)

۶۔ یہ کام دس سالوں کی کوشش کے بعد مکمل ہوا۔ (درست: دس سال کی)

۷۔ چھے ہفتوں کی مسافت ہوائی جہاز بائیس گھنٹوں میں طے کر لیتا ہے۔(درست: چھے ہفتے کی مسافت ہوائی جہاز بائیس گھنٹے میں طے کر لیتا ہے۔)

بعض ترکیبوں کی نامناسب اور غیر موزوں جمع

ہمارے ہاں آج کل بعض ترکیبوں کی جمع نامناسب اور غیر موزوں طریق پر بنائی جا رہی ہیں۔ یہ امر خلافِ قواعد ہے، کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

مکتوب اِلَیہوں

مکتوب (بروزن مفعول) خط یا مُراسلے کے معنوں میں رائج و مستعمل ہے۔ جس شخص یا ادارے کو خط یا مُراسلہ یعنی مکتوب ارسال کیا جائے، اسے مکتوب الیہ کہا جاتا ہے جس کی جمع مکتوب اِلَیہِم ہونی چاہیے۔ مکتوب اِلَیہِم کی جگہ مکتوب الیہوں لکھنا خلافِ قواعد ہے کیونکہ عربی لفظ اِلَیہ کی جمع اِلَیہوں (بہ ترکیبِ اُردو) روا نہیں۔

شیخ الاسلاموں کی اولادوں نے بہت ترقی کی

ایک ادیب کے لکھے ہوئے اس جملے میں جمع شیخ کی درکار ہے، اسلام کی نہیں۔ ''اولادوں'' بھی محلِ نظر ہے۔ یہ جملہ بڑی آسانی سے اس طرح ادا ہو سکتا ہے: ''شیوخِ اسلام کی اولاد نے بہت ترقی کی۔''

دارالمطالعوں

اس ترکیب میں دار کی جمع مطلوب ہے مطالعہ کی نہیں۔ ''دیارالمطالعہ'' لکھنے اور بولنے میں اگر غیر مانوس ہے تو ''مطالعہ گاہوں'' اور ''مطالعہ گاہیں'' کے لکھنے اور بولنے میں کیا مشکل ہے؟

فارغ البالوں

یہاں فارغ کی جمع مطلوب ہے نہ کہ البال کی۔ فارغ البالوں کی جگہ ''فارغ البال لوگوں'' کہنا اور لکھنا آسان ہے اور فصیح بھی۔

فارغ التحصیلوں

یہاں بھی فارغ کی جمع مطلوب ہے التحصیل کی نہیں۔ فارغینِ تحصیل اگر کہنا اور لکھنا مشکل ہے تو ''فارغ التحصیل لوگوں'' کہنا تو بہت آسان ہے۔

دارالعلوموں

دارالعلوم (علوم کا گھر) ایسی عظیم درس گاہ کے لیے مستعمل ہے جہاں بہت سے علوم کی تعلیم وتدریس کا خاطر خواہ انتظام ہو۔

اُردو طریقِ وحدت وجمع کے تحت ''العلوم'' کی جمع ''العلوموں'' بنانا خلافِ قواعد ہے کیوں کہ علم کی جمع لفظ ''علوم'' کی صورت میں پہلے ہی موجود ہے۔ یہاں ''دار'' کی جمع درکار تھی اور وہی حاصل نہ ہو سکی۔ مفہومِ سخن کا تقاضا ہے کہ یہاں دیارالعلم یا مدارس العلوم یا عظیم درس گاہوں یا مراکزِ علم یا علمی مراکز جیسی کوئی ترکیب لائی جائے۔

غریب الوطنوں/ہم وطنوں

غریب الوطن اور ہم وطن چوں کہ بالترتیب عربی اور فارسی ترکیبیں ہیں لہٰذا جمع بنانے کے لیے ان میں سے کسی کے ساتھ بھی ہندی، اُردو طرز پر واؤ+نون کا اضافہ کرنا مناسب نہیں۔ ان دونوں مثالوں میں وطن کی جمع مقصود نہیں اس لیے غریب الوطنوں کی جگہ غریب الوطن لوگوں یا پردیسیوں اور ہم وطنوں کی جگہ اہلِ وطن با آسانی لکھا جا سکتا ہے۔

طالبِ علموں

اس ترکیب میں بھی طالب کی جمع مقصود ہے علم کی نہیں۔ اگر طلبہ یا طلباء کہا اور لکھا جائے تو با آسانی کام چل سکتا ہے۔

دو کے عدد کے ساتھ جمع مکسّر کا غلط استعمال

لکھنے اور بولنے میں دو کے عدد کے ساتھ جمع مکسّر معدود نہیں آ سکتا، واحد ہی آئے گا۔ اس اعتبار سے ذیل کے جملے غلط تصور کیے جائیں گے:

۱۔ میں نے آپ کو دو مضامین بھیجے۔

۲۔ جلسے میں تنظیم کے دو ارکان ہی شامل ہوئے۔

۳۔ میاں محمد بخش اور علاّمہ اقبال دو عظیم شعرائے کرام ہیں۔

(اس جملے سے عظیم اور کرام کو اکٹھے نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دونوں میں معنوی مناسبت ہے۔ دونوں کو اکٹھا کرنا لفظی اور معنوی تکرار کا باعث بنے گا۔)

مندرجہ بالا جملوں کے بجائے درست جملے اس طرح ہوں گے:

۱۔ میں نے آپ کو دو مضمون بھیجے۔

۲۔ جلسے میں تنظیم کے دو رکن ہی شامل ہوئے۔

۳۔ میاں محمد بخش اور علامہ اقبال دونوں عظیم شاعر ہیں۔

البتہ دو کتب کی جگہ دو کتاب نہیں، دو کتابیں آئے گی۔

یہ ترکیبیں مروّج ہیں مگر۔۔۔

(ایک لسانی نقطۂ نظر)

زبان کا معاملہ بھی عجیب وغریب ہے۔ یہ ایسے دریا کی مانند ہے جسے بند باندھ کر روکا نہیں جاسکتا، بعینہٖ زبان میں تغیر کے عمل کو روکنا ممکن نہیں۔ پہاڑوں سے اُترتے ہوئے دریا کا پانی، اپنے اندر قیمتی کیمیائی اجزاء جذب کرتا جاتا ہے۔ میدانی علاقوں میں پہنچ کر، کناروں پر اُگی جڑی بوٹیوں کا رس بھی اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں جابجا کثافتیں بھی شامل ہوتی رہتی ہیں۔ یہی حال زبان کا ہے کہ اس کی شریانوں میں بھی معاشرتی رس گردش کرتا ہے۔ معاشروں کی ارفع سوچ اور اخلاقی پستی کے اثرات اس پر بھی مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ معاشرت کی اکھاڑ پچھاڑ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں خوشگوار اور ناگوار، دونوں طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ہر زندہ زبان تغیر آشنا ہوتی ہے اور یہی تبدیلی اُس کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ زبان میں تبدیلی کی وجوہ میں سے ایک وجہ ''لاعلمی'' بھی ہے۔ بتقاضائے جہالت، بعض اوقات زبان میں عجیب وغریب تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اگر وہ لگاتار استعمال میں آتی رہیں تو وہی جہالت اور لاعلمی زبان کا حصہ بن جاتی ہے اور زبان کی تبدیلی کا باعث ہوتی ہے۔

اُردو زبان وادب میں کچھ ایسی ترکیبیں راہ پا چکی ہیں جو مسلّمہ قواعد سے میل نہیں کھاتیں۔ اُن کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ غلط العام کی ذیل میں آ چکی ہیں۔ ادیب اور شاعر بے دریغ انھیں شعر ونثر میں استعمال کر رہے ہیں لیکن یاد رہے کہ ایک حسّ کا نام ہے ''ذوقِ سلیم''...... جو ہر کسی کے حصے میں نہیں ہے۔ اِن تراکیب کو سُن اور پڑھ کر یہی ذوقِ سلیم مجروح ہوتا ہے۔ ادبی اور لسانی مذاق رکھنے والے، ایسی ترکیبوں کو قطعاً روا نہیں رکھتے۔ قواعد سے اس انحراف کی وجہ، سوائے لاعلمی اور زُود نویسی کے، کچھ نظر نہیں آتی۔ علم تو مومن کی گمشدہ میراث ہے، یہ کہیں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے مگر کم علمی سے علم کو

بدلا نہیں جا سکتا۔

کچھ ایسی ترکیبوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے ہاں تحریر و تقریر کے میدان میں مروّج ہو چکی ہیں لیکن ذوقِ سلیم رکھنے والے حضرات انھیں ناپختہ اِظہار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے اُردو کے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے ادبی سرمائے میں میں مرکب اضافی زیادہ تر بتر کیبِ فارسی ہی ملتا ہے البتہ کہیں کہیں بترکیب عربی کی مثالیں بھی نظر آجاتی ہیں جیسے حُبِّ وطن بترکیبِ فارسی ہے اور حُبُّ الوطن بترکیبِ عربی۔ زیادہ تر مثالیں فارسی ترکیب کی ملتی ہیں جیسے اِنتشارِ ذہن، لذّتِ ذہن، سکونِ ذہن، تہذیبِ نفس، اوائلِ عُمر، نقلِ مکاں، دِقّتِ نظر، تہذیبِ مغرب اور احکامِ شاہ (شاہی احکام) وغیرہ۔ زبان کی تخریب نے حُبِّ وطن (وطن کی محبت) کو پہلے حُبِّ وطنی (وطنی کی محبت) میں تبدیل کیا پھر وطنی پر لامِ تعریف (اَل) کا اضافہ کرکے حُبّ الوطنی کی ترکیب وضع کرڈالی۔ یاد رہے کہ اساتذہ کے کلام اور اعلیٰ ادبی نثر میں آپ کو حُبِّ وطن کے بجائے حُبِّ وطنی یا حُب الوطنی نظر نہیں آئے گا۔ اسی طرح اِنتشارِ ذہنی، لذّتِ ذہنی، سکونِ ذہنی، تہذیبِ نفسی، اوائلِ عمری، نقلِ مکانی، دقّتِ نظری، تہذیبِ مغربی اور احکامِ شاہی کی مُخرّب اور متغیر صورتیں ہمیں آج کل نظر آرہی ہیں۔ ایسی کچھ ترکیبوں کا تجزیہ اور وضاحت ملاحظہ کیجیے:

اُولُواالعزمی: عام طور پر ہمارے ہاں یہ جملہ بولا جاتا ہے "فلاں نے اس معاملے میں اولواالعزمی کا مظاہرہ کیا۔" یہاں اولواالعزمی کو عزیمت و استقامت کے معنوں میں لیا گیا ہے۔ اُولُوا، عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ جمع ہے اور جنس کے اعتبار سے مذکر۔ اِس کے معنی ہیں 'والے'، 'مالک' اور 'صاحب'۔ اس سے مرکب اضافی کی ترکیب تشکیل پاتی ہے جیسے اُولواالابصار (صاحبانِ بصیرت)، اُولواالالباب (عقل مند) اُولُواالامر (صاحبان حکم) اور اُولوا العلم (صاحبانِ علم) وغیرہ۔ اِسی طرح اُولواالعزم کا مطلب ہے باہمت، فراخ حوصلہ، صاحبانِ ارادہ اور استقامت اختیار کرنے والے۔ عزیمت، استقامت اور ہمت کے معنوں کے لئے ایک ترکیب "اُولواالعزمی" وضع کر لی گئی ہے جو قاعدے کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔ اس ترکیب کو جانچنے کے لیے اگر اولواالامر سے اولوا لامری، اولواالابصار سے اولواالابصاری اور اولواالعلم سے اولواالعلمی بنا کر غور کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اولواالامری اولواالابصاری اور اولواالعلمی حکم، بصیرت اور علم کے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتے۔ بعینہٖ اولواالعزمی بھی عزیمت اور ہمت کے معنوں میں استعمال نہیں ہوسکتا۔

اُولُو االعلمی: اولواالعزمی کی طرح اولواالعلمی بھی ایک غلط ترکیب ہے۔جس طرح اولواالعزمی عزیمت و استقامت کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوسکتی بعینہٖ اولواالعلمی ''علم'' کے معنی کے لیے ایک غلط ترکیب ہے۔

انتشارِ ذہنی: صحیح ترکیب انتشارِ ذہن ہے یعنی ذہن کا انتشار اور پراگندگی، یا پھر آسان انداز میں ذہنی انتشار کہہ لیا جائے تو بھی درست ہوگا۔

اوائلِ عُمری: اوائلِ عمری کے بجائے درست ترکیب اوائلِ عمر ہے۔اوائل، اوّل کی جمع ہے اور اوائلِ عمر کا مطلب ہے عمر کا ابتدائی حِصّہ۔

تہذیبِ نفسی: تہذیبِ نفسی نہیں بلکہ تہذیبِ نفس ہے جس کا مطلب ہے نفس کی تہذیب کرنا، تزکیہ اور باطنی صفائی۔اسے انگریزی میں کیتھارسس (Catharsis) کہتے ہیں۔

حُبّ الوطنی: حُب الوطنی کے بجائے حُبُّ الوطن عربی میں اور حُبِّ وطن فارسی میں مرکب اضافی ہے اور قواعد کے لحاظ سے یہی درست ہے۔قدماء کی نظم ونثر اور ادبِ عالیہ میں حُبّ الوطنی کے بجائے حُبِّ وطن ہی زیادہ تر مذکور ہے۔

بیش قیمتی سرمایہ: لکھنے اور بولنے میں غلطی کی جاتی ہے کہ ''اُس نے اپنے کاروبار میں بیش قیمتی سرمایہ صرف کیا''۔بیش قیمتی کے بجائے بیش قیمت سرمایہ ہوتا ہے یعنی بھاری قیمت کا سرمایہ۔

لذّتِ ذہنی: ترکیب لذّتِ ذہنی نہیں، لذّتِ ذہن ہے یعنی ذہنی لذّت اور عیّاشی۔

سکونِ ذہنی: اِسی طرح سکونِ ذہن ہوتا ہے، سکونِ ذہنی نہیں البتہ ذہنی سکون کہہ لیں تو زیادہ بہتر ہے۔

ہمہ جہتی ترقی: ایک جملہ نظر سے گزرا ''یہ سب کچھ ہمہ جہتی ترقی ہی سے ممکن ہوسکتا ہے۔'' یہاں جہت کے ساتھ یائے معروف کی ضرورت نہیں تھی۔درست ترکیب ہمہ جہت ہے ہمہ جہتی نہیں۔

نقلِ مکانی: درست ترکیب نقلِ مکاں (بترکیبِ فارسی) ہے یعنی ایک مقام سے دوسری جگہ جانا۔ مکان تبدیل کرنا۔

سحرالبیانی: ''سحرالبیانی'' کے بجائے ''سحر بیانی'' درست ہے، بیانی پر اَل نہیں آئے گا۔یہ سحرِ بیان کا اسمِ کیفیت ہے اور اس کا معنی ہے فصاحت و بلاغت، خوش بیانی وغیرہ۔

دِقّتِ نظری: دِقّتِ نظری کے بجائے دِقّتِ نظر ہے جو بترکیبِ فارسی متشکل ہوا ہے۔اس کا معنی ہے غور وخوض، نظر کی باریکی اور باریک بینی وغیرہ مثلاً ''میں نے یہ مضمون دقّتِ نظر سے پڑھا۔''

شریف النفسی: شریف النفسی شرافت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ ترکیب درست نہیں ہے۔

یہ شریف النفس (شریف طبع۔ نیک طبیعت) سے غلط طور پر وضع کی گئی ہے۔ شریف النفسی کے بجائے ''شرافتِ نفس'' کی ترکیب ہی قواعد کے مطابق ہے۔

وسیع القلبی: وسیع القلب (کُھلے دل والا) سے وضع کردہ ترکیب وسیع القلبی درست نہیں ہے۔ اس کے بجائے وُسعتِ قلب ہی درست ترکیب ہے۔

کثیرالازدواجی: کثیر الازدواج کا معنیٰ ہے جس کی زیادہ شادیاں ہوں۔ اس سے کثیر الازدواجی ایک غلط اور وضعی ترکیب ہے جس کا معنی لیا جاتا ہے زیادہ شادیاں کرنا۔ اس مفہوم کے لیے کثرتِ ازدواج کی ترکیب ہی درست ہے۔

کثیرالجہتی: کثیر الجہت کا معنی ہے زیادہ جہتیں رکھنے والی کوئی شے یا کوئی معاملہ۔ اس کا اسمِ کیفیت کثیر جہتی ہے نہ کہ کثیر الجہتی۔

عدیم الفرصتی: یہ ترکیب عدیم الفرصت (وہ جسے بالکل فرصت نہ ہو) سے وضع کی گئی ہے۔ عدیم الفرصت سے اسمِ کیفیت ''عدیم الفرصتی'' کی صورت میں بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مفہوم کا متبادل اور درست ترکیب عدمِ فرصت زیادہ بہتر ہے۔

وسیع الخیالی: درست ترکیب وسعتِ خیال ہے۔

سقیم الحالی: سقیم الحال (ناتواں، کمزور اور مریض) سے اسم کیفیت، ''سقیم الحالی'' بنانے کی سعیِ ناتمام کی گئی ہے۔ راقم کے نزدیک اس مفہوم کے لیے ''حالتِ سُقم'' ہونا چاہیے۔ ''سقیم حالی'' بھی گوارا ہے مگر سقیم الحالی بالکل نہیں۔

منکسر المزاجی: اس بھاری بھرکم ترکیب کے بجائے اگر صرف انکسار بولا اور استعمال کیا جائے تو کافی ہے۔

غریب الوطنی: غریب الوطن (پردیسی) کی ترکیب درست ہے مگر پردیس کے معنی کے لیے غریب الوطنی کی ترکیب قواعد کے لحاظ سے محلِ نظر ہے لیکن بہت مستعمل ہے۔ قواعد کے اعتبار سے اصل ترکیب غُربتِ وطن (پردیس) ہے جسے اُردو میں قبولِ عام نہ ہو سکا۔

ضعیف الاعتقادی: ضعیف الاعتقاد (کمزور عقیدے والا) کی ترکیب درست ہے مگر ''کمزور عقیدہ'' کے مفہوم کے لیے ضعیف الاعتقادی کے بجائے ضُعفِ اعتقاد کی ترکیب ہی قواعد کے اعتبار سے درست ہے۔

نفس الامری: اصل ترکیب نفس الامر ہے جس کا معنی ہے اصل حقیقت، اصل مدّعا۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ نفس الامری ایک بے معنی اور غلط ترکیب ہے۔

دفع الوقتی: اس کا معنی لیا جاتا ہے وقتی یا فوری طور پر ٹال دینا، وقت گزاری یا مہلت حاصل کرنے کے لیے کوئی فوری تدبیر کرنا۔ یہ اُردو کا تصرف ہے اور اصولاً ایک غلط ترکیب ہے۔

راسخ العقیدگی: راسخ الاعتقاد اور راسخ العقیدہ سے گھڑی ہوئی ایک غلط ترکیب ہے۔

علوم الشرقیہ: قواعد کے اعتبار سے یہ ایک غلط ترکیب ہے۔ علومِ مشرق، مشرقی علوم اور شرقی علوم درست تراکیب ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ: Middle East کا ترجمہ مشرقِ وسطیٰ ایک غلط ترکیب ہے کیونکہ مشرق مذکر ہے اور وسطیٰ مونث۔ درست ترکیب شرقِ اَوسَط ہے۔

ضعیف البنیانی: ضعیف البنیان (کمزور بنیاد والا) سے وضع کی ہوئی ضعیف البنیانی کی ترکیب غلط ہے۔ ''بنیاد کی کمزوری'' کے لیے ضُعفِ بنیان کی ترکیب درست ہے۔

سہل الہضمی: سہل الہضم (آسانی سے ہضم ہونے والی غذا) سے وضع کی جانے والی ترکیب سہل الہضمی قواعد کے لحاظ سے غلط ہے۔

احکامِ شاہی: احکامِ شاہی کے مقابلے میں احکامِ شاہ اور شاہی احکام درست ترکیبیں ہیں۔

تہذیبِ مغربی: اس کے بجائے تہذیبِ مغرب اور مغربی تہذیب درست ہیں۔

اُردوئے قدیم: قدیم اُردو درست ترکیب ہے۔

فلسفۂ قدیم وجدید: قدیم وجدید فلسفہ درست ہے۔

غزل مسلسل: مسلسل غزل درست ہے۔

بلائے ناگہانی: ناگہانی بلا درست ہے۔

مہمانِ خصوصی: مہمانِ خصوصی اگرچہ مستعمل ہے مگر درست ترکیب خصوصی مہمان ہے۔

جلسۂ عام: جلسۂ عام ہی مستعمل اور مروّج ہے مگر قواعد کے لحاظ سے یہ درست نہیں۔ عام جلسہ درست ہے۔

مرضِ لاعلاج: لاعلاج مرض درست ہے۔

جلیل القدری: اصل ترکیب جلیل القدر ہے جس کا معنی ہے بڑے رُتبے والا۔ اس سے وضع کردہ ترکیب جلیل القدری غلط اور بے معنٰی ہے۔ ''بڑے رُتبے'' کے مفہوم کے لیے جلیل القدری کی ترکیب مضحکہ خیز ہے۔

عظیم القدری: یہی صورت اور قاعدہ اس ترکیب کا ہے۔

صحیح النسبی: صحیح النسب (جس کی خاندانی شرافت میں شُبہ نہ ہو) سے وضع کی ہوئی صحیح النسبی کی ترکیب غلط ہے۔

مُرفّہ الحالی: مرفہ کا معنی ہے آسودہ اور خوش حال۔ مُرفّہ الحال کا مطلب ہے آسودہ حال۔ خوشحالی اور آسودہ حالی کے مفہوم کے لیے مرفہ الحالی کی ترکیب قاعدے کے اعتبار سے غلط ہے البتہ اسمِ کیفیت کے طور پر مرفہ حالی کی ترکیب درست ہے۔

کثیر الاضلاعی: صحیح ترکیب کثیر الاضلاع ہے جس کا معنی ہے کئی پہلوؤں والی شکل۔ اس کی متغیر صورت کثیر الاضلاعی ایک غلط ترکیب ہے۔

مابعدالطبعی: اصل ترکیب مابعدالطبیعیات ہے جو فلسفہ اور الٰہیات کے معنوں میں آتی ہے۔ مابعدالطبعی درست ترکیب نہیں ہے۔

طویل القامتی: طویل قامت اور طویل القامت سے اسمِ کیفیت طویل قامتی درست ہے البتہ طویل القامتی درست نہیں۔

قریب الختمی: اصل ترکیب قریب الاختتام ہے، قریب الختمی ایک فضول اور غلط ترکیب ہے۔

''انہ'' کے اضافے سے اسمِ کیفیت کی غیر مانوس اور ناروا مثالیں:

اُردو میں کیفیت بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسم کے آخر میں ''انہ'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے مخالف سے مخالفانہ، جاہل سے جاہلانہ اور عاجز سے عاجزانہ وغیرہ۔ آج کل اس طرز پر غیر مانوس، ناروا اور غلط ترکیبیں بھی رواج پذیر ہو رہی ہیں۔ ادبی رسالوں اور اخباروں میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں جیسے منفیانہ باتیں، مُشتبانہ رویّہ، نااُمیدانہ سلوک، بے نیازانہ طرزِ عمل، شفافانہ انتخابات، خوش بختانہ خبر، عالمانہ پن، بائیکاٹانہ رویّہ، کالمانہ شر وغیرہ۔ لکھنے اور بول چال میں، اُردو اگر اس سطح پر آ جائے تو پھر اس کی حالت زار پر ماتم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

محتاجگی اور حیرانگی: محتاجی اور حیرانی کی جگہ محتاجگی اور حیرانگی کا استعمال ہم سب کے لیے حیرت کا مقام ہے۔ حیرانی سے بھی زیادہ حیرت میں فصاحت ہے۔

بحرِ خارزار: صحافت کی دنیا میں یہ ایک نئی ترکیب روشناس کرائی گئی ہے۔ اس ترکیب کو وضع کرنے

والے بے چارے صحافی کو علم نہیں کہ کانٹے خارستان اور جنگل میں ہوتے ہیں، سمندر میں نہیں۔ اس ترکیب سے بحر نکال دیں تو خارزار درست ہے۔ زار کا لاحقۂ ظرفی کسی جگہ کا معنی دیتا ہے جیسے گل زار، لالہ زار، سبزہ زار، مرغزار (مَرغ فارسی میں سبزے کو کہتے ہیں) اور کارزار وغیرہ۔

بحرِ ذخّار: بحرِ ذخّار (ذخیرہ سے) نہیں، بحرِ زخّار ہوتا ہے جس کا معنی ہے پُر۔ لبالب اور لبریز۔

علماءِ سُو: عُلماءِ سُو (بُرائی کے عالم) نہیں بلکہ عُلماءِ سَو (بُرے عالم) کی ترکیب درست ہے۔

فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک[1]

ٹیلی وژن پر خبریں پڑھنے والی خاتون نے موسم کا حال بتاتے ہوئے کہا......''کل قیامت کی گرمی پڑے گی۔'' چینل بدلا تو وہاں بھی موسم کا حال سنایا جا رہا تھا......''کل آسمان آگ برسائے گا۔'' قیامت سے پہلے قیامت اور دہکتے ہوئے انگاروں کی بارش کا سن کر، کسی اور چینل پر جانے کی ہمّت نہ رہی۔ ایک اور موقعے پر، بارش کی خبر دیتے ہوئے، نیوز ریڈر نے کہا ''ایک گھنٹے کی بارش نے لاہور کو 'پانی پانی کر دیا۔'' محاورے کے غلط استعمال نے اُردو سے محبت کرنے والوں کو شرمندہ کر دیا۔ راقم یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی اضطراب انگیزی خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے اور لوگوں کو ذہنی، نفسیاتی اور اعصابی مریض بنا رہی ہے۔ درجنوں ٹیلی وژن چینلز مسابقت کی بیماری میں مبتلا ہیں اور درجہ بندی (Rating) میں اوپر جانے کے لیے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ تشہیری مہم جہاں حرف ولفظ کی حُرمت پامال کرتی ہے وہاں فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک اچھے بھلے لوگوں کو مرعوب اور گمراہ کر رہی ہے۔ نشر واشاعت کے فنی اکتسابات میں جو چیز سب سے زیادہ زُود یاب ہے وہ لفظی صنعتوں کی یہی مذموم فراوانی، اِستعارات کی یہی شعبدہ بازی اور زبان کی یہی چرب کاری ہے جس کا آوازہ دنیا میں اتنا بلند ہے۔ نشر و اشاعت کی اس چمکیلی دنیا میں صحتِ بیان اور لفظوں کا محتاط استعمال عنقا ہو چکے ہیں۔ لفظوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت تصور کرنے کے بجائے کوئی گری پڑی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔

اِدھر ادب کی شہرت پرست دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ لفظوں کے اِسراف کا ایسا غدر مچا ہوا ہے کہ الامان والحفیظ۔ بیش تر ادیب لفظوں کے تھوک بیوپاری نظر آتے ہیں۔ ذرا غور وفکر کے ترازو میں اِن کی تحریر تو لیے تو کلو بھر لفظوں میں سے دس گرام معنی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ کسی چیز کا اِسراف اُس چیز کے ساتھ ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اگر آپ لفظوں کے اِسراف کے عادی ہو گئے تو

عجب نہیں کہ ایک دن آپ کے لفظوں سے معنی ہی کم ہو جائیں۔[۲] انسانوں کی طرح لفظ بھی دوستی اور دشمنی کرتے ہیں، عقل وفہم اور احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لفظوں کو استعمال کیا جائے تو یہ بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ جس نے لفظ و معنی کی ریاضت کا حق ادا کیا ہو تو لفظ ایسے لوگوں کے خود تابع ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات لفظ بھی آبگینے کی صورت سامنے آتے ہیں، اِن کے استعمال میں آپ ذرا چُوکے کہ انھوں نے فوراً آپ کی قلعی کھول دی۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایسی نعمتیں جو انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں اُن کی قدر سے ہم بالعموم غافل رہتے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی نعمت لفظوں کا بدل نہیں ہو سکتی۔ آپس میں بات چیت کرنے کی استعداد بہت بڑا عطیہ ہے جس کے بغیر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اگر الفاظ نہ ہوتے تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ، نہ سائنس ہوتی نہ طرح طرح کی ایجادات، نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو۔ اچھی زندگی ہمیں لفظوں کے طفیل نصیب ہوئی۔ لفظوں جیسی نعمت سے ہم جس بے پروائی کا سلوک کرتے ہیں وہ کفرانِ نعمت ہے۔[۳] لفظوں کے ناواجب استعمال سے نہ ہمارا بھلا ہوتا ہے نہ دوسروں کے پلّے کچھ پڑتا ہے، مثلاً اس جملے کو دیکھیے: ''فلاں پروگرام میں وزیر صاحب نے کُرسیِ صدارت کو زینت بخشی''...... یہ صریحاً لفظوں کا ناواجب استعمال ہے۔ اس جملے کا کسی غیر زبان میں ترجمہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ قول کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کو اُس عذاب سے نجات دلوائی جائے جو جاگیرداری دور سے بطور ورثے کے اسے ملا ہے جس نے نیک و بد کی تمیز اور حقیقی و غیر حقیقی کی پہچان ہم سے چھین لی ہے۔ ''کُرسیِ صدارت پر رونق افروز ہونا'' یا ''کرسیِ صدارت کو زینت بخشنا'' جیسی زبان ہمیں ترک کرنی ہوگی تاکہ ہم زبانوں کی عالمگیر برادری میں شامل رہ سکیں۔

لوگ لفظوں کا اچھا یا بُرا استعمال کرتے ہیں تو سننے والے اس استعمال کی اچھائی یا بُرائی سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ دوسرے شخص نے کوئی اچھا جملہ کہا یا بُرا، صحیح زبان استعمال کی یا غلط۔ بعض مقرر جلسے میں اُلٹے سیدھے لفظ لُڑھکانا شروع کر دیتے ہیں اور سادہ لوح سامعین جھوم جھوم کر کہتے ہیں ''واہ سبحان اللہ! حضرت نے کیا اچھی تقریر کی۔'' یہ مضحکہ خیز صورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بعض لوگ لفظوں کے آب و رنگ اور چمک دمک سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں چمکیلے لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں چمکیلا لفظ جڑ دیتے ہیں اور آرائشِ بیان سے وہاں کام لیتے ہیں جہاں طبیعت بے اختیار سادگی اور برجستگی کا تقاضا کرتی ہے۔ الفاظ ہیرے اور جواہرات ضرور ہیں مگر صرف اُن لوگوں کے لیے جو موتیوں کی طرح ان کی قدر کرتے

ہیں، قدر ناشناسوں کے دامن میں اِن موتیوں کو راکھ بنتے دیر نہیں لگتی۔[۴]

بسا اوقات لفظ بھی ابنِ آدم کی طرح دشمنی پر اُتر آتے ہیں۔ جو ادیب لفظوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے موقع پاتے ہی لفظ بھی اُن کے ساتھ اُسی سلوک کے مرتکب ہو جاتے ہیں مثلاً ایک صاحب کہیں لکھ گئے: ''یہ تحریر میرے سفر نامے کی رُوداد ہے۔'' ہوسکتا ہے کہ عام قاری کی نگاہ اس جملے کے جھول کو نہ سمجھ پائے مگر میرا خیال ہے کہ توجہ کی جائے تو 'تحریر'، 'نامہ' اور 'رُوداد' کی یکجائی واضح ہو جائے گی۔[۵] زیادہ رنگین ترکیبوں اور فالتو لفظوں سے پرہیز ضروری ہے مثلاً جہاں کہیں 'صحت و عافیت' اور 'امن و امان' وغیرہ نوعیت کی ترکیبیں ملیں تو یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ کیا یہاں دونوں لفظوں کی ضرورت ہے یا ایک ہی کافی ہوگا مثلاً امن سے مراد فساد کا نہ ہونا اور امان سے مراد کسی کی پناہ میں ہونا ہے۔ اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہے جس کے لیے دونوں لفظ درکار ہیں تو بخوشی امن و امان کہیے ورنہ ایک ہی لفظ کافی ہے۔ یہی حال صحت و عافیت کا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ صحت ہو لیکن عافیت نہ ہو۔ یا عافیت ہو اور صحت نہ ہو۔ پھر کیوں نہ ہم وہی کہیں جو فی الحقیقت مراد ہے۔[۶] عوام اپنے بول چال میں غلطی کر جائیں تو ہمیں اُن سے کچھ نہیں کہنا مگر خواص کے ہاں جب یہ بے احتیاطی نظر آتی ہے تو ہم جیسے مُبتدی بہت کُڑھتے ہیں کہ یہی لوگ تو زبان و بیان کا معیار بنتے ہیں اور اِسی عمل سے اُن کا وقار قائم ہوتا ہے۔ لفظ کے محلِّ استعمال کی غلطی کی مثال ملاحظہ کیجیے: ''لاہور کسی زمانے میں شاعروں کی آماج گاہ تھا۔'' دوسری مثال دیکھیے: ''لاہور کے گنجان علاقوں میں گٹر (Gutter) کیڑے مکوڑوں کا مسکن ہیں۔'' اِن جملوں میں جہاں آماج گاہ لکھنا چاہیے تھا وہاں مسکن لکھا گیا اور جہاں مسکن کا محل تھا وہاں آماج گاہ لکھ دیا گیا۔ کون نہیں جانتا کہ ''آماج گاہ'' منفی معنوں ہی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

الفاظ کو غلط اور بے جا استعمال کرنے کا شوق رکھنے والے کبھی کبھی صرف غلط اِملا کا سہارا لے کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ ''دونوں'' لکھنے کے بجائے ''دونو'' لکھتے ہیں لیکن اس لفظ میں نونِ غُنّہ غائب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تینوں'' اور ''چاروں'' کو ''تینو'' اور ''چارو'' لکھنا۔ یہ حضرات پروا کو پرواہ اور بے پروائی کو بے پرواہی لکھ کر دو زبانوں یعنی اردو اور فارسی پر ستم توڑنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ اُردو میں فارسی سے آیا ہے۔ درست لفظ ''پروا'' ہے۔ عوام ہی نہیں غیر محتاط خواص بھی اسے ''پرواہ'' بولتے اور لکھتے ہیں حالاں کہ یہ لفظ چاہ، واہ اور راہ کا قافیہ نہیں بن سکتا۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ جو زائد ''ہ'' وہ پروا میں جمع کرتے ہیں وہ بلا تکلف ''قہقہہ'' سے منہا کر کے ''قہقہ'' بنا کر غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بڑی ڈھٹائی سے تقاضا کو تقاضہ، معمّا کو معمّہ، حیرانی کو حیرانگی، درستی کو درستگی، مع کو معہ اور موقع کو موقعہ لکھ جاتے ہیں۔

''رازِ افشا ہوگیا'' کو ''رازافشاں ہوگیا'' لکھا جا رہا ہے اور اسی مناسبت سے ''رازِ افشائی'' کو ''رازاَفشانی'' لکھا جاتا ہے۔ ''کوئی'' کے بعد ہمیشہ واحد اسم آتا ہے جیسے کوئی ضرورت ''کوئی شئے'' وغیرہ۔ اُردو کی نام نہاد توسیع کے حامی ''کوئی ضروریات'' اور ''کوئی اشیاء'' لکھ رہے ہیں۔ اِزدِحام، جس کا مادہ زحمت، مُزاحمت اور مُزاحم وغیرہ سے ہے اُسے اژدہام لکھتے ہوئے نہیں شرماتے۔ غضب سے متاثر ہوکر قرآنی لفظ غیظ کو ''غیض'' لکھتے ہیں۔ ایسے ادیب ''مرتبے پر فائز نہیں ہوتے'' فائض ہوتے ہیں۔

ہندی، فارسی، انگریزی اور دیگر غیر عربی الفاظ کو بزعم خویش عربی لبادہ پہنا کر اُردو میں مروّج کرنا محض لفظی بازی گری ہے مثلاً انگریزی لفظ بور (Bore) سے ''بوریت۔'' کسی نے پہلے پہل لفظ ''بوریت'' کی اختراع کی تو غیر محتاط اور ناواقف لوگوں نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ غیر عربی الفاظ پر تنوین کا استعمال مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے مثلاً تخمیناً یا تقریباً کے بجائے اندازاً کہنا اور لکھنا اس قسم کی غلط پسندی یا بے خبری کا ثبوت ہے۔ تنوین عربی صَرف کا ایک قاعدہ ہے جسے ہم اسم (noun) کو adverbial صورت دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی اسم (noun) کے ساتھ ''ن'' کی آواز بڑھا دیتے ہیں اور اس کے لکھنے کی صورت تقریب سے تقریباً اور تخمین سے تخمیناً ہوتی ہے جس کا معنی ہے ''کسی خاص صورتِ حال کے قریب قریب'' یا ''اندازے سے''۔ اندازہ ایک فارسی لفظ ہے اور فارسی لفظوں پر تنوین کا عمل نہیں ہوتا۔[۷] اندازاً کہنا نہایت مضحکہ خیز بات ہے مگر اردو بولنے والوں میں آپ کو بہت سے لوگ مل جائیں گے جو تقریباً یا تخمیناً کے بجائے اندازاً کہتے ہیں۔

اُردو زبان کے مقابل ایک ''متوازی اُردو'' بڑی تیزی سے پنپ رہی ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کے اس دور میں، اس طوفانِ بدتمیزی سے نمٹنے کے لیے، نہ کسی کو فکر ہے اور نہ ہی پروا۔ خاکم بدہن بہت بڑا خطرہ دکھائی دے رہا ہے کہ کہیں متوازی اُردو اصل اُردو کی جگہ نہ لے لے۔ ایک دور تھا کہ ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور قومی اخبارات و جرائد اصلاحِ زبان و ادب کا مؤثر ذریعہ ہوا کرتے تھے۔ اِن اداروں کا کردار جامعات وکلیات سے کم نہیں ہوتا تھا، افسوس کہ آج یہ ادارے اپنا لسانی تشخص کھو بیٹھے ہیں۔ ٹیلی وژن پر بیٹھے اینکر پرسن اور میزبان بسا اوقات تلفظ کی غلطیوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ایک ذمہ دار آفیسر سے راقم نے اس صورتِ حال کا گلہ کیا تو انھوں نے برملا کہا کہ عوام کی ضرورت خبر کا ابلاغ ہے نہ کہ صحتِ الفاظ، ہماری ترجیح محض خبر کا ابلاغ ہے۔[۸]

عربی سے اُردو میں آنے والے ایسے الفاظ کم نہیں ہیں جو ''میم'' سے شروع ہوتے ہیں اور اُن پر پیش آتی ہے۔ یہ الفاظ عام طور پر اسم فاعل اور اسم مفعول ہوتے ہیں جیسے مُنتظِر اور مُنتظَر، مُختصِر اور مُختصَر

وغیرہ۔ ''میم'' سے شروع ہونے والے کسی لفظ پر زبر آئے تو وہ عام طور پر اسمِ ظرف ہوتا ہے، جیسے مجلس مقتل منظر وغیرہ یا پھر اسمِ مفعول ہوتا ہے، جیسے مظلوم، مقتول، مجبور وغیرہ۔ ٹیلی وژن چینلز نے سوچی سمجھی سازش یا جہالت کے تحت یہ اُصول اور فارمیٹ اپنا لیا ہے کہ 'میم' سے شروع ہونے والے وہ الفاظ جن کے پہلے حرف پر پیش آتی ہو اُسے خواہ مخواہ زبر کے ساتھ پڑھا اور لکھا جائے جیسے مُثبت کو مَثبت، مُختص کو مَختص، مُنتقم مزاج کو مَنتقم مزاج، مُنتقِل کو مَنتقِل، مُنہدِم کو مَنہدِم، مُنتخِب کو مَنتخِب اور مُنقطع کو مَنقطع وغیرہ۔ ان مثالوں میں 'زبر' لگا کر بگاڑے گئے الفاظ بے معنی ہو گئے ہیں۔ ایسا کرنے اور سوچنے والے زبان کے معاملے میں قطعی طور پر جاہل ہیں۔ مُثبت کو مَثبت کہنے والے ایک حضرت کو ٹوکا تو ''کمالِ استدلال'' سے کہنے لگے، ''اچھا یہ بتاؤ پھر مَنفی کو مُنفی کیوں نہیں کہتے؟''

لفظ ''عظیم'' کی عظمت، حُسن اور معنویت کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ اُردو زبان و ادب میں یہ ہمیشہ مُثبت معنوں میں آیا ہے۔ ابلاغ اور نشر و اشاعت میں آج کل 'عظیم آتش زدگی'، 'عظیم المیہ' اور 'جنگِ عظیم' جیسی تراکیب ہماری سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں اور ہماری نظریں بھی اِن الفاظ پر پڑتی رہتی ہیں۔ اہلِ ادب پر عجیب سی بے حسی چھائی ہوئی ہے کہ کسی نے بھی توجہ نہیں دلائی کہ ''بدترین آتش زدگی''، ''بدترین المیہ'' اور ''جنگِ بدترین'' کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟

لفظ ''خوب صورت'' کو لے لیں، اس من بھاؤنے لفظ میں شکل، چہرے اور نقش کا تصور سامنے آتا ہے۔ اگر کوئی کہے: ''غالبؔ کی غزل کتنی خوب صورت ہے'' تو مقامِ غور ہے۔ ''غالبؔ کی غزل کتنی خوب ہے'' کہنے سے حشو و زوائد سے بچا جا سکتا ہے اور جملے کا حسن اور معنویت بھی سوا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح ''بھیڑ جمع ہو گئی''، ''مجمع اکٹھا ہو گیا'' بھی حشو و زوائد کی بدترین غلطیاں ہیں 'بھیڑ ہو گئی'، 'مجمع ہو گیا' ہی کافی ہے۔ 'زبر' اور 'زیر' کے معنی بتدریج 'اوپر' اور 'نیچے' ہیں اور 'دست' کے معنی ہاتھ ہیں۔ لفظ 'زبردست' کے معنی ہوئے اوپر والا ہاتھ یعنی طاقت ور اور غالب۔ 'زیردست' کے معنی ہیں نیچے والا ہاتھ یعنی مغلوب، کمزور اور عاجز۔ لیکن ''زبردست'' کا یہ استعمال کیا صحیح ہے کہ: ''کل صبح زبردست بارش ہوئی'' اور ''مہدی حسن کی آواز بڑی زبردست ہے۔''

''کافی'' کا معنی 'کفایت کرنے والا' ہے [9] جبکہ اُردو میں اس کا استعمال 'حسبِ ضرورت' کے معنوں میں ہوتا ہے۔ اکثر لکھنے والے ''کافی'' کے اصل مفہوم، معنویت اور محلِ استعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے غیر محتاط ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اُن کے ذہن میں اس لفظ کا معنی 'بہت' یا 'بہت زیادہ' سمایا ہوا ہے حالاں کہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے۔ ''اُسے بہت تشویش ہوئی'' کے بجائے

''اُسے کافی تشویش ہوئی'' کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ اب تشویش کی کسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس مصیبت کے کافی ہونے کی تمنّا کرے۔ لفظ ''آخری'' کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ شاید مرنے سے پہلے زندگی کا کوئی آخری کام کیا ہے۔ ''میرا آخری خط تمھیں مل گیا ہوگا'' سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مزید خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا، حالاں کہ درست اس طرح ہے: ''میرا گزشتہ خط تمھیں مل گیا ہوگا۔'' ہم اکثر بولتے ہیں: ''وہ لاہور کے لیے روانہ ہوگیا'' اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ لاہور نے اس کے آنے کی خواہش کی ہے۔ جُملہ سیدھا، کم خرچ اور درست یوں ہے: ''وہ لاہور روانہ ہوگیا۔'' ''اُمید'' کا بے جا استعمال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ''اُمید ہے کہ وہ لاہور جائے گا'' حالاں کہ یہاں اُمید کے بجائے 'خیال' کا محلِ استعمال ہے اور درست جملہ یوں ہوگا: ''خیال ہے کہ وہ لاہور جائے گا۔'' کھانا (To eat) کے بجائے کوئی چیز ''لینا'' یعنی To take one egg انگریزی زبان میں تو روا ہے مگر اُردو میں اگر کوئی کہے: ''میں ناشتے میں صرف ایک انڈہ لیتا ہوں'' تو اِسے غلط تصور کیا جائے گا۔ درست جملہ اس طرح ہوگا: ''میں ناشتے میں صرف ایک انڈہ کھاتا ہوں۔'' اِسی طرح تجویز رکھی نہیں جاتی، پیش کی جاتی ہے مثلاً ''فلاں صاحب کے سامنے تجویز رکھی گئی'' کی نسبت ''تجویز پیش کی گئی'' صحیح ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لکھنے والے ایسے بھی ہیں جو لفظوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں مثلاً ایک لفظ 'فرد' ہے جس کی جمع ہے افراد اور ایک لفظ ہے 'لوگ'۔ لوگ اور فرد کے معنوں پر نگاہ مرکوز رکھیں۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا اور ٹیلی وژن پر سنا ہوگا کہ: ''کار حادثے میں پانچ لوگ ہلاک ہو گئے'' جب کہ یہاں افراد کا محل ہے لوگ کی جگہ 'افراد' لکھا اور کہا جانا چاہیے۔

لفظوں کے صَرف کے بارے میں ہمیں ہر وقت چوکنّا رہنا چاہیے۔ روزمرّہ اور محاورے کا لحاظ اور پابندی بہت ضروری ہے ورنہ یوں معلوم ہوگا جیسے ہم کوئی بے معنی بات کر رہے ہیں۔ لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظِ مترادف میں فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خون اور لہو دونوں اُردو میں اگرچہ ہم معنی ہیں لیکن محاوروں میں ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اُردو میں خون پر مبنی محاورے کوئی دو درجن سے زائد ہیں، لہو پر مشتمل محاورات کی تعداد بھی کم نہیں۔ خون کی جگہ لہو اور لہو کے بجائے خون کا استعمال درست نہیں ہوگا مثلاً ''فلاں شخص کئی خون کر چکا ہے'' کی جگہ ''فلاں شخص کئی لہو کر چکا ہے'' درست نہیں ہوگا یا مثلاً ''میری اُمیدوں کا خون ہوگیا'' کے بجائے ''میری امیدوں کا لہو گیا'' غلط ہوگا۔ ایک محاورہ ہے ''ہاتھوں کے طوطے اُڑنا'' جس کا معنی ہے 'حواس باختہ' ہو جانا۔ کچھ لوگ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں: ''اُس کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اُڑ گئے......'' محاورے میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں

ہے، طوطے ہاتھوں کے ہوتے ہیں پاؤں کے نہیں اور پھر صرف ہاتھوں کے ہوتے ہیں ہاتھ کے نہیں۔
'حادثہ' اور 'سانحہ' بظاہر ہم معنیٰ ہیں اور عام طور پر ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہو جاتے ہیں مگر اِن دونوں میں ایک لطیف فرق اور خفیف بُعد ایسا ہے جسے لسان شناس ادیب اور شاعر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عنایت علی خان کا یہ مشہور شعر اس کی زندہ مثال بن گیا ہے:

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

''اِمالہ'' کے بارے میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک تعداد غلطی کر جاتی ہے۔ ''اس سلسلہ میں''، ''اس مسئلہ میں''، ''اس بارہ میں'' اور ''اس موقعہ پر'' وغیرہ لکھتے اور بولتے ہیں جب کہ ''اس سلسلے میں''، ''اس مسئلے میں''، ''اس بارے میں'' اور ''اس موقعے پر'' لکھنا اور بولنا چاہیے۔ اِمالے کے سلسلے میں جوشؔ ملیح آبادی کا ایک سبق یاد آ گیا، مخاطب تھے ممتاز جدید شاعر و ادیب احمد ہمیش جو مطلع اور مطلعے پر جوشؔ سے بحث پر آمادہ تھے اور اِمالے سے ناواقفی کے سبب اڑے ہوئے تھے۔ جوشؔ نے تنگ آ کر کہا کہ میاں! مثلاً آپ کے دادا جان کو گھڑ سواری کا شوق تھا اور ایک دن اس شوق نے اُن کی جان لے لی تو آپ یہ کہیں گے کہ میرے دادا 'گھوڑا' سے گر کر مر گئے یا کہ میرے دادا گھوڑے سے گر کر مر گئے؟ اخبارات و رسائل اور ٹیلی وژن پر اِمالہ کا غلط استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر ایسے جُملے پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں: ''مشاعرہ کی شام کو بارش ہونے لگی''، ''مسلم لیگ کے جلسہ میں پانی چھوڑ دیا گیا''، ''مدرسہ کا دروازہ ٹوٹ گیا''، ''جہانگیر کے مقبرہ کو دُور سے دیکھا'' اور ''کلکتہ سے شملہ تک'' وغیرہ۔ جب کہ ان کا درست استعمال اس طرح ہے: ''مشاعرے کی شام کو......''، ''مسلم لیگ کے جلسے میں......''، ''مدرسے کا دروازہ......''، ''جہانگیر کے مقبرے کو......'' اور ''کلکتے سے شملے تک'' وغیرہ۔

اِس کے برعکس کچھ حضرات اِمالہ کے دیوانے ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے اِسی محبت میں کہہ ڈالا: ''میں مدینے منورے جا رہا ہوں'۔ یہاں مدینہ کی صفت منورہ کا اِمالہ منورے کی صورت میں کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ ''مدینہ منورہ جا رہا ہوں'' یا ''میں مدینے جا رہا ہوں'' درست ہوگا۔

بعض لوگوں کو بغیر کسی قرینے کے ''بھی'' کثرت سے لکھنے اور بولنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً ''ترجمہ نگاری فن بھی ہے، ذوق بھی اور لیاقت بھی۔'' قاعدہ یہ ہے کہ جملے میں اُجاگر کی جانے والی تین خاصیتوں میں سے پہلی خاصیت کے ساتھ 'بھی' نہیں آتا۔ درست اس طرح ہوگا: ''ترجمہ نگاری فن ہے ذوق بھی اور لیاقت بھی۔'' اِسی طرح ''باوجود'' کے بعد 'بھی' کا استعمال راقم کے نزدیک مکروہِ تحریمی کا درجہ

رکھتا ہے۔ 'باوجود' میں 'بھی' کا مفہوم آ جاتا ہے لہٰذا ''اس کے باوجود بھی'' کہنا غلط ہے اور ''اس کے باوجود'' لکھنا اور بولنا درست ہے۔ بعض لوگ الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے قاعدے کو نہ سمجھتے ہوئے بول چال میں کہہ دیتے ہیں: ''میرا خیال بھی رکھیں۔'' یہاں 'بھی' کے محلِ استعمال میں غلطی ہوگئی۔ 'بھی' خیال سے مقدم ہے اور صحیح جملہ یوں ہوگا: ''میرا بھی خیال رکھیں۔'' اِسی طرح کہہ جاتے ہیں: ''میری عدالت سے درخواست ہے''۔ اس جملے میں ''عدالت سے'' ''میری'' سے مقدم ہے اور صحیح جملہ اس طرح ہوگا ''عدالت سے میری درخواست ہے۔''

ناظمِ مشاعرہ نے کسی شاعر کو مدعو کرتے ہوئے کہا: ''اب میں گزارش کرنے جا رہا ہوں فلاں شاعر سے کہ وہ سٹیج پر تشریف لائیں اور......''۔ ناظمِ مشاعرہ کی اس دعوت سے بھرپور تاثر مل رہا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر گزارش کرنے جا رہے ہیں۔ اس تکلف سے بچنے کے لیے انھیں کہنا چاہیے تھا: ''اب میں گزارش کرتا ہوں'' یا ''کر رہا ہوں۔'' ہم بات بات پہ کہتے ہیں: ''حیرانی کی بات ہے۔'' ذرا سا غور کرنے سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ: ''حیران کُن بات ہے'' زیادہ فصیح ہے۔ ٹیلی وژن کے ایک ڈرامے کا یہ مکالمہ اُردو کے زوال کا اعلان کر رہا ہے: ''آپ کو اپنے اوپر مفکر ہونے کا شبہ ہوگیا ہے۔'' اس مکالمے میں ''اپنے اوپر'' کا نہیں ''اپنے آپ'' کا محل ہے یعنی ''آپ کو اپنے آپ پر مفکر ہونے کا شبہ ہوگیا ہے۔'' ''دِن بدن'' کی ترکیب سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ یہ قاعدہ تو واضح ہے کہ کسی ہندی لفظ کے ساتھ ''بہ'' لگا کر ترکیب بنانا اور استعمال کرنا اصول وقواعد کے خلاف ہے۔ اس کے مقابل ''روز بروز'' صحیح اور آسان ترکیب ہے۔ ایک ہندوستانی ٹیلی وژن چینل سے یہ جملہ سُنا گیا: ''فلاں ادیب نے ایوارڈ لینے سے منع کر دیا۔'' کہنے والے کا مدعا یہ تھا کہ ''ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔'' ''منع کرنا'' کا معنی ہے روکنا، یہ ''انکار کرنا'' کے معنی میں قطعاً نہیں آ سکتا۔

اُردو تہذیب کا دستور ہے کہ اپنے گھر کے لیے ''غریب خانہ'' اور دوسرے کے گھر کے لیے ''دولت خانہ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ''کیا میں آپ کے 'غریب خانے' پر تشریف لا سکتا ہوں تو زبان دانوں کے لیے یہ ایک لطیفہ بن جائے گا۔ اسی طرح دوسرے کی آمد پر ''تشریف لائیے'' اور اپنے لیے ''میں حاضر ہوا'' کہا جاتا ہے۔ ''تشریف لانا'' اور ''حاضر ہونا'' میں آمد ہی کے معنی ہیں مگر محل استعمال اور زبان کی تہذیب کا فرق ہے۔ کسی مہمان کی آمد پر ''تشریف لائیے'' آپ نے سنا ہی نہیں بلکہ بولتے بھی ہوں گے لیکن کسی کو اپنے لیے یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ 'میں تشریف لایا تھا تو آپ غیر حاضر تھے' اور اگر کوئی اس طرح کہہ بیٹھے تو لوگ مسکرا دیں گے کہ یہ زبان نہیں جانتا۔[۱۰]

بعض ادیب اور کالم نویس بے خبری یا کم علمی کی وجہ سے ''ھ'' اور ''ہ'' میں فرق روا نہیں رکھتے اور اِن دونوں حرفوں کو الفاظ میں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس جملے پر غور کیجیے: ''شیر دہاڑتا ہوا جنگل سے نکلا۔'' اِسے بعض لوگ ''شیر دھاڑتا ہوا'' کہتے ہیں یعنی ''دہاڑ'' کو دو چشمی ھ سے ''دھاڑ'' لکھ دیتے ہیں۔ یاد رہنا چاہیے کہ شیر کی ''دہاڑ'' اور چیز ہے اور لُچوں لفنگوں کی مار دھاڑ اور چیز۔ ''مشکور'' کا شکر گزار کے معنی میں استعمال تو عام ہو چکا ہے۔ خدا نہ کرے کہ اُردو زبان پر ایسا وقت آئے کہ لوگ ''مقتول'' کو قاتل کے معنی میں استعمال کرنے لگیں۔ گزرے زمانوں میں بھلے لوگ سراپا ''اِنکسار'' ہوتے تھے اب یہ زمانہ بھی دیکھنا پڑ رہا ہے کہ آج کل سراپا ''انکساری'' ہیں۔ رمضان المبارک میں روزہ دار بڑے اشتیاق سے ''اِفطار'' کا اہتمام کیا کرتے تھے مگر اب اِفطار سکڑ کر ''افطاری'' بن چکا ہے۔

اِرتکازِ توجہ کے نہ ہونے کی وجہ سے، بسا اوقات سماعت کے مغالطے اور نظر و ذہن کے عدمِ ارتباط کے سبب الفاظ کچھ سے کچھ بنا دیئے جاتے ہیں۔ سنتے، بولتے اور لکھتے وقت اپنے ذہن کو حاضر نہ رکھنا بھی غلطی کے زمرے میں آتا ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے خبر بنائی: ''نقضِ امن کے پیشِ نظر حکام نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی۔'' کاتب کی عجلت نے ''نقض'' کا ایک نقطہ ہضم کر لیا۔ چھپنے کی بعد بھی اس غلطی پر کسی کی نظر نہیں گئی اور ''نقضِ امن'' کے بجائے ''نقصِ امن'' ہی رائج ہو گیا۔ ''نقض'' کے معنی توڑنے کے ہیں، نقضِ امن یعنی امن توڑنا جبکہ ''نقص'' کے معنی عیب کے ہیں اب ذرا سوچیے کہ ''امن کا عیب'' چہ معنیٰ ؟[۱۱]

ٹیلی وژن اینکرز اور کالم نگار حضرات تکرارِ لفظی و معنوی کے ایسے ایسے شگوفے چھوڑتے ہیں کہ سر پیٹنے کے جی چاہتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ کیجیے جن کا استعمال تحریر و تقریر میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔ ''اِس میں یہ راز پوشیدہ ہے''، ''بار بار اعادہ کرنا''، ''بدبُو سے تعفن پھیلنا''، ''پُرکٹھن حالات میں''، ''پہلے سے پیش بندی''، ''تاثر کے زیرِ اثر''، ''تحریری مقالہ رقم کرنا''، ''تقریباً دس کے قریب''، ''تمام جملہ امراض''، ''تمام فریقین''، ''خرچ کرنے کا صحیح مصرف''، ''دیکھنے میں دیدہ زیب''، ''شعری مجموعۂ کلام''، ''عیاں دکھائی دیتا ہے''، ''کام میں مصروفِ عمل''، ''کوئی ایک فردِ واحد''، ''پانچ مقتولوں کو قتل کر دیا گیا''، ''نئی جدّت''، ''یومِ عاشور کا دن'' اور ''یہ نوشتۂ دیوار پر لکھا ہوا ہے۔''

باقر مہدی کا شعر ہے:

ذرا سنبھال کے لفظوں کو جوڑیے صاحب!
کہ اس مکان میں ایک عمر تک رہے گا کوئی

واضح رہے کہ ''کوئی'' دوسرا نہیں بلکہ لفظوں کے مکان میں لکھنے والے ہی معنی بن کر قیام کرتے

ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، ناسخؔ، آتشؔ، داغؔ اور اقبالؔ جیسے شاعر اِنھی مکانات میں سالوں سے مقیم ہیں بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ و معنی کے تعلق سے یہ لوگ مینارۂ نور بن گئے ہیں۔[۱۲] طوالتِ بیان، لفظی بے راہ روی اور تکلّفات اِسرافِ لفظی ہی کی صورتیں ہیں۔ اُردو کی توقیر اور اس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مستقل عزم کے ساتھ اِن عیبوں کو ترک کرنا ہو گا۔ نوجوان طلبہ کی تربیت کرتے ہوئے اُن میں لفظوں کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہو گی۔ اُن میں ذوق وشوق اور غور و فکر کی خُو پیدا کرنی ہو گی کہ لفظوں کو پرکھنے، صحت سے ادا کرنے اور صحیح جملے بنانے کی عادت ابھی سے ڈال لیں۔

ہم فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک سے مات کھا چکے ہیں۔ کھوکھلی ترکیبیں، اصل معنی کو گھسیٹ کر یوں اِدھر اُدھر لے جانے لگیں ہیں کہ ہمارا کہا اُن کا کہا برابر ہو گیا ہے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ تحریر میں لفظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔ اِسی کو بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لفظوں کا صحیح استعمال قومی زبان سے محبت کا ثبوت اور ہماری ترقی کی ضمانت ہے۔ قومی زبان سے بے نیاز ہو کر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں۔

حواشی اور حوالے

۱۔ پروفیسر حمید احمد خان کی کتاب ''تعلیم و تہذیب'' اور ندیم صدیقی کی ''پُرسہ'' کا مطالعہ مضمون ہٰذا کی تحریر کا باعث بنا۔
۲۔ ندیم صدیقی، **پُرسہ**،(ممبرا۔تھانے (انڈیا): اُردو قبیلہ، دسمبر ۲۰۱۵ء)،ص ۲۷۰۔
۳۔ پروفیسر حمید احمد خان، **تعلیم و تہذیب**،(لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۶ء)،ص ۱۹۱۔
۴۔ ......ایضاً......،ص ۲۰۰۔
۵۔ پروفیسر غازی علم الدین، **تخلیقی زاویے**،(فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء)،ص ۹۷۔
۶۔ **تعلیم و تہذیب**،ص ۲۰۱۔
۷۔ ......ایضاً......،ص ۱۹۶۔
۸۔ پروفیسر غازی علم الدین، **لسانی مطالعے**،(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء)،ص ۱۵۹۔
۹۔ عبدالحفیظ بلیاوی، **مصباح اللغات**،(کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)،ص ۴۶۷۔
۱۰۔ **پُرسہ**،ص ۲۷۳
۱۱۔ ......ایضاً......،ص ۲۶۶۔
۱۲۔ ......ایضاً......، ۲۷۶۔

نام رکھنے، لکھنے اور پکارنے کی مشکلات

(ایک لسانی مطالعہ)

انسانی تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ناموں کا تصور اور استعمال تہذیبی، مذہبی اور لسانی تلازمہ رہا ہے۔ دنیا بھر میں، مختلف النوع اور کثیر الافکار سیکڑوں معاشروں میں، یہ تصور مشترک رہا ہے کہ ہر چیز بالخصوص ہر فردِ بشر کی پہچان اور انفرادیت کے لیے ایک مخصوص نام دیا جائے جو نہ صرف زندگی بھر اس کے تعارف کا پہلا حوالہ بنے بلکہ موت کے بعد بھی کسی نہ کسی انداز میں اس کی یاد اور شناخت کا ذریعہ بنا رہے۔ ناموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تصورِ اوّلین تخلیقِ آدمؑ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾[۱] اور بعد ازاں تعلیمِ آدمؑ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[۲] سے وابستہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نام کسی عقیدے اور نسبت کے لحاظ سے، موسموں اور مہینوں کی مناسبت سے، ستاروں، سیاروں، پھولوں، درختوں، جانوروں، شہروں، علاقوں کے علاوہ اصوات و اوہام اور کلچر کی بنا پر رکھے جاتے رہے۔

نام شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس کی معنویت زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ شخصیت سازی اور اخلاق و اعمال کی تعمیر میں، نام بنیادی اور توانا عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نام سے انسان کی صرف شناخت ہی نہیں ہوتی، اس کے رجحان، ذہن اور فکر کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ نام اور شخصیت کے مابین وہی ہم آہنگی اور دائمی وابستگی ہے جو جسم اور روح کے درمیان پائی جاتی ہے۔ نام کے حُسن و عمدگی سے روح میں لطافت و بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور اس کے نقص و قبح سے روح میں کثافت، اعمال میں آلودگی اور پراگندگی پیدا ہوتی ہے۔ راقم کے اس بیان کا واضح ثبوت، جدت پسندی کے شوق میں تجویز کیے گئے وہ بے معنی اور مہمل نام ہیں، جن کا لغت میں کوئی مادہ نہیں ہے اور نہ ماخذِ اشتقاق ہی۔ یہی وجہ ہے کہ ناموں

میں ایسی غلطیوں کے سبب ہماری تہذیب متاثر ہو رہی ہے۔

مُبہم اور بے معنٰی ناموں کی کچھ مثالیں

کچھ ایسے خود ساختہ، مبہم اور بے معنیٰ نام پیش کیے جاتے ہیں جو جدّت پسندی کا مظہر تو ہیں لیکن معنویت اور دل کشی سے یکسر عاری ہیں۔ یہ سبھی نام راقم کے ذاتی مشاہدے میں آئے ہیں۔ ان ناموں سے لوگوں کی ذہنی صلاحیت، میلانِ خاطر، رغبت اور رجحانِ طبع کا بآسانی تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ راقم السّطور نے، اس ضمن میں، ایک لطیفہ پڑھا تھا کہ ایک شخص نے کسی عالم سے کہا کہ میں اپنے نو مولود بیٹے کا نام رکھنا چاہتا ہوں، مجھے ایسا نام بتائیں جو آج تک کسی نے نہ رکھا ہو اور اس میں بہت جدّت ہو۔ عالم نے کہا کہ اپنے بیٹے کا نام رکھ لو ''اُلّو کا پٹھا۔''

(مذکر): اذنان۔ ادیان۔ عدیان۔ ازرم۔ الیان۔ علیان۔ ایان۔ آریان۔ الذین (Alzeen)۔ انباس۔ روماز احمد۔ زیان۔ شازیل۔ شہفان۔ ضحلان احمد۔ ضیام علی۔ ضفدم حسین۔ عابص نواز۔ علیز احمد۔ عبیل۔ عضلان۔ محمد عقّار۔ علی الرغم (Ali Alargham)۔ فابد علی۔ فرزوق۔ محمد موتیم۔ مہراز احمد۔ محمد ولیم (Waleem)۔ وادت حسین۔ ہمنان وغیرہ۔

(مونث): المہ (Alma)۔ انعمت (Anamt)۔ بسمین (Bismeen)۔ تسمین (Tasmeen)۔ تسمینہ (Tasmeena)۔ رحمانہ۔ روبیہ۔ رومینہ۔ رونینہ۔ روینہ۔ زبین۔ زوبیہ۔ زوبیا۔ زونیہ۔ زوہا۔ سدرشن۔ سمل۔ سُنَیّا۔ سوہا۔ شافرین۔ شانزے۔ شِرزّا۔ شنیطہ۔ علوینہ۔ علیزے۔ علیزہ۔ علیشا۔ علیشہ۔ فبیہا (Fabiha)۔ مہراز۔ مافیا۔ مافیہ۔ ماروشہ۔ ماہین۔ مائرہ۔ معائرہ۔ مائزہ۔ مونزے۔ میرال۔ میشا۔ نازمین۔ نوشیبہ۔ نوشیلہ۔ نساج۔ نہا۔ نیہا وغیرہ۔

ناموں میں اُردو ہجوں کے بگاڑ کی کچھ مثالیں

ہم زندگی کے غیر ضروری معاملات میں بہت توجہ دیتے ہیں لیکن درست نام رکھنے اور لکھنے کے معاملے میں غیر ذمہ دار اور مجرمانہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ غلط ہجوں اور غلط تلفظ سے، نام کے معنی بدل جاتے ہیں یا وہ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اردو ہجوں کے بگاڑ کی کچھ ایسی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جو گاہے گاہے راقم کے مشاہدے میں آتی رہیں۔ انھیں دیکھ کر قارئین کو اندازہ ہو جائے گا کہ درست اور عام فہم ناموں کو کس قدر بے خبری اور عدمِ توجہ سے غلط لکھ دیا جاتا ہے اور انھیں درست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ان غلط ناموں کے ساتھ درست نام بھی لکھ دیئے گئے ہیں:

آذان نہیں اذان ہے......آمین نہیں امین ہے......ازفر نہیں اظفر (بہت زیادہ کامیاب) یا اذفر (خوشبو) ہے......ارخم نہیں ارحم (بہ معنٰی بہت زیادہ رحم کرنے والا) ہے......ازرائیل نہیں عزرائیل ہے......اسمائیل نہیں اسماعیل ہے......اظہرفراخ نہیں اظہرفراغ ہے......الی خان نہیں علی خان ہے......انباس نہیں اِنبعاث (بہ معنٰی تیزی سے ظاہر ہونا) ہے......اوزیر نہیں عُزیر (Uzair) ہے......اوسامہ نہیں اُسامہ ہے......اوئیس نہیں اُوَیس Ovais/Owais ہے......بسراء نہیں بسرا (جاٹوں کی ذیلی شاخ) ہے...... ذِکریا، ذِکریہ زِکریہ، زِکریا، نہیں زَکَرِیّا (Zakariya) ہے......ذاہد نہیں زاہد ہے...... ذلفقار، زلفقار، زوالفقار نہیں ذوالفقار ہے......ذین العابدین نہیں زین العابدین ہے...... رافے نہیں رافع ہے......ربی نہیں ربیع (محمد ربیع) ہے......روحیل، راحیل نہیں رحیل ہے......رہیس نہیں رئیس ہے......ریہیب نہیں رہیب ہے......ریاظ نہیں ریاض ہے (ایک نامور آرٹسٹ اپنا نام 'ریاظ' لکھتے ہیں)......زوہاد نہیں زَہّاد ہے...... زوہیر، زہَیر (Zaeer) نہیں زُہَیر (Zuhair) ہے......سُئیل نہیں سُہیل ہے......شافے نہیں شافع (محمد شافع) ہے......شوہباز نہیں شہباز ہے......شیس نہیں شیث ہے......ضجاج نہیں زُجاج (بہ معنٰی شیشہ) ہے......طٰحہ نہیں طٰہٰ ہے......طلعٰہ، طلحٰہ نہیں طلحہ ہے......طہاور علی خان نہیں تہوّر علی خان (بہ معنٰی شجاع) ہے......ظواّر نہیں زَوّار ہے......عاسم نہیں عاصم ہے......عبدالراؤف، عبدالرؤوف نہیں عبدالرؤف ہے......عبدل ارحم نہیں عبدالارحم ہے......عبدالطیف نہیں عبداللطیف ہے......عبدالمعیض، عبدالمعیذ، عبدالمعیز نہیں عبدالمُعِزّ ہے......عبدالمطین نہیں عبدالمتین ہے......عبدالسمی نہیں عبدالسمیع ہے......عذیر بلوچ نہیں عُزیر بلوچ ہے......عنصر نہیں انصر ہے......عیاز نہیں ایاز ہے......محمد فرخاد نہیں محمد فرہاد ہے...... قاصم نہیں قاسم ہے......محمد موتیم نہیں محمد مُطعِم (بہ معنٰی کھانا کھلانے والا) ہے...... مصعود نہیں مسعود ہے......مجائد نہیں مجاہد ہے......متیع اللہ نہیں مطیع اللہ ہے......نورالمین نہیں نورالامین ہے......نکی شاہ نہیں نقی شاہ ہے......نجمودین نہیں نجم الدین ہے......نہیم نہیں نعیم ہے......نصار احمد نہیں نثار احمد ہے......وسی حیدر نہیں وصی حیدر ہے......ولیم (Waleem) نہیں وِلَیم (Wiliam) ہے......آئیزہ، آعیزہ، عائیزہ، عاعیزہ، اِزّہ، عِزّہ نہیں اَعِزّہ (عزیز کی جمع) ہے......آئمہ، عائمہ نہیں ائمّہ (مد کے بغیر) ہے......ارفہ، عرفع، عرفہ نہیں ارفع ہے......اِرمہ نہیں ارم (بہ معنٰی بہشت) ہے......اریج نہیں عریج ہے......اَمّارہ نہیں عمّارہ ہے......امبریں نہیں عنبریں (بہ معنٰی عنبر جیسی خوشبو والی) ہے......اسمہ، اسمٰی، عصمہ، عصمٰی نہیں اسما ہے......افزاء نہیں افزا ہے...... اکسہ نہیں اقصٰی ہے......اُنسا نہیں النساء (یہ لاحقہ ہے مثلاً مہرالنسا)

ہے......انیقہ نہیں انیقہ ہے...... اِیشا، عیشا نہیں عیشہ (بہ معنیٰ زندگی) ہے......انزہ نہیں عنزہ ہے......
بطول نہیں بتول ہے......تسبیحہ نہیں تسبیح ہے(تسبیح کی تانیث بنانا ناروا ہے)......ثوبیہ نہیں ثویبہ ہے......
حاجرہ نہیں ہاجرہ ہے......حفظہ نہیں حفصہ ہے......ذونیرہ نہیں زُنیرہ ہے......رادیہ نہیں راضیہ ہے ......
رائیلہ نہیں راحیلہ ہے...... رُخما نہیں رُخِ ماہ ہے......ریشمہ نہیں ریشماں ہے...... سادیہ نہیں سعدیہ
ہے......سائمہ نہیں صائمہ ہے(ایک انڈین افسانہ نگار خاتون اپنا نام صائمہ اسحاق کے بجائے سائمہ
اسحاق لکھتی ہیں)......سلمہ نہیں سلمیٰ ہے......سمینہ نہیں ثمینہ ہے......شائین نہیں شاہین ہے......صائقہ
نہیں صاعقہ ہے...... صومیا نہیں صومیہ ہے......عمیمہ نہیں اُمیمہ (Omaima) ہے......عنایا نہیں عنایہ/
عنایت ہے......قرآۃ العین، قراۃ العین نہیں قرّۃ العین ہے......کنزا نہیں کنزہ ہے...... لائبہ نہیں لاعبہ
ہے......معراج اُنسا نہیں معراج النِّساء ہے......مہہ جبیں نہیں مہ جبیں ہے......منم (Manam) نہیں مُنعَم
ہے......مِصبا نہیں مصباح ہے......مہراب نہیں محراب ہے......نائید نہیں ناہید ہے......ناہیمہ نہیں نعیمہ
ہے......نائرہ نہیں نیّرہ (Nayyara) ہے......نذیم جان نہیں نظیم جان ہے......نَورِین (Naurin) نہیں
نُورَین (Noorain) ہے، ہماء نہیں ہما ہے......یسراء نہیں یُسریٰ ہے۔

قرآنی الفاظ پر بچوں کے نام رکھنے کا غلط طریقہ

آج کل یہ رواج چل نکلا ہے کہ خیر و برکت کا ذریعہ سمجھتے ہوئے، بچوں اور بچیوں کے نام قرآنی الفاظ پر رکھ دیے جاتے ہیں لیکن کسی قاعدے اور قرینے کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ قرآن کے فہم سے نابلد لوگ، قرآن کے کسی ایک لفظ کا انتخاب کر کے لڑکے یا لڑکی کا نام رکھ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں حُسنِ معنیٰ سے زیادہ خوش آوازی پر اکثر کان دھرے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی بے علمی کی کیفیت ہے۔ ایسا کرنے سے جہاں معنیٰ اور مفہوم معدوم ہو جاتے ہیں وہاں قرآن کی لفظی اور معنوی تحریف کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ راقم کے مشاہدے میں ایسے کئی نام آتے رہتے ہیں، ان میں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

الذین (Alzeen): صاحبِ نام 'محمد الذین' کا کہنا ہے کہ یہ قرآنی نام ہے۔ قرآنِ مجید میں اَلَّذِینَ اکثر مقامات پر مرقوم ہے۔ عقیدت یا برکت کے حصول کے لیے اسے نام کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔ اَلَّذِینَ اسمِ موصول جمع ہے جس کا معنی ہے ''وہ لوگ جو۔'' صاحبِ نام کو ادراک نہیں ہے کہ اَلَّذِینَ کو اَلْذِین (Alzeen) لکھنے اور پڑھنے سے لفظی اور معنوی تحریف ہو جاتی ہے۔

بسم اللہ خان: اس نام کو اختیار کرنے کا سبب قرآن مجید میں ایک سو چودہ (۱۱۴) مرتبہ آنے والی مقدس آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے جس کی شعائرِ اسلام میں حیثیت سرِ عنوان کی ہے۔ بسم اللہ کو ہماری زبان، محاورے اور روزمرّہ میں بہت دخل ہے مگر نام رکھنے کا پس منظر قرآن سے عقیدت اور برکت کا حصول ہی ہے۔

حسنت (Hasnat): ایک طالب علم نے اپنا نام حسنت (Hasnat) بتایا۔ نام کے معنٰی کے استفسار پر اس نے وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (الکہف: ۳۱) اور خٰلِدِیْنَ فِیْهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا (الفرقان: ۷۶) کی طرف توجہ دلائی مگر حَسُنَتُ (Hasnat) کی قرآنی لفظ حَسُنَتُ سے کوئی اِعرابی اور معنوی مناسبت نہیں ہے۔

زنیم: بعض اوقات ہم آہنگ اور ہم وزن ناموں کی پابندی بھونڈی معنویت پیدا کر دیتی ہے۔ ایک صاحب نے بڑے بیٹے کا نام شمیم رکھا، دوسرے کا تسلیم، تیسرے کا کریم اور چوتھے کا، معنی پر غور کیے بغیر، سورۃ القلم سے تلاش کر کے ہم وزن لفظ ''زنیم'' رکھ دیا۔ زنیم کا معنی، حرام زادہ، ہے۔

عروۃ الوثقیٰ: یہ ایک لڑکے کا نام ہے جسے قرآنی نام سمجھ کر رکھا گیا ہے۔ ''العروۃ الوثقیٰ'' کی ترکیب سورت البقرہ اور سورت لقمان میں آئی ہے جس کا معنی ہے ''مضبوط گرہ'' اور ''مضبوط حلقہ۔'' اس میں کئی باتیں قابلِ فہم ہیں۔ پہلی تو یہ کہ لفظ ''عروۃ'' مؤنث ہے اِس اعتبار سے یہ نام، مذکر نہیں ہوسکتا۔ دوسری یہ کہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کی ترکیب، توصیفی ہے جس میں موصوف اور صفت دونوں پر لام تعریف (اَلْ) آئے گا یا دونوں اِس کے بغیر ہوں گے۔ تیسری یہ کہ نام رکھنے کے لیے اس ترکیب میں کوئی معنوی مناسبت نہیں ہے۔

فابد (Fabad): ایک طالب علم کا نام فابد (Fabad) ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ نام قرآنی آیات فَاعْبُدْهُ وَ تَوَکَّلْ عَلَیْهِ (ھود: ۱۲۳) اور فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طٰہٰ: ۱۴) سے ماخوذ ہے لیکن فابد اور فَاعْبُدْ میں کوئی لفظی مناسبت نہیں ہے۔

کافر: برطانیہ سے عازمین حج و عمرہ کے قافلے لے کر جانے والے ایک معلّم حج کی روایت کے مطابق، ایک عازمِ حج کے پاسپورٹ پر اُس کا نام ''کافر'' لکھا ہوا دیکھا تو میں چکرا گیا اور حیرت سے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بے ہودہ نام ہے؟ کہیں غلطی سے تو نہیں لکھ دیا گیا؟ کہنے لگے جی یہی میرا نام ہے، اب ساٹھ سال سے زائد عمر میں اسے تبدیل کرنا بڑے تردد اور مسائل کا باعث بنے گا۔ لفظ ''کافر'' قرآن میں متعدد جگہوں پر آیا ہے۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جا

سکتا کہ اسے مقدس لفظ سمجھ کر نام کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہو۔

والّیل: میرے دورِ پرنسپل شپ میں، ایک طالبِ علم نے کالج میں داخلہ لیا جس کا نام 'والّیل عزیز' تھا۔ عزیز احمد اُس کے والد کا نام تھا۔ اُسی کالج میں اُس کا ایک پھوپھی زاد، اسلامیات کا لیکچرر ہے جس نے بتایا کہ والّیل کے والدین نے قرآنی آیت وَالَّیلِ اِذَا یَغۡشٰی (الّیل:۱) کی نسبت سے یہ نام رکھا ہے۔ یہاں بھی اس نام کی معنویت اور مناسبت کا فقدان ہے۔

ابتر: ایک صاحب نے، اپنے آپ کو بہت سمجھ دار اور خواندہ خیال کرتے ہوئے، اپنی تین بیٹیوں کے نام بڑے فخر سے سورۃ الکوثر سے منتخب کیے۔ بڑی بیٹی کا نام ''کوثر''، دوسری کا نام ''وانحر'' اور تیسری کا ''ابتر''۔ ''کوثر'' (خیر کثیر) اپنی معنویت کے اعتبار سے دل کش اور درست نام ہے۔ ''وانحر'' (اور آپ قربانی کریں) مہمل جبکہ ''ابتر'' (لاولد) بالکل غلط اور بدتر نام ہے۔

اِقرا: بچیوں کا رکھا جانے والا نام اِقرَا جو غلط طور پر اقراء (بابِ افعال کے وزن پر) لکھا جاتا ہے، بہت عام ہے۔ اس کی سند بھی قرآنی آیت اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ (العلق:۱) سے لائی جاتی ہے۔ اس کا معنٰی ہے ''پڑھ''۔ یہ مہمل نام مناسبت اور معنویت سے کوسوں دور ہے۔

اَنعمت (Anamt): قرآن مجید کی آیتِ مقدسہ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ (الفاتحہ:۶) میں آنے والے لفظ اَنۡعَمۡتَ کی لفظی شکل اور صوتی آہنگ سے متاثر ہو کر بچی کا یہ نام رکھ لیا گیا مگر بولنے اور لکھنے کی غلطی نے یہاں بھی معنوی اور لفظی تحریف کر دی۔

ایشا: اسی طرح خواتین کے لئے ایک مروّج نام ایشا (Eisha) ہے جو اصل میں عشاء کی متغیر صورت ہے۔ عشا کا معنٰی رات ہے۔ صلوٰۃ العشاء کی ترکیب کے علاوہ یہ قرآنی حوالہ بھی پیشِ نظر ہے وَجَاۤءُوۡۤ اَبَاہُمۡ عِشَآءً یَّبۡکُوۡنَ (یوسف:۱۶)۔ ایک دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق یہ نام فَہُوَ فِیۡ عِیۡشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ (القارعہ:۷) سے ماخوذ ہے۔ عشا اور عیشہ کو ایشا میں تبدیل کرنے کے پس منظر میں جہالت ہو یا جدّت پسندی، قرآن کی لفظی و معنوی تحریف کے زمرے میں ہی آئے گی۔

بسم اللہ جان: بسم اللہ پر رکھا گیا یہ نام عورتوں میں بھی مروج ہے۔

رضیّت: راقم کے ایک دوست پروفیسر کی بڑی بیٹی کا نام رضیّت (Raziyat) ہے۔ نام کا معنٰی پوچھا گیا تو انھوں نے قرآنی آیت کے حصے رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا (المائدہ:۳) کی طرف اشارہ کیا۔ رَضیّت (بروزن وصیّت) اور رَضِیۡتُ میں لفظی اور معنوی تفاوت واضح ہے۔

زانیہ: ایک صاحب کے بقول، اُن کے جاننے والوں کی نَومَولُود بچی کا نام پوچھا تو جواباً کہا گیا ''زانیہ''۔ میں نے دل ہی دل میں استغفار پڑھا اور پوچھا کہ یہ نام کیوں رکھا ہے؟ کہنے لگے کہ قرآن مجید دیکھ کر رکھا گیا ہے۔

لاریب: اس کا معنی ہے ''کوئی شک نہیں۔'' یہ نام سورۃ البقرہ کی دوسری آیت ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں) سے اخذ کرلیا گیا ہے۔

لِمَن یّشاء: ایک صاحب نے اپنی بچی کا نام، قطع نظر اس کے کہ معنی کیسے ہیں، سورۃ البقرہ کی آیت ۲۸۴ سے لِمَن یّشاء رکھا۔ لمن یّشاء کا معنی ہے ''جسے وہ چاہے گا۔'' یہ نام بھی معنویت اور مناسبت سے کوسوں دور ہے۔

مائدہ: سورۃ المائدہ میں ذکر ہونے والے لفظ مائدہ پر ہمارے ہاں، لڑکیوں کا نام رکھنے کا رجحان عام ہو رہا ہے۔ مائدہ کا معنٰی ہے ''دسترخوان۔'' اس نام میں بھی کوئی معنوی مناسبت نہیں ہے۔

نرید (Nareed): کہا جاتا ہے کہ بچیوں کے لیے یہ نام بھی قرآن سے اخذ کیا گیا ہے۔ سورت المائدہ، ہُود، الاسراء، القصص اور الانسان میں ''نُرِیْدُ'' آیا ہے اور یہ فعل مضارع کا صیغہ جمع متکلم ہے جس کا معنی ہے ''ہم ارادہ کرتے ہیں''، ''ہم چاہتے ہیں۔'' لکھنے اور بولنے میں نام کے طور پر اس کی کوئی معنوی اور اِعرابی مناسبت نہیں ہے۔

نشرح: راقم کے مشاہدے میں ایک خاتون کا نام نشرح ہاشمی آیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام قرآنی آیت اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (الم نشرح:۱) سے ماخوذ ہے۔ ''نشرح'' فعل مضارع کا صیغہ جمع متکلم ہے جس کا معنی ہے ''ہم نے کھول دیا۔'' یہ نام بھی معنوی مناسبت سے کوسوں دور ہے۔

وریشا: لڑکیوں کے ناموں میں سے ایک نام وریشا ہمیں بہت ملتا اور سنائی دیتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک صاحب نے سورۃ الاعراف کی آیت ۲۶ سے ''وریشا'' منتخب کر کے اپنی بیٹی کو اس سے موسوم کیا۔ یہ اصل میں وَرِیْشاً ہے۔ ریش کا معنی زینت اور آرائش ہے۔ واؤ کے ساتھ مل کر یہ نام مہمل ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ریشاً حالتِ مفعولی میں ہے اس لیے آخر میں الف کا اضافہ ہے۔

مُندَرَجہ بالا قرآنی الفاظ کو ناموں کا جامہ پہنانا جہاں نام کی ہئیت اور وضع (format) کی خلاف ورزی ہے وہاں یہ عمل قرآن کی لفظی اور معنوی تحریف کے زمرے میں بھی آتا ہے۔ بعض ناموں کے پس منظر میں عقیدت، عقیدہ اور مسلکی تأثر غُلو کی حد تک کارفرما ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کالج جھنگ میں

پڑھانے والے، راقم کے ایک دوست پروفیسر نے بتایا کہ اُن کے طلبہ میں سے ایک طالبِ علم کا نام ''صدقہ پنج تن پاک دا'' تھا۔ فنی اعتبار سے یہ جملہ، نام کی ساخت اور ہیئت کے مطابق نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش کے موقع پر والدین کے جذبات، کیفیت اور تأثرات سے بھی بعض نام تشکیل پا جاتے ہیں جیسے ایک صاحب کے ہاں ساتویں بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام ''اللہ معافی'' رکھا گیا۔

عَمرو (Am,r) کی واوِ زائدہ کا غلط استعمال

یہ بات مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ عَمرُو کی واو کو نافہمی میں پڑھ جاتے ہیں۔ یہ واو عُمر (Umar) اور عَمرو (Am,r) میں فرق کرنے کے لئے عَمر کے آخر میں لکھی جاتی ہے لیکن پڑھی نہیں جاتی۔ اسے واوِ زائدہ اور واوِ فارقہ کہتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

عُمرُو بن العاص نہیں عَمرُو بن العاص ہے[۳]...... عُمرُو بن ہشام نہیں عَمرُو بن ہشام ہے[۴] ......عُمرُو بن عبدوَدّ نہیں عَمرو بن عبدوَدّ ہے[۵]......عُمرُو بن معدی کرب نہیں عَمرُو بن معدی کرب[۶] ہے۔

کنیت میں اَبُو کی غلط تاویل

یہ بات اکثر مشاہدے میں آتی رہتی ہے کہ اَعلام (شخصیات) کی کنیت بیان کرتے وقت اَبُو کا معنی ہر مرتبہ باپ ہی لیا جاتا ہے جو قواعد اور معنی کے اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ابو ہریرہ کا معنی بلیوں کا باپ بیان کیا جاتا ہے جسے سنتے ہی کراہت اور قباحت کا احساس ہوتا ہے۔ اسی طرح بغیر سوچے سمجھے ابوتراب، ابوحنیفہ اور ابولہب کا معنی بالترتیب بکر کا باپ، مٹی کا باپ، حنیفہ کا باپ اور لہب کا باپ کیا جاتا ہے۔ یہ سب معانی خلافِ حقیقت اور خلافِ واقعہ ہیں۔

کنیت کی قسمیں

کنیت دو قسم کی ہوتی ہے، نسبی اور وصفی۔ کنیتِ نسبی میں ابو کا معنی یقیناً ''باپ'' ہی ہوتا ہے جب کہ وصفی میں ابو کا معنی ''والا'' ہوتا ہے۔

کنیتِ نسبی کی مثالیں

ابوالبشر (انسانوں کا باپ)[۷] ابوالانبیاء (نبیوں کا باپ)[۸] ابوالقاسم (قاسم کا باپ)[۹] ابوطالب (طالب کا باپ)[۱۰] ابوحفص (حفص کا باپ)[۱۱] وغیرہ۔

کنیتِ وصفی کی مثالیں

ابوبکر (حق کو قبول کرنے میں پہل کرنے والا)[۱۲] ابوتراب (مٹی پر بیٹھنے والا)[۱۳] ابوہریرہ

(بلی کے بچوں سے شفقت کرنے والا)[۱۴] ابوحنیفہ (دینِ حنیف پر چلنے والا)[۱۵] ابولہب (شعلے جیسے رنگ والا)[۱۶] ابوجہل (جہالت والا۔ابوالحکم کا متضاد)[۱۷] ابوالحکم (حکمت ودانائی والا)[۱۸] ابوالاعلیٰ (اللہ سے نسبت رکھنے والا)[۱۹] ابوالخیر (بھلائی والا)[۲۰] ابوالکلام (گفتگو اور بیان پر قدرت رکھنے والا) [۲۱] ابوالبرکات (برکتوں والا)[۲۲] ابوالحسنات (نیکیوں اور بھلائیوں والا)[۲۳] وغیرہ۔

معنی اور زمانے کی مناسبت سے ناموں کی ترتیب

سلیقے اور قرینے سے رکھے ہوئے بچوں کے نام، ان کے والدین کے ذوق سلیم کا پتا دیتے ہیں۔ عاقب کا معنی ہے بعد میں پیدا ہونے والا، اگر پہلے بچے ہی کا نام عاقب رکھ دیا جائے تو والدین کی بدذوقی ظاہر ہو جاتی ہے۔اسی طرح اگر بڑے بیٹے کا نام اصغر اور چھوٹے کا اکبر ہو تو بات نہیں بنتی۔یہی قاعدہ کبیر اور صغیر میں کارفرما ہوگا۔محمد ثانی، محمد رابع، محمد خامس کی بھی منطقی ترتیب ہونی چاہیے۔انبیاء کے اسمائے مبارکہ پر رکھے گئے ناموں میں بھی زمانی ترتیب کا ہونا ذوقِ سلیم کا مظہر ہے یعنی بڑے بیٹے کا نام ابراہیم اس کے بعد علی الترتیب اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یوسف وغیرہ۔ایسا نہ ہو کہ بڑے بیٹے کا نام نوح ہو اور اس سے چھوٹے کا آدم، یا بڑے کا صالح اور چھوٹے کا ہُود۔

اسم تصغیر کے وزن پر ناموں میں لفظی اور معنوی تحریف

اس وزن پر آنے والے ناموں میں سے لفظی تصرف کی زد میں آنے والا اہم نام اُسَید (Usaid) ہے جو اسد کی تصغیر ہے۔اُسَید کا معنی ہے چھوٹا شیر لیکن ہمارے ہاں اس نام کے الف کو حذف کر کے سَید (سَید محمد) بنا لیا گیا ہے۔اسی طرح فُضَیل (Fuzail) کو فضیل (Fazeel)، عُبَید (Ubaid) کو عَبِید (Abeed)، زُبید (Zubaid) کو زبید (Zabeed) اور زہیر (Zuhair) بہ معنی ''چھوٹا پھول'' کو زہیر (Zaheer) غلط طور پر لکھا اور پکارا جاتا ہے۔ذُہیب (Zuhaib) بہ معنی ''سونے کی ڈلی'' کو خوب تختۂ مشق بنایا گیا ہے جسے غلط طور پر ذوہیب، زہیب، زوہیب۔ژوہیب، ظہیب، ظوہیب، زوئیب اور ظئیب کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ذُہیب (Zuhaib) کی مذکورہ متغیر اور غلط صورتوں سے راقم سمعی اور بصری لحاظ سے خوب واقف ہے۔

مرکب نام ملا کر لکھنے کی قباحتیں

لفظی اور حرفی اختصار کی دوڑ میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کو ملا کر لکھنے کی وبا عام ہوگئی ہے۔ ہر لفظ جداگانہ لکھنے کے بجائے الفاظ کو ملا کر لکھنے سے ان کی بنیادی اور امتیازی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔خود مختار

اور علیحدہ علیحدہ لفظوں کو جوڑ کر یا ملا کر لکھنے کی وباء نے پیکرِ معانی اور حسنِ یکتا کو مجروح اور ان کی انفرادی حیثیت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ مرکب ناموں کو بھی ملا کر لکھنے کا رواج عام ہے۔ ایسا کرنا الجھن کا باعث بنتا ہے اور بصری طور پر بھی ناگوار گزرتا ہے جیسے کرمداد، صاحبداد، صاحبدین، ولیداد اور خانزادہ وغیرہ۔ کچھ نام ایسے ہیں جن میں ولی کا لاحقہ آتا ہے جیسے شاہ ولی، راج ولی، خان ولی اور راہ ولی وغیرہ۔ لوگ عام طور پر انہیں ملا کر شاہولی، راجولی، خانولی، اور راہولی کی شکل میں لکھتے ہیں۔ ملا کر لکھے گئے یہ نام الجھن اور اشتباہ پیدا کرتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر Shaholi.....Rajoli.....Khanoli.....Raholi کے تلفظ کا گمان گزرتا ہے۔

''الف نون زائد'' والے مبہم اور بے معنی نام

الف نون زائد کے ساتھ مکمل ہونے والے نام ہمارے ہاں بہت مروج ہیں۔ یہ نام اپنے اندر غایت درجہ دل کشی، جامعیت اور معنویت رکھتے ہیں جیسے جبران، سبحان، سلمان، سلیمان، سفیان، عثمان، عرفان، عمران، فرقان، قربان، لقمان اور نعمان وغیرہ۔ آج کل جدت پسندی میں الف نون زائد پر ختم ہونے والے ایسے نام بھی رکھے جا رہے ہیں جو بے معنیٰ، مبہم اور بے اصل ہیں جیسے الیان، ہمنان، ایان، افنان، اذنان، شہفان، زیان، عدیان، عضلان، علیان، ضحبلان، نغمان وغیرہ۔

''اِمالہ'' کے بے جا استعمال سے ناموں کے تلفظ اور ہجوں میں بگاڑ

الف کو ''ی'' کی طرف اور زبر کو زیر کی طرف جھکا کر ادا کرنے کو اِمالہ کہتے ہیں مثلاً اَحسن اور اَحمد کو اِمالہ دے کر اِحسن اور اِحمد ادا کرنے کی اجازت ہے۔ الف کے بعد ''ی'' کا شائبہ بولنے کی حد تک تو درست ہے مگر لکھنے میں ہرگز جائز نہیں۔ بعض لوگ امالہ کے استعمال کی حد سے تجاوز کرتے ہوئے اَحسن اور اَحمد کے الف کے نیچے زیر پڑھتے ہیں بلکہ کچھ لوگ لکھ بھی دیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے Ahsan سے Ihsan اور Ahmad سے Ihmad بن جاتا ہے۔ یہ تصرف غلط اور نا روا ہے۔

فعیل کے وزن پر کچھ ناموں میں غلطی

فعیل کے وزن پر آنے والے ناموں کی تعداد بہت زیادہ ہے جیسے سلیم، رشید، علیم، حلیم، شریف اور بشیر وغیرہ۔ کچھ مذکر نام ایسے ہیں جن کے آخر میں ''ہ'' آتی ہے اور متصل لکھی جاتی ہے جیسے شبیہ (ہم شکل)، وجیہ (خوش وضع)، نبیہ (خبردار کرنے والا) اور فقیہ (بہت سمجھدار۔ علم فقہ کا عالم) وغیرہ۔ ان ناموں میں بے خبری اور لاعلمی کی وجہ سے آخر میں ایک کے بجائے دو مرتبہ ''ہ'' لکھی جاتی ہے جیسے شبیہہ، وجیہہ،

نبیہہ اورفقیہہ وغیرہ۔ دومرتبہ ''ہ'' آنے سے یہ اسماءمونث کے صیغے میں چلے جاتے ہیں اورخواتین کے نام بن جاتے ہیں۔ تفعیل کے وزن پر کچھ مصادر مثلاً تشبیہ،توجیہ اور تنبیہ وغیرہ میں بھی دومرتبہ ''ہ'' لکھ کر سنگین غلطی کی جاتی ہے جیسے تشبیہہ،توجیہہ اور تنبیہہ وغیرہ۔

اَفعَل کے وزن پرآنے والے ناموں کی غلطی

اَفعَل التفضِیل کے وزن پر ہمارے ہاں مردوں اورعورتوں کے نام عام ہیں۔عمومی طور پر ان میں دوقسم کی غلطیاں پائی جاتی ہیں،لفظی اور تذکیروتانیث کی مثلاً انعم کوانم اورعنم لکھا جاتا ہے۔دوسری بڑی غلطی یہ کہ مذکرنام خواتین نے اختیار کر لیے ہیں مثلاً انعم،ایمن اوراقصیٰ وغیرہ۔انعم،ایمن اوراقصیٰ مذکر ہونے باوجودخواتین کے عام نام ہیں،راقم کے حلقہءشناسائی میں ایک محترمہ،پروفیسرڈاکٹرارشد خانم کے نام سے ہیں۔ایمن کے ساتھ اُم کا سابقہ لگ جائے تو یہ نام مؤنث بن جاتا ہے جیسے اُمِ ایمن [۲۴]۔ اسی طرح کلثوم بھی مذکرنام ہے جسے ہمارے ہاں مؤنث کے طور پراختیارکرلیا گیا ہے۔مؤنث بنانے کے لیےاس سے پہلے اُم کا سابقہ لگانا ضروری ہے جیسے اُمِ کلثوم [۲۵]۔اَفعَل کے وزن پرآنے والے مذکراور مونث ناموں میں سے یہ نام زیادہ ترمستعمل ہیں:

انعم (مذکر) سے نُعمیٰ (بابرکت ہاتھ،بہت زیادہ انعام دینے والا)......اقصیٰ سے قصوٰی (بہت ہی دور)......اَیمن سے یُمنیٰ (نڈر۔محفوظ)......اَیسر سے یُسرٰی (ثروت مند)......اَطیَب سے طُوبیٰ (بہت پاکباز)......اَسعَد سے سُعدٰی (بہت مبارک)......اسلم سے سُلمیٰ (نہایت سالم)......اکبر سے کُبرٰی (بہت بڑا/بڑی)......اعظم سے عُظمیٰ (بہت بڑا/بڑی)......اصغر سے صغریٰ (بہت چھوٹا/چھوٹی) ......ارشد سے رُشدیٰ (بہت زیادہ ہدایت یافتہ)

اُمّت العزیز اوراَمَۃ العزیز میں فرق

اُمّت کا معنی جماعت اورقوم جبکہ اَمَۃ کا معنی کنیز ہے۔اللہ تعالیٰ کے اسماءالحسنیٰ سے پہلے اَمَۃ لگا کرخواتین کے نام رکھے جاتے ہیں جیسے اَمَۃ اللہ (اللہ کی کنیز)۔اسی طرح اَمۃ العزیز،اَمۃ القادر،اَمۃ الکریم،اَمۃ المنان اوراَمۃ الحفیظ وغیرہ۔بے خبری اور جہالت سے اَمۃ کواُمّت سے بدل دیا گیا ہے اوربغیر سوچے سمجھے اُمّت اللہ،اُمّت العزیز،اُمّت الحفیظ،اُمّت المنان اوراُمّت الکریم وغیرہ نام رکھے جارہے ہیں۔ان ناموں کا معنی اللہ کی کنیز کے بجائے اللہ کی اُمّت ہوجاتا ہے جوکسی طور پردرست نہیں۔بعض لوگ اختصارِحرفی سے کام لیتے ہوئے اَمتل عزیز اوراَمتل قادر لکھتے ہیں اورناموں کومبہم بنادیتے ہیں۔

اسی طرح اَمَۃ الحفیظ کی جگہ اُمّت الحفیظہ لکھنے سے نہیں شرماتے۔ اس میں ایک غلطی تو اَمَۃ کی جگہ اُمّت کا لکھنا ہے۔ دوسری بڑی غلطی یہ ہے کہ الحفیظ اللہ کا صفاتی نام ہے جسے مونث کے صیغے میں الحفیظہ لکھنا کمالِ بے ادبی ہے۔

''کبریا'' نام نہیں رکھا جا سکتا

بعض ناواقفِ لسان ''زکریا'' پر قیاس کرتے ہوئے اپنے بچوں کا نام ''کبریا'' رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً غلام کبریا، محمد کبریا حتیٰ کہ کبریا حسین۔ ''کبریا'' اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے بلکہ یہ صفت ہے جس کا معنی ''بڑائی'' ہے۔ سند کے طور پر قرآنِ حکیم کی یہ آیۂ کریمہ پیشِ نظر رہے:

وَلَہُ الکبریَاءُ فِی السّمٰوٰتِ والارضِ وھو العزیز الحکیم. (الجاثیہ:۳۷)

ترجمہ: (بس اُسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں بڑائی ہے اور وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔)

شاذ اور شاذیہ کے ہجوں کی غلطی

شاذ عربی کا لفظ ہے جس کا معنی منفرد، نایاب، خال خال اور نادر ہے۔ اردو میں، اسی سے ایک ترکیب ''شاذ و نادر'' بہت مستعمل ہے۔ شاذ ہی سے خواتین کے نام شاذیہ رکھے جاتے ہیں۔ قاعدے کی رُو سے، شاذ سے نسبت رکھنے والی خاتون کو شاذیہ کہتے ہیں۔ اس کا معنی بھی قیمتی اور نایاب ہے۔ عام لوگوں کو چھوڑیے، پڑھے لکھے بھی شاذ اور شاذیہ کو ذال کے بجائے زاء سے لکھتے ہیں۔ شاز (زاء کے ساتھ) کوئی لفظ نہیں ہے اور نہ کوئی اس کا معنی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اساتذہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ حتیٰ کہ پی ایچ۔ ڈی خواتین و حضرات، جن کے نام شاذ اور شاذیہ ہیں، غور اور توجہ کیے بغیر اپنے نام ذال کے بجائے زاء سے لکھتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کے ایک نامور شاعر شاذ تمکنت کا نام درست لکھا جاتا ہے لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایک استاد، پروفیسر راشد شاز غلط طور پر شاذ کو شاز لکھتے ہیں۔ اسی طرح ایک لسان شناس ڈاکٹر شازیہ آفتاب کی نظر بھی اپنے نام کی غلطی کی طرف نہیں گئی، وہ بھی شاذیہ کے بجائے شازیہ لکھتی ہیں۔ ''فروغِ اردو میں اخبارِ اردو کا کردار'' کے موضوع پر ایم فل کا مقالہ لکھنے والی ایک محترمہ شازیہ مجید ملک بھی خیر سے شاذیہ کو شازیہ لکھتی ہیں۔ راقم، کیمبرج یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ۔ ڈی کرنے والی خاتون، نامور سائنس دان اور ماہر تعلیم ڈاکٹر شاذیہ نعیم کو جانتا ہے جو شعوری طور پر شازیہ کے بجائے شاذیہ ہی لکھتی ہیں حالانکہ ان کا میدان زبان و ادب نہیں، سائنس ہے۔

ملائکہ، ملِیکا یا مُلیکہ؟

ہمارے ہاں لڑکیوں کا نام ملائکہ بھی رکھا جاتا ہے جو قاعدے کی رُو سے صحیح نہیں ہے۔ یہ مَلَک کی جمع ہے یعنی فرشتے۔ درست نام مُلیکہ (Mulaika) ہے جو مَلِکہ کا اسم تصغیر ہے یعنی چھوٹی مَلِکہ۔ معروف صحابی اور رسول اللہ ﷺ کے خدمت گزار حضرت اَنس ؓ کی والدہ محترمہ کا نام مُلیکہ تھا جن کی کنیت اُم ِسلیم تھی۔ اس مبارک نام کو غلط شکل دے کر ملائکہ، مَلِیکہ (Maleeka) اور مَلِیکا لکھا اور پکارا جاتا ہے۔

علیز، علیزہ اور علیزے کی اصل

ان ایجادِ بندہ ناموں کو لغت سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ علیز (علیز احمد) لڑکوں کا جبکہ علیزہ اور علیزے لڑکیوں کا نام رکھا جاتا ہے۔ راقم کے مشاہدے کی بات ہے کہ علی کی نسبت سے کئی دکانوں کا نام، انگریزی میں لکھا ہوا نظر آتا ہے مثلاً Ali's Hair Fashion اور Ali's Boutique وغیرہ۔ یہی عبارت اردو میں ''علیز ہیئر فیشن'' اور ''علیز بوتیک'' کی صورت میں لکھی جانے لگی۔ جدت پسندوں اور خوش آوازی کی طرف دھیان دینے والوں کو اُردو میں لکھا ہوا ''علیز'' بہت بھایا۔ اسی سے علیز مذکر نام کی شکل اختیار کر گیا۔ علیز کچھ تصرف کے بعد علیزہ بن گیا اور مونث نام قرار پایا۔ علیزے بھی علیز کی متغیر صورت ہے۔

بِسمہ (Bisma) اصل میں بِسمِہٖ ہے

بچیوں کا نام بسمہ (Bisma) لفظی اور معنوی، ہر دو اعتبار سے بعید از قیاس ہے۔ یہ اصل میں بِسمِہٖ (بِاِسمِہٖ تعالیٰ) ہے۔ ہٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ایک دوسرا نام باسمہ (Basma) بھی مروج ہے۔ اگر یہ ''باسِمہ'' (Basima) ہو تو اس کا معنی ''مسکرانے والی'' ہے۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ باسُمہ بِاسِمِہٖ (باسمہٖ تعالیٰ) کی متغیر شکل ہے۔

نَو رِین (Naureen) کی حقیقت

نَو رِین (Naureen) ایجاد بندہ ہے۔ اس خود ساختہ نام کی اصل نُو رَین (Noorain) ہے۔ یہ تثنیہ ہے جس کا معنی ہے دو نور۔ نُو رَین کا واضح تصور ہمیں خلیفہء راشد حضرت عثمان ؓ کے لقب ذُوالنورَین سے ملتا ہے۔

خواتین کے ناموں میں اَلِف اور نُونِ غنہ کا تصرف

لکھنے اور پکارنے میں یہ تصرف عام طور پر پنجاب میں کیا جاتا ہے۔ راقم نے عدالتی مقدمات کی فائلوں اور ملکی انتخابات کے موقع پر رائے دہندگان کی فہرستوں میں نام کا یہ بگاڑ دیکھا ہے مثلاً صابرہ کو صابراں اور ساوراں......زَہرہ کو زُہراں بلکہ ظُہراں اور جُہراں......نذیرہ، بشیرہ، مُنیبہ، حبیبہ، حفیظہ، حنیفہ، صغریٰ، شریفہ، صدیقہ، سکینہ، فاطمہ، لُبنیٰ کو بالترتیب نذیراں، بشیراں، منیباں، حبیباں، حفِیظاں، حنیفاں، صغراں، شریفاں، صدیقاں، سکیناں، فاطماں اور لبناں بلکہ لُبھناں پکارا جاتا ہے۔ کچھ ناموں کو بولتے وقت پہلا حرف حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً حنیفاں، حفیظاں اور حبیباں کو نھِیفاں، فیظاں اور بھیباں پکارا جاتا ہے۔ الف اور نون غنہّ کے علاوہ واؤ کا اضافہ بھی بگاڑ کی ایک صورت ہے مثلاً جیرو (نذیرو)، شریفو، صدیقو، بھیبو، نھیفو اور بشیرو وغیرہ۔

مُختار اور مَختیار

عربی لفظ مختار، قاعدے کے رُو سے اسم مفعول ہے جس کا معنی ''اختیار دیا گیا'' اور ''چُنیدہ'' (Selected) ہے۔ ہمارے ہاں، مردوں کے لیے مختار احمد اور خواتین کے لیے مختار بیگم نام رکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے بگاڑ کر مختیار احمد، مختیاراں بیگم یا صرف مختیارہ اور مختیاراں پکارتے اور لکھتے ہیں۔ مختیار لغت کے اعتبار سے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسے بعض ناواقفِ علم لوگوں نے بختیار (بخت یار) کے انداز پر قیاساً بنالیا ہے۔

نیرّ اور نیئرّ میں فرق

نیرّ عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ نور ہے جبکہ نیئرّ ہندی لفظ ہے اور ہندوؤں کی ایک ذات کا نام ہے۔ ہمارے ہاں نیر ناموں کا حصہ ہوتا ہے جیسے نیرّ مسعود، نیرّ بخاری اور نیرّ صمدانی وغیرہ اور شاعروں کا تخلص بھی جیسے شفیع الدین نیرّ۔ یہ رسمِ بد چل نکلی ہے کہ نیرّ پر آنے والی شد کو ہمزہ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ شد کو ہمزہ سے بدلیں تو نیرّ سے نیئرّ بن جاتا ہے جیسے معروف ہندوستانی صحافی آنجہانی کلدیپ نیئرّ۔ یہ بھی طُرفہ تماشا ہے کہ ہمارے ہاں کلدیپ نیئرّ کو نیرّ لکھا اور پکارا جاتا ہے جب کہ نیرّ بخاری کو نیئرّ بخاری۔

نیامت کی اصل

پنجابی لہجے میں، ''نیامت'' نعمت کی متغیر صورت ہے۔ پنجاب میں، اس نام کے حامل افراد کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ راقم، ایک صاحب پروفیسر نیامت علی کو جانتا ہے جو زبان وادب کے استاد تھے مگر

نعمت علی کے بجائے نیامت علی ہی لکھتے تھے۔ ہمارے ہاں نام کو اتنا غیر اہم خیال کیا جاتا ہے کہ اگر غلط ہو تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔

اِن شاءَاللہ اور اِنشاءُاللہ خان اِنشاء میں فرق

اِن شاءَاللہ شعائرِ اسلام میں شامل ایک کلمہءِ خیر ہے جس کا معنی ہے اگر اللہ نے چاہا تو۔۔۔۔ اس جملے میں ان حرفِ شرط ہے شاءَ فعل اور اللہ فاعل۔ دوسرا لفظ اِنشاءُ اللہ، ترکیب کے اعتبار سے مرکبِ اضافی ہے جس کا معنی ہے اللہ کی تخلیق۔ انشاءُ اللہ خان انشاء اردو کے ایک بڑے شاعر گزرے ہیں۔ تین اجزاء میں لکھے گئے ان شاءَ اللہ کے ہمزہ پر زبر ہے جبکہ ملا کر لکھے گئے انشاءُ اللہ کے ہمزہ پر پیش آتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت اِنشاءُ اللہ خان اِنشاء کو غلط طور پر انشاءَ اللہ (پیش کے بجائے زبر) ہی ادا کرتی اور لکھتی ہے۔

اَلٰہ یار یا اِلٰہ یار؟

ہمارے ہاں دو نام اِلٰہ یار اور اِلٰہ بخش بے خبری اور لاعلمی کی بنا پر اَلٰہ یار اور اَلٰہ بخش لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ راقم کی رائے میں ان کی صحیح اور مکمل شکل اللہ یار اور اللہ بخش ہے۔ ہندوستان کا ایک معروف شہر اِلٰہ آباد اور سندھ (پاکستان) کا شہر ٹنڈو اِلٰہ یار بھی اس غلطی کی زد میں آتے ہیں۔ اِلٰہ کو غلطی سے اَلٰہ لکھ دیا جاتا ہے۔ اَلٰہ کے طرزِ کتابت میں دو غلطیوں کا ہمیں علم ہونا چاہیے، ایک تو الف پر زبر کے بجائے نیچے زیر ہونی چاہیے دوسرا یہ کہ اَلٰہ لکھنے میں ''ہ'' دوبار آجاتی ہے جس سے لفظی تصرّف ہوجاتا ہے۔

جمع اور مبالغے کے صیغے میں نام

کئی نام جمع اور مبالغے کے صیغے میں مستعمل ہیں جیسے عِباد (عِباد علی، عِباد احمد، محمد عِباد وغیرہ)۔ یہ اصل میں عَباد ہے یعنی بہت عبادت گزار۔ عِباد عبد کی جمع ہے......زُوّار اور......زُبّاد......زائر اور زاہد کی جمع ہیں جب کہ زَوّار یعنی بہت زیادہ ملاقات کرنے والا اور زَبّاد یعنی بہت زیادہ زُہد اختیار کرنے والا اسمِ مبالغہ ہیں۔ ''اَعزّہ'' عزیز کی جمع ہے......اور ''اَئمّہ'' (آئمہ نہیں) امام کی جمع ہے۔ یاد رہے عِباد، زُوّار، زُبّاد، اَعزّہ اور ائمّہ نام کے طور پر لسانی قواعد سے مطابقت نہیں رکھتے البتہ زَوّار اور زَبّاد نام کے طور پر درست ہیں۔

سابق بھارتی صدر عبدالکلام کا اصل نام

اے پی جے (APJ) عبدالکلام: پہلے پہل جب بھارتی سائنس دان اور سابق صدر کا نام

پڑھا تو تجسس ہوا کہ اتنے لمبے نام کے مخففات کی تفصیل معلوم کی جائے۔ انگریزی میں دیکھا تو Avul Pakir Jainulabdeen Abdul Kalam لکھا ہوا ملا۔ ''عبدالکلام'' تو واضح تھا لیکن یا الٰہی یہ اوُل پاکر یا پاکیر کیا نام ہے؟ اسی طرح ''جین'' بھی ایک مہمل سا لفظ لگتا تھا۔ ذرا سا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ ''زین'' کو ''جین'' بنایا گیا ہوگا لیکن کیوں؟ اور اسے بولنے میں بگاڑ لیا گیا لیکن انگریزی میں اسے ''زیڈ'' سے کیوں نہیں لکھا گیا؟ ذہن میں سوال موجود رہا۔ خیر ایک مدت کے بعد عقدہ کھلا کہ حضرت کا نام ابوالفقیر زین العابدین عبدالکلام ہے۔

جنوبی ہند کے مسلمان تجارتی سفر کرنے والے قدیم عربوں کے حُسنِ اخلاق اور تبلیغ سے متاثر ہوکر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اس لئے ان کے اکثر نام خالص عربی انداز کے ہوتے ہیں۔ ایک ہی فرد کا نام تین چار ناموں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسی روایت کے مطابق سابق صدر کا نام بھی رکھا گیا لیکن اب عربی سے براہِ راست تعلق منقطع ہونے (اور شاید رسم الخط سے مکمل ناواقفیت) کی وجہ سے جب یہی نام مقامی لہجے میں بولے اور علاقائی زبان میں لکھے جاتے ہیں تو خالص عربی حروف کا حلیہ بگڑ کر جنابِ صدر کے نام کی سی مضحکہ خیز شکل وجود میں آتی ہے۔

راقم کو ایک ایسا کیلنڈر دیکھنے کا موقع ملا جس میں عیسوی تاریخوں کے ساتھ ساتھ اسلامی مہینوں کے نام اور تاریخیں بھی درج تھیں۔ لفظ Jil Huz پڑھ کر بہت اچنبھا ہوا۔ ذرا تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ برصغیر پاک وہند کے جن علاقوں میں ''ذ''، ''ز''، ''ض'' اور ''ظ'' کو غلط طور پر ''ج'' کی آواز سے بدل دیا جاتا ہے وہاں یہ بھی قباحت ہے کہ ''ج'' کو بھی ''ذ'' اور ''ز'' وغیرہ بنا دیا جاتا ہے مثلاً جس کا نام ''جلیل'' ہے اُسے ذلیل کہا جائے گا اور جسے گالی دیتے ہوئے ''ذلیل آدمی'' کہنا ہو، اُسے جلیل آدمی کہیں گے۔ یہ خرابی صرف بولنے کی حد تک نہیں، بلکہ علاقائی زبانوں اور انگریزی وغیرہ میں بھی مستند اور معیاری املا یہی ہے۔

ناموں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونا

ناموں کا تلفظ، ایک زبان سے دوسری میں منتقل ہوکر کسی حد تک بدل جانا قرینِ قیاس ہے۔ بعض اوقات یہ تبدیلی بگاڑ کی حد تک چلی جاتی ہے مثلاً انگریزی میں ''ث'' کی جگہ TH اِستعمال ہوتا ہے، چنانچہ انگریزی میں ثانی، عثمان اور ثریّا سے تھانی، اوتھمان اور تھورایا بن جاتا ہے۔ انگریزی میں ''ڑ'' کی جگہ D استعمال کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ''اڑیسہ'' کو ''اڈیشہ'' بنا دیا جاتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ یہ نام انگریزی سے اُردو میں آتے ہیں تو بھی غلط شکل میں لکھے جاتے ہیں۔ ایک مشہور ارب پتی عدنان خاشقجی

اور اُن کے خاندان کے دوسرے افراد مثلاً جمال خاشقجی کے نام جب ترکی، انگریزی یا فرانسیسی سے اُردو میں منتقل ہوتے ہیں تو انھیں ''خشوگی، خوشگی'' وغیرہ بنا دیا جاتا ہے حال آں کہ ''گ'' عربی حروفِ تہجی میں شامل ہی نہیں۔ ترکی زبان کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے ترکوں کے اسلامی (عربی) نام جب اُردو میں لکھے جاتے ہیں تو ان میں بگاڑ آجاتا ہے۔ ترکی حروفِ تہجی بظاہر انگریزی سے ملتے جُلتے ہیں لیکن بہت سے حروف کی آوازیں انگریزی حروف سے مختلف ہیں اس بنا پر ہمارے لئے ان ناموں کا صحیح تلفظ مشکل ہوتا ہے۔ مفرد نام کی حد تک اس بگاڑ کو بھی قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے لیکن دنیا کے اکثر معاشروں کی روایت کے مطابق افراد کے نام چوں کہ مرکب یعنی دو یا دو سے زائد ہوتے ہیں اس لئے مرکب نام اس بگاڑ کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ اپنی زبان یا معاشرے میں جن مرکب ناموں کا آپس میں معنوی ربط ہوتا ہے، دوسری زبان یا معاشرے کے چلن کے بموجب وہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

مغربی معاشروں میں مسلمانوں کے ناموں کے مسائل

مغربی معاشروں میں، عام بول چال میں پہلا نام، دفتری اور سرکاری مقاصد کے لئے دوسرا یا خاندانی نام (Surname) استعمال ہوتا ہے۔ دستاویزات میں دونوں نام ملا لیے جاتے ہیں۔ اگر کوئی تیسرا نام بھی ہو تو وہ بہت ہی زیادہ اہمیت کی حامل دستاویزات میں استعمال کیا جاتا ہے ورنہ عام طور پر درمیانی نام نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مغربی معاشروں میں مسلمانوں کے نام، وہاں کی مقامی روایت کے مطابق بگڑ جاتے ہیں جیسے عبدالقیوم راجا سے عبدل راجا...... عبدالکریم چودھری سے عبدل چودھری...... عبدالحمید خان سے عبدالخان...... عبدالخالق بھٹی سے عبدل بھٹی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ نام معنوی اعتبار سے بالکل لغو اور شرعی لحاظ سے ناجائز ہو جاتے ہیں۔

انگلینڈ میں مقیم ایک صاحب ''علی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا پورا نام پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ میرا نام علی نہیں بلکہ ''شبیر الحق'' ہے۔ ملازمت شروع کی تو انگریز باس (Boss) کے لئے میرے نام کا تلفظ اور پھر اسے یاد رکھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنے طور پر، اسے سکھانے اور مشق کرانے کی کوشش کی لیکن وہ ''شبیر الحق'' کہنے میں ناکام رہا تو اس نے اپنی آسانی کے لئے مجھے علی کہنا شروع کر دیا اب یہی میرا عرف ہے۔

ایسے نام جن سے تذکیر و تانیث کا فرق واضح نہیں ہوتا

ہمارے ہاں ایسے نام بھی رکھے جا رہے ہیں جن کو سُن اور پڑھ کر تذکیر و تانیث کا فرق کرنا

مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

ع جِنس کُھلتی ہی نہیں سیتا رام کی

یہ واضح نہیں ہوتا کہ سِیتا، رام کی ہے یا سیتا رام کوئی حضرت ہیں۔ مذکورہ بالا مصرعے کے مصداق، ہمارے ہاں بچے بچیوں کے رکھے جانے والے کچھ نام نہیں کُھلتے کہ یہ مذکر ہیں یا مونث؟ فارسی سے اُردو میں آنے والے ایسے ناموں کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے جو بچوں اور بچیوں، دونوں کے رکھے جاتے ہیں: آرزو، آفریں، اختر، جمشید، زریاب، گوہر اور ناہید وغیرہ۔ عربی سے اُردو میں آنے والے ایسے کچھ نام یہ ہیں: اِرشاد، بدر، برکت، بشارت، تبسم، تسنیم، تمنّا، عنایت، فردوس، کوثر، کوکب، مصباح وغیرہ۔ کچھ مذکر ناموں کے ساتھ بیگم لگا کر مونث نام لیا جاتا ہے جیسے معروف بیگم، قُدوُّس بیگم اور حضور بیگم وغیرہ۔ کچھ مذکر نام ایسے ہیں جن کے آخر میں یائے معروف (ی) لگا کر مونث بنا لیا جاتا ہے جیسے محمدی بیگم، اکبری اور اصغری وغیرہ حال آنکہ اصغر اور اکبر کی مونث صغریٰ اور کُبریٰ ہے۔

فارسی لفظ پر عربی قاعدہ لاگو کر کے نام بنانا

راقم السّطور اپنے ایک دوست کے گھر گیا جو اتفاق سے اردو زبان و ادب کے استاد ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک بیٹی کا نام مُزَیّب (Muzayab) بتایا اور کہا کہ اس کا معنی ہے خوبصورت۔ موصوف نے فارسی لفظ زیب (خوبصورتی) پر تصرف کرتے ہوئے عربی قاعدہ لاگو کیا اور ''مُزَیّب'' اختراع کیا۔ اس اختراع سے بہتر تھا کہ وہ اپنی بچی کا نام زیبا (خوبصورت) رکھ لیتے جو درست اور بامعنی ہے۔

مردوں کے لیے مونث نام رکھنے کا رواج

برکت، بشارت، رحمت، عنایت اور نعمت وغیرہ عربی میں مونث ہیں جو آج کل برکہ، بشارہ، رحمہ، عنایہ اور نِعمہ کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ اُردو میں لمبی ''ت'' کے ساتھ ان ناموں کو مردوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

برقی ذرائع اِبلاغ پر ناموں کا بگاڑ

برقی ذرائع اِبلاغ پر، ناموں کے بگاڑ کے ضمن میں، آئے روز کئی تماشے دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ایک نہایت تکلیف دِہ واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ربیع الاوّل کا ماہِ مبارک تھا اور ایک ٹی وی چینل پر کوئی خاتون اینکر سیرتِ طیّبہ پر پروگرام کر رہی تھی۔ رسول اکرم ﷺ کے صفاتی نام ''شفیع الورٰی'' کی جگہ اُس نے ''شفیع اَلوری'' (Shafee Alvari) کہہ کے اپنی جہالت کا ثبوت دے

دیا اور سننے اور دیکھنے والوں کو شرمندہ کر دیا۔

ناموں میں انگریزی ہجوں کی غلطیاں

ناموں کے انگریزی ہجے لکھتے وقت کئی طرح کی غلطیاں کی جاتی ہیں مثلاً واول (vowels) کو بدل دینا، سنگل ہجے کو ڈبل کر دینا اور نام کے حروف کو ایک دوسرے میں بدل دینا وغیرہ۔ راقم، ایم۔اے کی کلاس کو لیکچر دے رہا تھا تو ناصِر (Nasir) کا اردو میں تلفظ اور اس کے انگریزی ہجے زیرِ بحث آئے۔ ایک طالبِ علم (جس کا نام ناصِر تھا) نے بڑی بے اعتنائی بلکہ ڈھٹائی سے کہا ''سر! ناموں میں زبر، زیر اور واول کی تبدیلی سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آپ ناصِر (Nasir) کہیں یا ناصَر (Nasar)، ایک ہی بات ہے۔'' طالبِ علم مذکور کا یہ بیان اس کی کُور ذَوقی کا مظہر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان نزاکتوں کا خیال نہ رکھا جائے تو نام کی صحت اور سالمیت پر حرف آتا ہے۔ راقم کے مشاہدے میں آنے والی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

آغا Agah نہیں Aagha ہے ...... احد ملک Aahad Mallack نہیں Ahad Malik ہے ...... احسن Aehsun نہیں Ahsan ہے ...... احمد Ahmed نہیں Ahmad ہے ...... اِعجاز Ajjaz نہیں E,jaz ہے ...... انوار Anwar نہیں Anwaar ہے ...... انور Enwer نہیں Anwar ہے ...... اُوَیس Awais نہیں Owais ہے ...... بَرَکات Barkat نہیں Barakaat ہے ...... بَرَکت Barkat نہیں Barakat ہے ...... تبسُّم Tabbasum نہیں Tabassum ہے ...... تمنّا Thammana نہیں Tamanna ہے ...... جابر Jabbar نہیں Jabir ہے ...... جرال Jarral نہیں Jaral ہے ...... حارث Harris نہیں Haris ہے ...... حامد Hamed نہیں Hamid ہے ...... حمّاد Hamad نہیں Hammaad ہے ...... حمید Hamid نہیں Hameed ہے ...... حسن Hassan نہیں Hasan ہے ...... حسّان Hasan نہیں Hassaan ہے ...... حُسین Hussain نہیں Husain ہے ...... حُسنین Husnain نہیں حَسَنین Hasanain ہے ...... راشد Rashad نہیں Rashid ہے ...... رشید Rashid نہیں Rasheed ہے ...... ریاض Reaz نہیں Riyaz ہے ...... ساجد Sajad نہیں Sajid ہے ...... سجّاد Sajad نہیں Sajjad ہے ...... ساحِر Sahar نہیں Sahir ہے ...... شبّیر Shabir نہیں Shabbeer ہے ...... صِدّیق Sadiq نہیں Siddique ہے ...... صدر Saddar نہیں Sad,r ہے ...... عرفان Irrfan نہیں Irfan ہے ...... عطش Attash نہیں Atash ہے ...... عُمیر Humair نہیں Umair ہے ...... فواد Fawad نہیں Fuad ہے۔ فیّاض Fiaz نہیں Fayyaz ہے ...... قاسم Qasam نہیں Qasim ہے ...... گیلانی

Gillani نہیں Gilani ہے...... ماجد Majad نہیں Majid ہے...... مجید Majid نہیں Majeed ہے ......مبارک Mubarik نہیں Mubarak ہے...... مدثر Mudasir نہیں Muddassir ہے......مزمل Muzamil نہیں Muzzammil ہے......مظہر Muzher نہیں Mazhar ہے......معروف Mehroof نہیں Ma,roof ہے......معین Mohin نہیں Moin /Moeen ہے...... ملک Mallack نہیں Malik ہے...... مالک Malik نہیں Maalik ہے......مولا Moula نہیں Maula ہے ...... ناصر Nasar نہیں Nasir ہے ...... نصر Nassar نہیں Nas,r ہے ......وقار Vaccar نہیں Waqar ہے ...... یاسر Yasar/ Yasser نہیں Yasir ہے ...... یوسُف Yousif/ Yousaf نہیں Yousuf ہے......یونُس Younis/ Younas نہیں Younus ہے......آمنہ Amna نہیں Aamina ہے ...... حامدہ Hamda نہیں Hamida ہے ......حمیدہ Hamida نہیں Hameeda ہے......خالدہ Khalda نہیں Khalida ہے......ساجدہ Sajda نہیں Sajida ہے......سائرہ Sahira نہیں Saira ہے......سدرہ Siddra نہیں Sidra ہے......شازیہ Shazia نہیں Shaziya ہے......صادقہ Sadqa نہیں Sadiqa ہے......صدیقہ Sadiqa نہیں Siddiqa ہے......صفیہ Safia نہیں Safiya ہے...... طیبہ Toyoba نہیں Tayyiba ہے......عابدہ Abda نہیں Abida ہے ......عاصمہ Asma نہیں Aasima ہے...... عاطفہ Atfa نہیں Aatifa ہے......عاکفہ Akfa نہیں Aakifa ہے......عالیہ Alia نہیں Aaliya ہے ...... عارفہ Arfa نہیں Aarifa ہے ......فاخرہ Fakhra نہیں Fakhira ہے ...... فاطمہ Fatma نہیں Fatima ہے ......فرح Farrah نہیں Farah ہے ......فردوس Firdous نہیں Firdaus ہے......کاملہ Kamla نہیں Kamila ہے ......کوثر Kousar نہیں Kausar ہے ...... ماجدہ Majda نہیں Majida ہے...... مجیدہ Majida نہیں Majeeda ہے...... مدح Maddah نہیں Madah ہے......مومنہ Momna نہیں Momina ہے......ناجیہ Najia نہیں Najiya ہے......نادرہ Nadra نہیں Nadira ہے......نادیہ Nadia نہیں Nadiya ہے۔ناصرہ Nasra نہیں Nasira ہے......

'آ' اور 'عا' سے شروع ہونے والے ناموں کے انگریزی ہجے

'آ' اور 'عا' سے شروع ہونے والے ناموں کے انگریزی ہجے کرتے وقت توجّہ اور سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔قاعدے کے مطابق ایسے ناموں کے شروع کے صوتیے میں دو متّصل (A) لکھے جاتے ہیں۔اس قاعدے کو اختیار کرنے سے ان ناموں کی آوازیں اپنی صحیح صورت میں ادا کی جاسکتی

ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

آبروAabroo۔ آتشAatish۔ آدمAadam۔ آذرAazar۔ آرزوAarzoo۔ آزادAazad۔ آزُردہAazurda۔ آسیAasi۔ آصفAasif۔ آغاAagha۔ آفاقAafaq۔ آفتابAaftab۔ آفریدیAafridi۔ آفریںAafrin۔ آفندیAafandi۔ آقاAaqa۔ آکاشAakash۔ آگاہ Aagah۔ آلِ احمدAal-e-Ahmad (پروفیسر آلِ احمد سُرور)۔ آمادہAamada۔ آمنہAamina۔ آنندAanand (مثال کے طور پر آنند نرائن ملّا اور آنند زُتشی المعروف گلزار دہلوی)۔ آوارہAawara (آوارہ سلطان پوری)۔ آہAah (صفدر آہ۔ ادیب)۔ آہنAahan۔ آئینہAaina۔ عابدAabid۔ عاجزAajiz۔ عارفAarif۔ عاشر Aashir۔ عاشق Aashiq۔ عاصم Aasim۔ عاصی Aasi۔ عاطر Aatir۔ عاطفAatif۔ عاقبAaqib۔ عاقلAaqil۔ عاکفAakif۔ عالمAalim۔ عالم گیر Aalamgeer۔ عامر Aamir۔ عالیAali وغیرہ۔

اسمِ مبالغہ کے وزن پر آنے والے نام انگریزی میں کیسے لکھیں؟

اسمِ مبالغہ کے وزن پر آنے والے ناموں مثلاً حسّان، حمّاد، سجّاد وغیرہ کے مشدد حروف س، م، ج وغیرہ کو انگریزی میں لکھتے ہوئے ڈبل ہجوں کے ساتھ ظاہر کیا جائے گا جیسے حسان میں ss، حماد میں mm اور سجاد میں jj۔ ان ناموں میں آنے والا الف قدرتی طور پر الفِ ممدودہ کی آواز اختیار کر لے گا لہٰذا ضروری ہے کہ اس الف کو بھی aa سے لکھا جائے مثلاً حسّان (Hassaan), حمّاد (Hammaad) اور سجّاد (Sajjaad) وغیرہ۔

کشمیر میں رکھے جانے والے عجیب، نادِر اور مہمل نام

درج ذیل نام مقبوضہ وادیٔ کشمیر کے ایک اخبار ''روشنی'' کے اشتہاری صفحات سے لیے گئے ہیں۔ اس اخبار میں زیادہ تر عدالتی کارروائیوں کے اعلان اور دیگر دفتری دستاویزات میں عام لوگوں کے ناموں کا اندراج ہوتا ہے۔[۲۶]

راقم السطور نے اِن متغیر، مبہم اور مہمل ناموں پر غور و خوض کر کے ان کی اصل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جس کی تفصیل اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ناموں کے سامنے لکھ دی ہے۔ ان ناموں کو زیرِ بحث لانے کا مقصد ان افراد کی تضحیک یا ناموں کا تمسخر اڑانا ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقتِ واقعہ کے طور پر ناموں کی ندرت، نام نہاد جدت، سہوِ کتابت یا نام رکھنے میں بعض ضروری امور سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے

ابہام وغیرہ کی نشاندہی مقصود ہے۔قارئین کو اس سے اندازہ ہوگا کہ ناموں کے انتخاب میں، بے توجہی اور جہالت کے سبب، کس قدر انتشار پایا جاتا ہے۔

مظلومہ بیگم: جس بے چاری، قسمت کی ماری خاتون کو پیدائش کے وقت ''مظلومہ'' کا نام دیا گیا ہو اس کی مظلومیت کب ختم ہوگی؟ خاص کر جب اس کا تعلق بھی مقبوضہ وادیٔ کشمیر سے ہو۔

ظرامت حسین: زرم سے شاید ''زرامت'' ہوسکتا ہو، لیکن امکان کم ہے البتہ ضرامت جلتی ہوئی لکڑی کے معنوں میں آ سکتا ہے مگر نام کے طور پر مناسب نہیں ہے۔

ظراکت حسین: ضریک بمعنی احمق، اندھا، لنجا، بدحال، فقیر اور مذکر گدھ۔اس مادے سے شاید ضراکت حاصل مصدر ہو۔لیکن ''ظراکت'' کیا ہے؟

فراکت حسین: عربی میں فَرَک کا معنی کپڑا رنگنا، ملنا اور بغض رکھنا ہے۔نام کے طور پر غیر مناسب ہے۔

ناہدہ بانو: بہن زاہدہ بانو کے نام کے وزن اور قافیے پر یہ نام رکھا گیا۔غالب امکان ہے کہ یہ ناہیدہ ہو۔ناہیدہ ناہید کی خودساختہ مؤنث ہے۔درج بالا نام ایک ہی گھرانے کے افراد کے ہیں۔مظلومہ والدہ اور باقی ان کے بچے۔ بیٹوں کے ناموں میں صوتی حسن کا کمال موجود ہے۔ پہلے دو ناموں کے معانی ندارد لیکن ایسے نادر الفاظ وضع کرنے والے کے ذوق کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

ممتازہ بیگم: ممتاز کو تائے تانیث لگا کر مونث بنانے کا رواج نہیں ہے۔

سائمہ: ظاہر ہے کہ یہ نام صائمہ ہے جو کاتب یا کلرکوں کی مہربانی سے ''سائمہ'' بنا ہے۔

بازِق: ایک بامعنی نام ہے یعنی تھوکنے والا یا کاشت کرنے والا، لیکن نادر ضرور ہے۔

فیوزی فیاض: فائزہ یا فوزیہ نام کی لڑکی کا عرف وغیرہ تو ہوسکتا ہے لیکن اصل اور دستاویزی نام عجیب شے ہے۔

کلسومہ: کلثوم سے کلثومہ بنا اور کاتب نے کلسومہ بنا دیا۔کلثوم کو مونث کرنا بھی محلِّ نظر ہے۔

مصرہ بیگم: شاید اصل نام مصرع بیگم ہو۔

ساجہ بیگم: خدا جانے ساجدہ کو کاتب نے بگاڑ دیا ہے یا یہی اصل نام ہے۔دستاویز میں ایسے ہی لکھا گیا ہے۔

سوضیاح بیگم: نام کا پہلا حصہ مکمل عربی لفظ لگتا ہے لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو معنوں کی تلاش شروع کی۔مختلف لغات کو کھنگالا لیکن ناکام۔

طوہا دختر اشتیاق: شاید طاہا (طٰہٰ) ہو مگر ایسا ہونے سے یہ مذکر بن جائے گا۔
آکاش احمد: آکاش کا معنی آسمان ہے لفظ تو درست ہے لیکن یہ نام ناجائز نہ سہی، کم علمی اور بے ذوقی کی دلیل ضرور ہے۔
ذکرہ نور: اگر تو ''ذاکرہ'' صاحبہ کو کاتب نے تختۂ مشق بنایا ہے تو قابلِ فہم ورنہ مہمل نام ہے۔
اقسا: آج کل بچیوں کا نام عام طور پر ''اقصیٰ'' رکھا جاتا ہے۔ یہی نام اخباری کاتب نے 'اقسا'' بنا دیا۔
مرزبن: یہ ایک مہمل نام ہے۔
ہمیم رفیق: یہ اصل میں حمیم ہے۔
کتبہ امتیاز: کتبہ بطور اسم تو درست ہے لیکن کیا یہ کسی فرد کا نام ہو سکتا ہے؟
سبرینہ امتیاز: سبرینہ ایک مہمل لفظ ہے۔ یہ شاید سبرین کی تانیث بنانے کی کوشش ہے۔ سبرین بھی مہمل ہے۔
مدہ برہ: مُدبّرہ کو شاید مدہ برہ لکھ دیا گیا۔ مُدبِّرہ ایک بامعنی نام ہے۔
ہمیرہ خالق: حمیرہ صحیح ہے۔
عویلہ نصیر: عال سے اس کی کیا نسبت ہے؟
فظی بیگم: یہ ایک مہمل نام ہے۔
قلم دین: ذرا عجیب نام ہے لیکن غلط نہیں۔
جوزی بانو: یہ ایک مہمل نام ہے۔
سائس بشیر: سائیس اُس ملازم کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی خدمت پر مامور ہو لیکن یہ نام عجیب ہے۔
بلقسہ جمال: شاید بلقیس سے بلقیسہ بنایا گیا ہو جو لکھنے والے نے نقطے اڑا کر ''بلقسہ'' بنا دیا ہے۔ بلقیس سے بلقیسہ بنانا بھی محلِ نظر ہے۔
امت الرابیہ: رابیہ کوئی لفظ نہیں البتہ رابعہ سے اَمَۃُ الرابعہ بن سکتا ہے مگر معنویت کے اعتبار سے یہ نام مناسب نہیں ہے۔
پروینہ اختر: پروین کو عربی قاعدے کے مطابق ''پروینہ'' بنا لیا گیا۔ اس طرح کی اختراعیں ''شاگردہ''، ''اُستادہ''، ''دلشادہ'' وغیرہ کی صورت میں بھی جلوہ گر ہیں۔
شوقی جان: عجیب نام ہے۔ ہو سکتا ہے اصل میں شوقین جان ہو۔

زبینہ اختر: یہ زبین کی تانیث ہے جس کے کئی معنوں میں سے ایک ''سرکش'' ہے۔

عِشال: یہ ایک خودساختہ اور بے معنی نام ہے۔

شیزان: یہ پاکستان میں کھانے پینے کی چیزیں بنانے والی ایک کمپنی کا نام ہے۔لُغوی اعتبار سے یہ بے معنی لفظ ہے۔

شزانہ: اس کا معاملہ بھی مذکورہ بالا ''شیزان'' جیسا ہے۔

نیہا مشتاق: نیہا ایک بے معنی لفظ ہے۔

شوکینہ بیگم: شاید ''شوقین'' کی مؤنث ''شوقینہ'' سمجھ کر یہ نام رکھا گیا ہو۔ بعد میں کاتب کے ہاتھ کے کمال سے شوکینہ بن گیا۔

زونہ بیگم: کشمیر کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون کا پیدائشی نام ''زون'' بمعنی چاند تھا۔ زونہ بھی کوئی کشمیری خاتون ہیں۔ شاید یہ نام بھی اسی ''زون'' سے کوئی نسبت رکھتا ہوگا۔

ہورین بلال: ہوسکتا ہے یہ حُورَین ہو۔ حُور اگرچہ جمع ہے لیکن اُردو میں بطورواحد مستعمل ہے۔

عکیظہ سلطان: بمعنی چھوٹے قد والی عورت۔

سیمہ سلطان: یہ اصل میں سیما سلطان ہے۔ سیما کا معنی پیشانی ہے۔

دلشادہ: یہ خودساختہ مونث ہے۔

فضی بیگم: اس کی اصل صورت فیضی بیگم ہے۔

بسمہ اشرف: بسمہ Bisma اصل میں باِسُمِہٖ(Be-Ismihee) ہے۔

سویہ اشرف: سویہ لایعنی لفظ ہے۔

شیمالی بیگم: شمالی(Northern) بھی اگر اسے سمجھ لیا جائے تو بھی نام کی کوئی معنویت نہیں۔

مریمہ: یہ مریم کی مخرب شکل ہے۔ مریم کی خودساختہ مونث بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شمیمہ: شمیم کی خودساختہ مونث ہے۔

فردوسہ بیگم: یہ فردوس کی خودساختہ مونث ہے۔

مغلی بیگم: مُغل سے منسوب ہے۔

گلشنہ بیگم: گلشن کی خودساختہ مونث ہے۔

بلقیسہ بیگم: بلقیس کی خودساختہ مونث ہے۔

ملسا بتول: یہ لایعنی لفظ ہے۔

اریبا بتول: یہ اریبہ کی متغیر صورت ہے۔
محوش معراج: ظاہر ہے کہ مہوش کو لکھنے والے ''محوش'' بنا دیا ہے۔
مسرت گل بدن: بہن
الفت گل نین: بہن
سلطنت گل کیس: بہن
مشققت گل زیب: بہن
رخصت گل فام: بہن
شارم گل عباس: بھائی، شارم کا معنی ہے نشانے پر لگنے والا تیر۔
اوپر کے نام پانچ بہنوں اور ان کے اکلوتے بھائی کے ہیں۔ کشمیریوں کی پھولوں سے محبت نے نام رکھنے میں بھی ندرت کے کیا کیا گل کھلائے ہیں۔
مختی (mukhti) بیگم: یہ لایعنی لفظ ہے۔
پروینہ بیگم: پروین کی خودساختہ مونث ہے۔
امروزہ بانو: اگر اِسے ''امروز'' سمجھ لیا جائے تو اس کا معنی ''آج'' ہے۔
امتیازہ بانو: امتیاز کی خودساختہ مونث ہے۔
واستہ بانو: یہ شاید واسطہ بانو ہو۔
شاہستہ بانو: شائستہ کی مخرب شکل ہے۔
ساہرہ بانو: سارہ کی مخرب شکل ہے۔
سروہ بیگم: غیر مانوس لفظ ہے۔
سبعرش رشید: غیر معلوم اور غیر مانوس لفظ ہے۔
مطرسعد بیگم: مطر کا معنی بارش ہے۔
فرضی بیگم: اور کئی چیزیں فرضی ہوسکتی ہیں لیکن کیا بیگم بھی؟
زمرودہ بیگم: یہ شاید زمردہ کی مخرب شکل ہے۔ زمردہ، زمرد کی خودساختہ مونث ہے۔
تمینا مشتاق: یہ اصل میں تہمینہ ہے۔
عاسیہ: یہ آسیہ ہے۔
مامدین: امام دین کی متغیر شکل ہے۔

شوکین نبی: یہ شوقین نبی ہے۔

ماشوق: معشوق کو ماشوق بنا دیا گیا ہے۔

افرائیم: افراہیم۔ ''ہ'' کو ہمزہ سے بدل دیا گیا۔

رہانہ بیگم: شاید ''ریحانہ'' ہوگا۔

محمد ختان: ختان کا معنی ختنہ کرنے والا ہے۔ بہت عجیب نام ہے۔

سگوفتہ: شگفتہ کی متغیر شکل ہے۔

خطیجہ: خدیجہ کی متغیر شکل ہے۔

خطیجی: خدیجہ کی متغیر شکل ہے۔

ساکتا بیگم: ساکتا بے معنی لفظ ہے۔

سیدا بانو: یہ اصل میں سیّدہ بانو ہے۔

سویرہ کونثر: شاید سمیرہ کوثر ہو۔

ہمیرہ کونثر: یہ اصل میں حمیرہ کوثر ہے۔

سیبہ جان: شاید سیب کی خود ساختہ مونث ہے۔

آبرا نساء: غیر معلوم اور غیر مانوس نام ہے۔

سائقہ: صاعقہ کی متغیر شکل ہے۔

جانہ بیگم: جان کی خود ساختہ مونث ہے۔

رطیبہ الطاف: رطیب (نرم و نازک شاخ) کی مونث ہے۔ نادِر لیکن با معنی نام ہے۔

مری سہار: غیر معلوم اور غیر مانوس نام ہے۔

فرہانہ: فرحانہ کی متغیر صورت ہے۔

ہینہ: یہ اصل میں حِنا ہے۔

سیدا طوبا: یہ سیّدہ طوبیٰ ہے۔

سید مرتضیہ: مرد کا نام ہے لیکن یہ مرتضیٰ کی بگڑی شکل معلوم ہوتی ہے۔

اقراہ جان: اِقرا کے آخر میں ''ہ'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اِقرا بھی نام کے زمرے میں نہیں آتا۔

سیدا اَقلاس: جہاز کو ساحل پر باندھنے والی رسیوں کو کہتے ہیں۔ یہ قلس کی جمع ہے۔

بسماء جان: یہ بسمہ کی متغیر شکل ہے۔

روزی جان: روزی بمعنی رزق ہے یا پھر انگریزی لفظ Rose سے منسوب کر کے روزی بنالیا گیا۔

نزارت احمد: نظارت کی متغیر صورت ہے۔

افلاطون بیگم: نام درست ہے لیکن خاتون اور افلاطون؟ کچھ خلافِ قاعدہ سی بات ہے۔

نسبہ خورشید: نِسبہ کا معنی قرابت ہے یا پھر نِسبت کا دوسرا اِملا ہے جس میں ''ت'' کو ''ہ'' میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

صحیب مشتاق: صہیب کی مخرب شکل ہے۔

فضلی بیگم: فضلی کا معنی ہے فضل سے نسبت رکھنے والا۔

جمشیدہ بیگم: جمشید کی خودساختہ مؤنث ہے۔

عدفر رسول: یہ ایک غیر معلوم اور غیر مانوس لفظ ہے۔

اعیر بانو: یہ بھی غیر معلوم اور غیر مانوس لفظ ہے۔

نازہ بیگم: ناز سے بے قاعدہ وضع کیا گیا لفظ ''نازہ''

طوبیب شبیر: غالباً طبیب ہے۔

سہران اقبال: سہران غیر معلوم اور غیر مانوس لفظ ہے۔

سادیہ منظور: شاید ''سعدیہ'' کو کاتب نے ''سادیہ'' لکھ دیا ہوگا

تاجہ بیگم: تاج کی مؤنث بنالی گئی ہے

جگری زوجہ غلام قادر: جگر سے منسوب مگر عجیب نام ہے۔

پوشہ بیگم: یہ بظاہر پوش کی خودساختہ مونث ہے۔ پوش فارسی مصدر پوشیدن سے امر کا صیغہ ہے جو اِسم کے بعد آ کر اسے فاعلِ ترکیبی بنا دیتا ہے اور چھپانے والا کا معنی دیتا ہے جیسے خطا پوش۔

فرہان سلیم: یہ فرحان کی متغیر شکل ہے۔

فرینہ: کوئی خودساختہ نام ہے۔

علی صید خان: صید کا معنی شکار ہے لیکن یہ سَید ہوگا جو اُسَید بمعنی چھوٹا شیر کی مخرب شکل ہے۔

وصپ جان: یہ غالباً وصف جان ہوگا۔

رفیدہ بیگم: رفیدہ، تہ درتہ کپڑے کے اُس گدّے کو کہتے ہیں جس پر رکھ کر روٹی تنّور میں لگاتے ہیں۔

صوبیہ بانو: ثوبیہ کی متغیر صورت۔ ثوبیہ بھی نام کے طور پر غلط ہے صحیح ثویبہ ہے۔

شوزیہ بانو: یہ غالباً شازیہ بانو ہوگا۔

سنوبر شفیع: یہ صنوبر کی متغیر شکل ہے۔

مبسر شفیع: یہ مبشر کی متغیر شکل ہے۔

طبثم: یہ تبسم کی متغیر شکل ہے۔

اسمت بانو: یہ عصمت کی متغیر شکل ہے۔

عطیقہ: یہ عتیقہ کی متغیر شکل ہے۔

جافراحد: ممکن ہے کہ یہ لڑکے کا نام ہو۔ ''جعفر احد'' کمالِ کاتب سے جافراحد بن گیا ہو۔

زویاہ جمشید: زویاہ، زویا کی مخرب صورت ہے۔

فوضہ بانو: یہ فوزیہ کی متغیر صورت ہے۔

ذریفہ بیگم: یہ ظریفہ کی متغیر صورت ہے۔

مہرانگیزہ: صوتی لحاظ سے بڑی دل کش ترکیب اختراع کی گئی ہے۔ مہر انگیز کا معنی ہے محبت بڑھانے والا یا والی۔ انگیز سے انگیزہ خود ساختہ تغیر ہے۔

عارضہ زوجہ جاوید: اس خاوند کے حوصلے کو داد دینی چاہیے جس کی زوجہ کا نام ہی ''عارضہ'' ہے۔

مسیراز زوجہ شعبان: یہ غیر معلوم اور غیر مانوس نام ہے۔

محمد حظیف: حظیف لایعنی سا لفظ ہے۔

سبینہ بیگم: سبین سے مونث بنایا گیا مگر یہ لایعنی البتہ شبین کا مطلب ہے چادر کا کِنارا۔

نویدہ بیگم: نوید کی خود ساختہ تانیث۔

سمئیہ اختر: سمیعہ کی خود ساختہ شکل ہے۔

ذخیرہ بیگم: بطور نام رواج نہیں ہے۔

شیرازہ بیگم: بطور نام رواج نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے شیراز بیگم ہو۔

ضرینہ فاطمہ: یہ زرینہ کی متغیر صورت ہے۔

فرضانہ الیاس: یہ فرزانہ کی متغیر صورت ہے۔

فیصلہ علی: خاتون کا نام لیکن خلافِ رواج ہے۔

شاروم رفیق: یہ شاہ روم ہوگا۔

کلسم مجید: غالب امکان ہے کہ یہ کلثوم کی بدلی ہوئی شکل ہو۔

رسینہ بانو: رسینہ کا معنی ہے جانور کے گلے میں رسی ڈالنے والی لیکن نام کے طور پر عجیب ہے۔
ارینہ رشید: ارین کی خودساختہ تانیث ہے اور ارین، عرین کی متغیر صورت ہے جس کا معنی جنگل ہے۔
انشہ بانو: یہ اِنشا کی متغیر صورت ہے۔
سبیر الطاف: غالِب اِمکان ہے کہ یہ صبیر ہو جس کا معنی بہادر اور شجاع ہے۔
صوہانہ بانو: صوہان کی خودساختہ تانیث ہے۔ غالب اِمکان ہے کہ یہ لفظ سُوہان ہو جس کا معنی ہے دکھ دینے والا۔ سوہانِ رُوح کی ترکیب پیشِ نظر رہے۔
نعینہ بانو: لایعنی اور غیر مانوس نام ہے۔
انزلہ رشید: یہ اَنزل کی تانیث ہے، اَنزلہ کا معنی ہے بہت زیادہ اُترنے والی۔
نازمینہ بانو: یہ نازمین کی خودساختہ مونث ہے۔
آوید احمد: لایعنی نام ہے۔
نصرین: نسرین کی متغیر شکل ہے۔
حادیہ: ہادیہ کی متغیر شکل ہے۔
نسار: نثار کی متغیر شکل ہے۔
سنجیدہ بانو: نام درست ہے لیکن عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔
باست امین: باسط کی متغیر شکل ہے۔
حذیبہ یوسف: حذیب کی تانیث ہے۔ اگر یہ حزیب ہو تو اس کا معنی ہے سخت معاملہ۔
انوشہ یوسف: نام مستعمل ہے مگر اس میں کوئی معنویت نہیں ہے۔
روضی بیگم: شاید روزی بیگم ہو۔
آہل نصیر: آہل ایک نیا لفظ ہے جس میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔
سید وقارت گیلانی: وقار سے وقارت بنایا گیا لیکن بغیر کسی قاعدے اور قرینے کے۔
گلام: یہ غلام کی متغیر شکل ہے۔
اُمیدہ بٹ: اُمید کی خودساختہ تانیث ہے۔
عیشا عارف: غالب امکان ہے یہ عیشہ ہو جس کا معنی زندگی ہے۔
آقاش مشتاق: یہ آکاش کی متغیر صورت ہے۔
فوضی جان: یہ فوزی کی متغیر شکل ہے۔ یائے معروف یہاں یائے نسبت ہے۔ فوز کا معنی ہے کامیابی۔

رُمی زوجہ عادل: رُمی شاید رُومی کی متغیر شکل ہو۔

شہمالی زوجہ شعبان: لایعنی لفظ ہے۔

عاسترہ دختر عادل: عاسترہ بھی لایعنی اور غیر مانوس لفظ ہے۔

ایضاً: یہ علیزہ کی متغیر شکل ہے۔ علیزہ بجائے خود بے معنی نام ہے۔

شمشیل نواز: مردانہ نام ہے لیکن لایعنی۔

روہی نظیر: روحی کی متغیر شکل ہے۔

مضیٰ نظیر: مضیٰ کا معنی ہے ''جو گزر گیا'' یہ خلافِ رواج نام ہے۔

میرزویہ: یہ لڑکی کا نام ہے۔ ہوسکتا ہے یہ میرزویا ہو لیکن اس میں بھی معنویت نہیں ہے۔

آستیہ: معنویت سے دُور نام ہے۔

رحانہ: یہ اصل میں ریحانہ ہے۔

بلندخان: عجیب لیکن خوب صورت نام ہے

پرویزہ: پرویز کی خودساختہ تانیث

مداسیر: غالب امکان ہے یہ مدثر ہو۔

لالی بیگم: خوبصورت نام ہے۔

میمہ بیگم: شاید اُمیمہ ہو۔

ضمینہ بیگم: یہ ضمین کی تانیث ہے جس کا معنی ہے کفیل۔

اضی بیگم: معنویت سے دور ہے۔

مدعی جان: خلافِ معمول نام ہے لیکن مدعی بامعنی لفظ ہے۔ جان کے اضافے سے یہ مونث نام بن گیا۔

زلفورالدین: بڑی خوب صورت ترکیب وضع کی گئی ہے لیکن معنویت سے دُور ہے۔

جانی بیگم: جانی بیگم خوب صورت نام ہے

احفاظل اسلام: یہ اصل میں احفاظ الاسلام ہے۔

مہنوال اسلام: نہ جانے کون سی عربی ترکیب کو بگاڑا گیا ہے۔

سفیل اسلام: نہ جانے کون سی عربی ترکیب کو بگاڑا گیا ہے۔ شاید ''صفی الاسلام'' ہو یا سیف الاسلام۔

روینیہ اختر: معنویت سے دُور نام ہے۔

دیبانہ اختر: معنویت سے دُور نام ہے۔

امی رمان: یہ اُمِّ رومان ہے۔

رودینہ: لایعنی نام ہے۔

سونہ مالی: لایعنی نام ہے۔

معذرت حسین: عام ڈگر سے مختلف نام ہے۔

بلقس: بلقیس

صبعہ مقبول: یہ شاید صبا ہے۔

مصیب: مُصیب کا معنی ہے بات کی تہ تک پہنچنے والا۔

آبش: لایعنی نام ہے۔

نشاد: یہ نوشاد یا نشاط ہے۔

سمرین بانو: اردو، فارسی اور عربی کے لُغوی مصادر میں سے ''سمیرین'' نہیں مل سکا۔

فصایت حسین: خدا جانے ''فصاحت'' کو مزید فصیح کیا گیا ہے یا یہ الگ سے کوئی لفظ ہے۔

مظاہر حسین: عام ڈگر سے مختلف نام ہے لیکن بامعنی نام ہے۔

سید عجابت حسین: عجائب نام کے کئی لوگ ہیں مگر عجابت نیا نام ہے۔

نذحت فیاض: یہ اصل میں نزہت ہے۔

کوثرہ مقبول: کوثر کی تانیث کی گئی ہے جو نامناسب ہے۔

صوبین پرویز: صوبین، صوب یا ثوب سے بنایا گیا بے تُکا نام ہے۔

فرہین پرویز: غالباً فرحین ہوگا جو فرح سے بغیر کسی قاعدے اور قرینے سے بنالیا گیا ہوگا۔

منظومہ بیگم: خلافِ معمول نام ہے مگر بامعنی ہے۔

مہرونسا: یہ اصل میں مہرالنسا ہے۔

ادیسہ بانو: شاید یہ عدیسہ کی متغیر شکل ہو جس کا معنی ''خدمت کرنے والی'' ہے۔

افت بانو: یہ اصل میں عفّت ہے۔

صبرینہ جان: صبر سے بغیر کسی قاعدے کے صبرین بنالیا گیا۔

ناظیفہ نبی: نظیفہ قرینِ قیاس ہے جس کا معنی صاف ستھری ہے۔

رئیان: ایک لڑکی کا نام ہے۔ ریان ہو تو بامعنی ہے۔

منگت اللہ: شاید یہ بھی کسی عربی ترکیب کی درگت بنائی گئی ہے

داوار جنید داوار نہیں داور ہے جو اصل میں دادآور ہے یعنی عادل، انصاف پسند وغیرہ۔

فوزہ اشرف: غالب امکان ہے یہ نام فوزیہ اشرف ہوگا۔

ذہران اشرف: معنویت سے دور نام ہے۔

اُسرہ: اس کا معنی خاندان ہے۔

مسودہ بیگم: یہ مسعودہ ہوگا۔

صابہ: صاحِبہ یا صبا پیشِ نظر ہوگا۔

تابیہ: تابِعہ اگر ہو تو بامعنی نام ہے۔

رویلہ بیگم: اس میں کوئی معنویت نہیں ہے۔

افشانہ شمیم: افشاں کی خودساختہ تانیث ہے۔

رویسہ بانو: رُوَیس کی مونث ہے جس کا معنی چھوٹا سردار ہے۔

ساقب رشید: ثاقب کی متغیر شکل ہے۔

شبینہ اختر: شبینہ، شب سے مشتق ہے۔

سہرش بشیر: یہ اصل میں سحرش ہے۔

اومیر بشیر: یہ عُمیر کی مخرب صورت ہے۔

یاسمینہ: یاسمین کی خودساختہ تانیث ہے۔

ظرینہ بیگم: یہ اصل میں زرینہ ہے۔

مرجینہ منظور: یہ مرجینا ہے۔

فنسی بیگم: یہ غیر معلوم اور نامانوس لفظ ہے۔

میوش: یہ اصل میں مہ وش، مہوش ہے۔

اکیل احمد: یہ اصل میں عقیل ہے۔

بی بی ناہیدہ: ناہید کی تانیث وضع کی گئی ہے جو خودساختہ ہے۔

قرت خورشید: یہ قرأت ہے۔

سہیب خورشید: صہیب کی مخرب صورت ہے۔

ساہل خورشید: یہ ساحل ہے۔

توفیل احمد: یہ طفیل کی مخرب صورت ہے۔

اوشارہ اختر: یہ معنویت سے دُور کوئی غیر مانوس لفظ ہے۔

سیدہ ممریزہ: یہ معنویت سے دُور کوئی غیر مانوس لفظ ہے۔

شہرین شوکت: شہرین بھی معنویت سے دُور کوئی غیر مانوس لفظ ہے۔

محمد اعطہر: یہ اطہر کی مخرب صورت ہے۔

محمد آسن: یہ محمد احسن ہے۔

معہ پارہ: یہ مہ پارہ ہے۔

عابیہ علی: عابدہ کو عرفِ عام میں عابی کہا جاتا ہے جس کی خود ساختہ مونث بنا کر عابیہ وضع کر لیا گیا۔

افرینا اشرف: یہ آفریں کی خود ساختہ مونث آفرینہ ہے جسے افرینا کی صورت دے دی گئی۔

جالد خورشید: عربی لُغت کی رُو سے جالد کا معنی ''ڈسنے والا'' ہے۔

موبین احمد: یہ مبین کی متغیر شکل ہے۔

نصرینہ بیگم: یہ نسرین کی خود ساختہ مونث ہے جو نصرینہ کی صورت میں لکھ دی گئی۔

جبینہ بیگم: یہ جبین کی خود ساختہ مونث ہے۔

امرینہ بیگم: یہ معنویت سے دُور کوئی لفظ ہے۔

زلیش امتیاز: یہ بھی معنویت سے دُور کوئی لفظ ہے۔

نذہت امتیاز: یہ نُزہت کی متغیر صورت ہے۔

اطلاق امتیاز: عجیب نام ہے جو معنویت سے بھی دُور ہے اگرچہ اِطّلاق خوب لفظ ہے۔

بہد بیگم: غیر معلوم اور غیر مانوس لفظ ہے۔

موبینہ ریاض: یہ مبینہ کی مخرب صورت ہے۔

وجہتا بانو: اگر وجاہت بانو ہو تو درست ہے۔

قظافیہ اختر: قذافی سے خود ساختہ تانیث بنائی گئی اور وہ بھی حرف کی تبدیلی کی نذر ہو گئی۔

سانیہ یونس: یہ ثانیہ کی مخرب صورت ہے۔

اویض احمد: یہ اویس کی مخرب صورت ہے۔

سوبیہ: یہ ثوبیہ جو دراصل ''ثویبہ'' ہے، کی مخرب صورت ہے۔

مفارہ شبیر: عجیب نام ہے جو معنویت سے کوسوں دُور ہے۔

توحیدہ بیگم: نام درست ہے لیکن عام رواج کے مطابق نہیں۔
گلسادہ بیگم: گل شاد کی خود ساختہ مونث ہے۔
نورانہ بیگم: شاید یہ اصل میں نورانی بیگم ہو؟
سرینہ بانو: سرین ''چُوتڑ'' کو کہتے ہیں جس کی خود ساختہ مونث سرینہ بنائی گئی، یہ انتہائی فضول نام ہے۔
تامینہ بیگم: یہ تہمینہ بیگم ہے۔
نوشادہ بیگم: یہ نوشاد کی بے قاعدہ تانیث ہے۔
سلمع بانو: یہ سلمیٰ کی مخرب صورت ہے۔
تسمینہ مجید: یہ معنویت سے دُور نام ہے۔
جافت حسین: یہ معنویت سے دُور نام ہے۔
سید دست علی: یہ عام مروج نام نہیں ہے اگر چہ بامعنی ہے۔
سید یافت علی: ایک عجیب اور نادر نام ہے۔
صفرا فاطمہ: شاید ''صغرا'' ہو۔
حفیف منظور: عفیف کو بگاڑا گیا ہوگا۔ بعض علاقائی لہجوں میں ''ع'' کو ''ح'' بنالیا جاتا ہے

خلاصۂ بحث

سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ، ذرائع ابلاغ کی برق رفتاری نے دینی شعائر، تہذیبی اقدار اور ہماری قومی زبان اُردو کو کئی خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان چیزوں کی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ اُن کے خیال کے مطابق اب دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے لہٰذا دنیا میں مذہبوں، قدروں، زبانوں اور لباسوں کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔ نہیں معلوم اس طرح سوچنے والے کہاں سے یہ عقل کشید کرتے ہیں جس کے تحت اپنی تہذیب، تمدن اور زبان کو چھوڑ کر 'نئی روشنی' اور 'دانش' کا راستہ نکالا جاتا ہے۔ نام رکھنے، لکھنے اور پکارنے کا تعلق براہ راست دم توڑتی دینی اقدار اور زبانوں سے ہے۔ اس انحطاط کو روکنا بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے لیکن یہ دیکھ اور سوچ کر کیا ارادے ترک کر دینے چاہییں؟ اس طوفانِ بدتمیزی کے سامنے بند باندھنے کی کوشش بے کار ہے؟ نہیں! ایسا سوچنا جرم کے مترادف ہوگا۔ ہر باہمت شخص کو اس بگاڑ کو روکنے میں اپنا کردار انجام دینا ہوگا۔

ناموں کے خلفشار اور افراط و تفریط کو روکنے کے لیے قومی اور حکومتی سطح پر ایک مقتدرہ (Authority)

کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ ایسی مقتدرہ جس کے پاس بچوں کے رکھے جانے والے ناموں کی منظوری دینے کا اختیار ہو۔ ناموں کے اُردو اور انگریزی ہجوں کی منظوری بھی اُس کے دائرۂ اختیار میں ہو۔ اس مقتدرہ کے ذیلی دفاتر ہر شہر اور قصبے میں موجود ہوں تا کہ ہر شہری اپنے بچے کا نام رکھنے کی منظوری آسانی سے حاصل کر سکے۔ ایسا ہونا اگر چہ مشکل نظر آتا ہے مگر کوشش کرنا اور اصلاحِ احوال کا جذبہ رکھنا زندہ قوموں کی علامت ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ البقرۃ:۳۰۔

۲۔ ایضاً:۳۱۔

۳۔ عَمرو بن العاص، مشہور صحابیٔ رسولؐ مشہور جرنیل، فاتح مصر، روم اور شام۔۶۶۴ء میں مصر میں وفات پائی۔

۴۔ عمرو ابن ہشام ابن مغیرہ مخزومی (۵۵۳ء-۶۲۳ء) اسلام کا بدترین دشمن، دین اسلام سے استہزاء کرنے والا۔ اہلِ ایمان کو ہر وقت دکھ اور تکلیف پہنچانے کی فکر میں رہتا۔ جاہلیت میں اس کنیت ابوالحکم تھی۔ رسول اکرم ﷺ نے اس کے کرتوتوں کے پیش نظر اسے ابوجہل کا خطاب دیا۔غزوہ بدر میں دو انصاری نوجوانوں معاذؓ اور معوذؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔

۵۔ عَمرو بن عبدوَد، عرب کا مشہور پہلوان اور شہ زور، غزوہ خندق کے موقع پر خندق کو عبور کیا۔حضرت علیؓ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

۶۔ عَمرو بن معدی کرب (۵۴۲ء-۶۴۱ء) دورِ جاہلیت کا نامور شاعر، شہسوار اور مقرر۔اسلام قبول کیا لیکن مرتد ہوگیا۔۶۳۱ء میں پھر حق کی طرف رجوع کیا اور جنگ قادسیہ کا ہیرو بنا۔خلافت فاروقی میں فوت ہوا۔

۷۔ ابوالبشر، مراد حضرت آدمؑ۔

۸۔ ابوالانبیاء، مراد حضرت ابراہیمؑ۔

۹۔ ابوالقاسم، آپ ﷺ کی کنیت، قاسم آپ ﷺ کے بیٹے کا نام تھا جو کم عمری میں فوت ہوئے۔

۱۰۔ ابوطالب (۵۴۰ء-۶۲۰ء) اصل نام عبدمناف ابن عبدالمطلب، رسول اکرم ﷺ کے چچا، حضرت علیؓ کے والد، عبدالمطلب کی وفات کے بعد رسول اکرم ﷺ کو اپنے آغوش تربیت میں لے لیا۔ بعثت نبوی ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔

۱۱۔ ابوحفص، مراد حضرت عمر فاروقؓ۔

۱۲۔ ابوبکر، عبداللہ بن ابی قحافہ، لقب صدیق و عتیق، خلیفۂ اول، بعثت سے قبل اور بعد میں آپ ﷺ کے رفیق خاص۔ آپؓ نے ہر موقع پر حق و صداقت کو قبول کرنے اور اسلام کی اعانت کرنے میں پہل اور جلدی کی۔

۱۳۔ ابوتراب، حضرت علیؓ بن ابی طالب، اسداللہ لقب، خلیفۂ چہارم اور داماد رسول ﷺ، حضرت علیؓ کو زمین کے ٹیلے پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا یَا اَبا تُراب (اے مٹی پر بیٹھنے والے) یہی الفاظ آپؓ کی کنیت بن گئے۔

۱۴۔ ابو ہریرہ، نام کے بارے میں اختلاف، عمیر بن عامر، یا عبداللہ بن عامر یا عبدالرحمٰن بن صخر۔ قبول اسلام کے بعد رسول اکرم ﷺ نے عمیر نام رکھا۔ حدیث کے سب سے بڑے راوی اور سلطان الحدیث کہلاتے ہیں۔ بلیوں اور بلی کے بچوں سے شفقت اور شغف کی وجہ سے ابو ہریرہ ان کی کنیت بن گئی۔

۱۵۔ ابوحنیفہ، امام، نعمان بن ثابت (۸۰ھ-۱۵۰ھ)، علم فقہ کے امام، فقہ حنفی کے بانی، لقب امام اعظم، بڑے معاملہ فہم اور ذہین تھے۔ ان کا مسلک اول قرآن وسنت تھا۔ پھر اقوال صحابہؓ، اس کے بعد اجتہاد۔ خلیفہ منصور کی قید میں فوت ہوئے۔

۱۶۔ ابولہب، عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب ہاشمی۔ رسول اکرم ﷺ کا حقیقی چچا۔ سرخ رو اور شکیل تھا، اس لئے لوگ اس کو ابولہب کہتے تھے۔ آپ ﷺ کی عداوت میں یہ اور اس کی بیوی ام جمیل پیش پیش رہتے۔ سورۃ لہب ان دونوں میاں بیوی کی مذمت میں نازل ہوئی۔

۱۷۔ ابوجہل، عمرو ابن ہشام ابن مغیرہ مخزومی (۵۵۳ء-۶۲۳ء) اسلام کا بدترین دشمن، دین اسلام سے استہزاء کرنے والا۔ اہل ایمان کو ہر وقت دکھ اور تکلیف پہنچانے کی فکر میں رہتا۔ جاہلیت میں اس کنیت ابوالحکم تھی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کے کرتوتوں کے پیش نظر اسے ابوجہل کہا۔ غزوہ بدر میں دونو جوان انصاری بچوں معاذؓ اور معوذؓ کے ہاتھوں مارا گیا۔

۱۸۔ ابوالحکم۔ دیکھئے ابوجہل۔

۱۹۔ ابوالاعلیٰ، مودودی (۱۹۰۳ء-۱۹۷۹ء) جماعت اسلامی کے بانی، فکری ونظری راہنما، ممتاز عالم دین اور مفسر قرآن۔ تحریک ختم نبوت میں موت کی سزا سنائی گئی لیکن اس پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۲۰۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، (۱۹۳۲ء۔۲۰۰۸ء) شاعر، ادیب، معلم، اردو نقاد، محقق اور ماہرِ تعلیم تھے۔ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے چیئرمین رہے۔ کان پور (غیر منقسم ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔

۲۱۔ ابوالکلام آزاد، محی الدین احمد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء)، عالم دین، صحافی، ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے مدیر، انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ کانگریس کے کئی بار صدر بنے۔ بھارت کے پہلے وزیر تعلیم بنے، صاحبِ طرز انشاء پرداز اور قادر الکلام مقرر تھے۔

۲۲۔ ابوالبرکات، سید احمد قادری (۱۸۹۶ء - ۱۹۷۸ء) ممتاز عالم دین، ریاست الور میں پیدا ہوئے۔ سید محمد دیدار علی شاہ الوری کے فرزند تھے۔ دار العلوم حزب الاحناف کے شیخ التفسیر والحدیث رہے۔

۲۳۔ ابوالحسنات محمد احمد قادری، خطیب مسجد وزیر خان، سید دیدار علی شاہ کے صاحبزادے تھے۔ نامور عالم دین

تھے۔شعروادب کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ختم نبوت کے سلسلے میں قید کاٹی۔کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

۲۴۔ اُمِ ایمن، رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی خادمہ، اصل نام برکہ بنت ثعلبہ تھا۔سفرِ مدینہ میں سیدہ آمنہ کے ہمراہ تھیں۔مقامِ ابواء پر سیدہ کی وفات ہونے پر اُنھیں وہاں سپردِ خاک کیا اور آپ ﷺ کو بحفاظت مکہ مکرمہ لے آئیں۔

۲۵۔ اُمِ کلثوم، سیدہ خدیجۃ الکبریٰ کے بطن سے رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی، جو عمر میں حضرت رقیہؓ سے چھوٹی اور حضرت فاطمہؓ سے بڑی تھیں۔حضرت رقیہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے اُن کا نکاح حضرت عثمانؓ کے ساتھ خود پڑھایا۔

۲۶۔ مقبوضہ کشمیر کی بابت یہ تفصیل راقم السطور کے کرم فرما خواجہ محمد عارف (پ۱۹۶۲ء) نے فراہم کی ہے۔ خواجہ صاحب شاعر، ادیب اور لسان شناس ہیں۔برمنگھم (اِنگلستان) میں مقیم ہیں۔

لاحقۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' کے جمالیاتی رنگ

(لِسانی تناظر میں)

کسی ہفت رنگ ہیرے کو، سورج کے سامنے کیا جائے اور بدل بدل کر اُس کا ہر کونا، شعاعوں کے برابر لایا جائے تو ہر رنگ اپنی بہار دیتا ہے۔ کہیں سے ارغوانی، کہیں سے عنّابی، کہیں سے سنہری، کہیں سے ازرقوانی، کہیں سے حِنائی، کہیں سے بلّوریں اور کہیں سے احمریں عکس جھلکتا ہے۔ اِسی طرح پیکرِ الفاظ بھی جہانِ معانی رکھتے ہیں۔ اُنھیں مختلف زاویوں اور جہتوں سے دیکھا اور پرکھا جائے تو رنگا رنگ معانی اور مفاہیم کا تنوّع نظر آتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دیکھنے والی نظر لفظ کی گہرائی، اُس کے مادے اور اِشتقاق میں اُترنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ الفاظ، جو معنوی تنوّع اور لطافت و نزاکت کا خزانہ ہوتے ہیں، نباتات و حیوانات کی طرح ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ پھولتے پھلتے ہیں اور گروہِ خاندانی بناتے ہیں۔

زندہ قوم ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی زندہ و توانا زبان کی مشاطگی کے لیے تحقیق کا سفر جاری و ساری رکھنا از بس ضروری ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پیکرِ الفاظ میں پوشیدہ جہانِ معانی دریافت کیا جائے۔ مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے الفاظ کا مطالعہ کر کے اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ رنگا رنگ معانی اور مفاہیم کا تنوّع کس طرح وجود میں آتے ہیں۔ ہر لفظ بجائے خود گنجینۂ معنی کا ایک طلسم ہوتا ہے جسے کھولے بغیر گوہرِ مقصود کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ اس مرحلۂ دشوار کو ہر لفظ کی صحت، اُس کے اِملاء اور تلفظ کے تعین کے بعد ہی سر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام، جو بظاہر بہت حقیر اور معمولی نظر آتا ہے جس دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا متقاضی ہے وہ تیز رفتاری کے اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اُردو، دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنے اندر سمونے کی حیرت انگیز بلکہ یوں کہیے کہ معجزانہ

صلاحیت رکھتی ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ ہی پر کیا موقوف ہے انگریزی کے کتنے بہت سے الفاظ ہیں جو اُردو میں بے ساختہ اور بے تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ اِنجذاب کے اس قاعدے اور عمل کے مطابق، اُردو میں عربی، فارسی کی ترکیبوں اور علامتوں کا کھلا عمل دخل ہے۔ اس میں ہندی اور برصغیر کی مقامی زبانوں کے الفاظ، تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں لیکن اُردو زبان و ادب سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو پھر اُردو کنگال بن کر رہ جائے گی۔ علمی ضرورت کے لیے فارسی اور عربی سے استفادہ ناگزیر ہے ورنہ اردو علمی زبان ہی نہیں رہے گی۔ ''ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت، نمک شد'' کے مصداق عربی، فارسی کے یہ الفاظ اُردو زبان میں آ کر اُردو بن گئے ہیں۔

موضوعِ زیرِ بحث میں کلمۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' کے جمالیاتی رنگ واضح کرنا مقصود ہے۔ ''یں'' کلمۂ نسبت ہے جو فارسی سے اُردو میں آیا ہے۔ یہ جس اسم کے ساتھ لاحقے کے طور پر ملتا ہے اُسے اسمِ صفت بنا دیتا ہے جیسے آتش سے آتشیں (آتش + یں)، آخر سے آخریں، احمر سے احمریں، اوّل سے اوّلیں، بِلّور سے بِلّوریں، بنفشہ سے بنفشیں، پس سے پسیں، خُون سے خُونیں، رنگ سے رنگیں، ریشم سے ریشمیں، زر سے زرّیں، سنگ سے سنگیں، سیم سے سیمیں، شکّر سے شکّریں، شِیر سے شیریں، عنبر سے عنبریں، گندم سے گندمیں، گوہر سے گوہریں، مرمر سے مرمریں، مُشک سے مُشکیں، نرگس سے نرگسیں، نمک سے نمکیں، نور سے نوریں اور واپس سے واپسیں۔

اِسی طرح ''گیں'' (آگیں کا مخفف) بھی کلمۂ نسبت ہے جو کسی فارسی اسم کے بعد لاحقے کے طور پر مل کر اُسے اِسمِ صفت بنا دیتا ہے جیسے آب سے آب گیں، اندوہ سے اندوہ گیں، خشم سے خشمگیں، سُرمہ سے سُرمگیں (سُرمہ آگیں)، غم سے غم گیں وغیرہ۔ ''گیں'' بھرا ہوا اور لبالب کے معنی بھی دیتا ہے جیسے چشمِ سُرمگیں، خلوص آگیں وغیرہ۔ یہ ''والا'' اور ''صاحب'' کے معنی بھی دیتا ہے جیسے شرمگیں (شرم والا اور صاحبِ حیا)۔

کلمۂ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' سے بنے ہوئے اسمائے صفت اور آخر میں ''ی'' لگا کر بنائے گئے اسمائے کیفیت کے معنی بہت قریب قریب ہوتے ہیں بلکہ بعضوں کے معانی میں فرق اتنا قلیل اور خفیف ہوتا ہے کہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے مثلاً آتشی اور نوری اِسم کیفیت ہیں جب کہ آتشیں اور نوریں اِسم صفت۔ اسی طرح کئی اور مثالیں ہیں جیسے آخری اور آخریں، زرّی اور زرّیں، خونی اور خونیں، عنبری اور عنبریں، مُشکی اور مُشکیں، نرگسی اور نرگسیں وغیرہ۔ خونی اسمِ کیفیت ہے جو فاعل بن کر عام طور پر قاتل کا معنی دیتا ہے جب کہ خونیں اسمِ صفت ہے جس کا معنی ہے خون جیسے رنگ والا یا خون

سے لبریز۔

علامتِ نسبت ''یں'' اور ''گیں'' سے مُتَشکِّل اسمائے صفت کو رنگوں، خوشبوؤں، روشنیوں، حلاوت اور لطافت و مُلائمت سے خاص نسبت ہے۔ اُردو زبان و ادب سے وابستہ اِن جمالیاتی پہلوؤں نے، راقم السّطور کی حُسن بینی و حُسن شناسی کی حس کو چھیڑا اور مضمون زیرِ نظر لکھنے پر آمادہ کیا۔ رنگ اور رُوپ کو چھلکانے اور نمایاں کرنے والے اسمائے صفت میں سے احمریں، بِلّوریں، بنفشیں خُونیں، رنگیں، ریشمیں، زرّیں، سُرمگیں، سیمیں، گندمیں، لعلیں اور مُشکیں خاص اثر رکھتے ہیں۔ بنفشیں، عنبریں، مُشکیں اور نرگسیں خوشبو بکھیرنے والے اسمائے صفت ہیں۔ آبگیں، آتشیں، بِلّوریں، زرّیں، سیمیں، گوہریں، لعلیں اور نوریں سے روشنی اور نور کی بارش کا گمان ہوتا ہے۔ شکّریں اور شیریں حلاوت اور مٹھاس پر دلالت کرتے ہیں جبکہ آب گیں، بِلّوریں، پشمیں، ریشمیں اور مرمریں مُلائمت اور لطافت کا استعارہ ہیں۔ آیئے! الف بائی ترتیب کے ساتھ اِن سب اسمائے صفت کے استعمال کا جائزہ لیتے ہیں:[ا]

آبگیں: آب کا معنی پانی اور چمک ہے۔ ''گیں'' (آگیں کا مخفف) کلمۂ نسبت ہے۔ آب اور گیں سے مل کر بننے والے مرکب آبگیں کا مطلب ہے شیشہ، کانچ، بِلّور، باریک شیشے کا ظرف، آئینہ، الماس، شرابِ انگوری اور کنایتہً عاشق کا دل۔ ایک ترکیب عشق آبگیں ہے۔ ''عشق آبگیں'' ایک ناول کا نام بھی ہے جس کے مصنف عقیل شیرازی ہیں۔
بشارت گیلانی نے آبگیں کو اس طرح برتا ہے:

عمر شیشوں کے درمیاں گزری
مثلِ دل آبگیں نہیں ملتا

حبیب موسوی کا شعر ہے:

جو میں اے کوہکن دوں جانِ شیریں عشقِ شیریں میں
تو دکھلائے بجائے شِیر جوئے آبگیں پتھر

آبگینہ: آبگیں کی دوسری شکل آبگینہ۔ (آب+گینہ کلمۂ نسبت) ہے۔ اس کے معانی اور معنوی جہتیں بھی وہی ہیں جو آبگیں کی ہیں۔ ایک ترکیب آبگینۂ فانوس ہے جس کا معنی ہے لالٹین کا شیشہ۔ علاّمہ محمد اقبال نے آبگینہ کے شعری استعمال کو جو حُسن اور تقدس ودیعت کیا ہے اُس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاضِ ہستی میں وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اِس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں [۲]

آتشیں: اس کا معنی ہے آگ کی صفات رکھنے والا، آگ کی طرح روشن، آگ کی طرح گرم اور سُرخ۔ آتشیں خُو، آتشیں رُخ، آتشیں رخسار، آتشیں زبان، آتشیں سخن، آہِ آتشیں اور آتشیں دم اس سے متشکل ترکیبیں ہیں۔ اس کا معنی آگ کا بنا ہوا، آگ سے نسبت رکھنے والی کوئی چیز جیسے آتشیں اسلحہ بھی ہے۔ مجازی معنوں میں آتشیں آب، مے آتشیں، آتشیں عذار، آتشیں پیکر وغیرہ مستعمل ہیں۔ آیئے! آتشیں کی مختلف معنوی جہتوں اور اُن کے استعمال کو ملاحظہ کیجیے۔

۱۔ سوزاں، تپاں، سوزناک، جلا دینے والی، پھونک دینے والی جیسے آہِ آتشیں، آتشیں دم وغیرہ: استاد ذوقؔ نے کہا:

اِس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا
اب آہِ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا [۳]

میرؔ نے کہا ہے:

محشر میں اگر یہ آتشیں دم ہو گا
ہنگامہ سب اِک لپٹ برہم ہو گا [۴]

۲۔ روشن، چمکیلا، تاباں، چمکدار، درخشاں جیسے آتشیں رخسار:

آہ میری آتشیں ہے رُخ ہے تیرا آتشیں
اجتماعِ نور و نار اے مہ جبیں دیکھا یہیں [۵]

۳۔ آتشیں رُخ بمعنی معشوقہ سُرخ رنگ، وہ معشوقہ کہ جس کا چہرہ مثلِ شعلہ دمکتا ہو، نورانی چہرے والا معشوق، نور کا پُتلا، بُقعۂ نُور۔

بقول غالبؔ: صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ سر کُھلا [۶]

ناسخ نے آتشیں رخسار کا استعمال یوں کیا ہے:

کیوں سراپا ہے سپیدا اے آتشیں رخسار شمع
کیا ہے تیرے عشق میں میری طرح بیمار شمع[۷]

۴۔آتشیں خُو بمعنی آگ کی سی خصلت رکھنے والا، غضب ناک، خشمناک، تیز مزاج، غُصّہ ور۔
مومن خان مومن کہتے ہیں:

آتشیں خُو سے آرزوئے وصال
پک گیا اب خیالِ خام مرا [۸]

۵۔کوہِ آتشیں بمعنی آگ کا، آتش انگیز، آتش فشاں۔ یہاں آتش تابع فعل ہے۔
۶۔علامہ اقبال نے آتشیں کا استعمال کر کے ایک نئی معنوی جہت روشناس کرائی ہے:

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذّتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود[۹]

۷۔بشارت گیلانی نے مجازی معنوں میں آتشیں کا کیا عمدہ استعمال کیا ہے:

آگ لگتی ہے خانۂ دِل میں
آب اگر آتشیں نہیں ملتا

۸۔حبیب موسوی نے آتشیں کا استعمال اس طرح کیا ہے:

پسِ مُردن رہے قلب وجگر میں گر یہی سوزش
تو لوحِ سنگِ مرمر ہوگی از خود آتشیں پتھر
یہ کہتا ہے کسی نا مہرباں کا مہرباں ہونا
پسیجیں گے تری گرمی سے آہ آتشیں پتھر

۹۔ایک بہت ہی خوب اور موزوں ترکیب لعل آتشیں ہے:

کس لعلِ آتشیں کا ہے دل اپنا شیفتہ
جس پر ہمارا نام کُھدا وہ نگیں جلا [۱۰]

آخریں: یہ عربی، فارسی ترکیب ہے جس کا معنی ہے آخر سے نسبت رکھنے والا یعنی آخری، بعد کا وغیرہ۔
خدنگِ آخریں (آخری تیر)، آخریں تحویل (وقتِ نزع) وغیرہ ترکیبیں مستعمل ہیں۔

علاّ مہ اقبال کا معروف شعر ہے:

در میانِ کار زارِ کفر و دیں
ترکشِ مارا خدنگِ آخریں [۱۱]

آخریں دم: بمعنی دمِ واپسیں، وقتِ مرگ، نزع کا وقت، وقتِ جاں کُنی، دم نکلتے وقت۔
اُکھڑا سانس، اُلٹا سانس، اوپر کا سانس، ہنگامِ مرگ، آخری وقت

حکیم مومن خان مومنؔ کا شعر ہے:

ہوئی خجالت سے نفرت افزوں گلے کیے خُوب آخریں دم
وہ کاش اِک دم ٹھہر کے آتے کہ میرے لب پر بھی دم نہ ہوتا [۱۲]

بشارت گیلانی کہتے ہیں:

کوئی درمانِ ذوقِ نظّارہ
تادمِ آخریں نہیں ملتا

احمریں: احمر کا معنی ہے زیادہ سرخ۔ اس سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے مَے احمر، گلِ احمر وغیرہ۔ اِسی سے احمریں ہے۔ یہ بھی عربی، فارسی ترکیب ہے جس کا مطلب ہے سُرخ رنگ سے نسبت رکھنے والا، سُرخ رنگ والا۔

جون ایلیا کہتے ہیں:

جب وہ ناز آفریں نظر آیا
سارا گھر احمریں نظر آیا

اندوہ گیں: اندوہ کا معنی ہے غم، فکر، رنج، تردّد، تشویش وغیرہ، جب کہ اندوہ گیں کا مطلب ہے مغموم، رنجیدہ متفکر اور دردمند۔

بشارت گیلانی کا کیا عمدہ شعر ہے:

لاکھ اندوہ گیں ملتے ہیں
کوئی اندوہ بیں نہیں ملتا

جون ایلیا اپنے رنگ میں کہتے ہیں:

حسبِ خواہش میں اس سے ملتے وقت
سخت اندوہ گیں نظر آیا

اوّلیں: یہ عربی، فارسی ترکیب ہے۔ اوّل کا معنی ہے پہلا، مقدم، ابتدا، شروع، سب سے عمدہ، اعلیٰ،

افضل وغیرہ۔ جب کہ اوّلیں اوّل سے نسبت رکھنے والے کو کہتے ہیں۔اس کا مطلب ہے سب سے پہلا۔اوّلیں کا مرادی مفہوم ہے پہلے لوگ، پہلے زمانے والے وغیرہ۔ اوّلین و آخریں (بمعنی متقدمین ومؤخرین) کی ترکیب مستعمل ہے۔

حکیم مومن خان مومؔن کہتے ہیں:

صُوَر کا نفخِ اوّلیں افغاں

فتنۂ محشرِ آخریں افغاں [۱۳]

ناسخؔ نے اوّلیں کا استعمال اس طرح کیا ہے:

اوّلِ خیلِ ائمہّ ءِ ثانی آلِ عبا

مقتدائے اوّلین و آخریں پیدا ہوا [۱۴]

بِلّوریں: بلّور کا معنی ہے شیشہ، کانچ، کچا ہیرا وغیرہ۔ اِسی سے بِلّوریں بنا یعنی بِلّور کی طرح چمکیلا، شفّاف، بِلّور کا بنا ہوا، مثلِ بِلّور وغیرہ۔ میر حسن اپنی مثنوی سحرالبیان میں کہتے ہیں:

بِلّوریں صراحی، وہ جامِ بِلّور

دل و دیدہ وقف تماشائے نور

استاد ابراہیم ذوقؔ بِلّوریں کو اپنی شاعری میں اس طرح استعمال کرتے ہیں:

لبریز مے صاف سے ہوں جامِ بِلّوریں

زمزم سے ہے مطلب، نہ صفا سے نہ حجر سے

بنفشیں: بنفشہ ارغوانی رنگ کی ایک خودرُو پھول دار اور خوشبودار مشہور بُوٹی ہے جو کئی دواؤں میں کام آتی ہے۔بنفشیں، بنفشہ سے اسمِ نسبت ہے جس کا معنی ہے بنفشہ کے رنگ کا یعنی ارغوانی رنگ کا، ہلکے اُودے رنگ کا۔شاعری میں مُوئے سر اور زلف کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔

پسیں: پیشین کا مقابل پسیں پس سے اسم نسبت ہے جس کا معنی ہے آخر کار، پچھلا، قدیم وغیرہ۔ اِسی سے باز پسیں ہے یعنی پیچھے ہٹنے والا، دمِ پسیں یعنی آخری اور نزع کا وقت۔

احسن مارہروی کا شعر ہے:

کچھ سختیِ دنیا کا مجھے غم نہیں احسنؔ

کھٹکا ہے مگر دل کو دمِ باز پسیں کا

پشمیں: یہ پشم سے اسمِ نسبت ہے۔پشم کا معنی نرم بال، اُون، رُواں، بے حقیقت چیز، بے وُقعت شخص

اور بے کار چیز ہے۔

فغاںؔ کا شعر ہے:

اے شہ گدا کے خرقۂ پشمیں کو کم نہ جان
مارے ہے چشم پر تری زرّیں کلام کو

پشمینہ: (پشم + ینہ کلمۂ نسبت) یہ پشمیں کی متغیر صورت ہے۔اس کا معنی بھی پشمیں کی ذیل میں آتا ہے۔ایک اعلیٰ قسم کے اُونی کپڑے کو بھی پشمینہ کہتے ہیں۔

جویں: یہ اسم صفت ہے جس کا معنی ہے جَو سے نسبت رکھنے والی، جَو سے بنی ہوئی کوئی چیز۔اس سے ایک معروف ترکیب ''نانِ جویں'' تشکیل پاتی ہے۔

خشمگیں: خشم کا معنی غصہ، خفگی، طیش، ناراضی، عتاب وغیرہ ہے۔کلمۂ نسبت ''گیں'' کے لاحقے سے اسمِ صفت خشمگیں بنا جس کا معنی ہے غضب ناک اور غُصّہ دِلانے والا۔خشمناک بھی، خشمگیں کے معنی میں ہے۔ خشمگینی کا معنی غُصہ اور طیش ہے۔

آتشؔ نے کہا ہے:

زندہ نہ چھوڑے گی یہ نگہِ خشمگیں یار
نیکی کی چشم داشت نہیں بدنہاد سے

میر تقی میر کے مطابق:

قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر
کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر

....

ستم ہے تیری خوئے خشمگیں پر ٹک بھی دلجوئی
دل آزاری کی باتیں کر تو دلداری کو کیا جانے

میر انیسؔ کہتے ہیں:

پہنچا جو اس جلال سے وہ آفتابِ دیں
دیکھا سپاہ کو صفتِ شیرِ خشمگیں

خونیں: اس کا معنی ہے خون سے نسبت رکھنے والا جیسے خونیں رشتہ، خونیں تعلق، خونیں انقلاب، خونیں پیچش، خونیں قے وغیرہ۔خُونی اور خونیں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔خُونی بھی فارسی لفظ ہے جس کا مطلب ہے قاتل، خون ریز، ظالم اور سفاک وغیرہ۔''خونیں جامہ پہننا'' کا مطلب

ہے ”قتل کا حکم دینے یا غُصّہ ظاہر کرنے کے لیے بادشاہ کا سُرخ جامہ پہننا۔“

خونی کی سند اور استعمال کی بابت سؔحر کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

کیا فقط دل ہی ہمارا ہے گنہگاروں میں
آنکھ اُن کی بھی شرابی ہے نظر خونی ہے [۱۵]

”خونیں جگر“ کنایۃً عاشق کو بھی کہتے ہیں:

ممتاز ہیں اُلفت کے سبب ناموروں میں
یہ سب ہیں لبِ شاہ کے خونیں جگروں میں [۱۶]

رنگیں: رنگ سے نسبت رکھنے والی کسی چیز کو رنگیں کہتے ہیں۔ اس کی مختلف معنوی جہتیں مُندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ رنگا ہوا، مُلوّن، رنگ دار۔

۲۔ رنگیلا، چھیلا، چھبیلا۔

۳۔ خوش طبع، زندہ دل۔

۴۔ آراستہ، مُزَیّن، سجا ہوا، گلکاری کیا ہوا، مُرصّع۔

۵۔ گوناگوں، رنگ برنگ کا۔

۶۔ گلفام، گلرنگ، سُوہا، سُرخ۔

۷۔ دل پسند، خوش آئند، خوش رنگ، دل کش۔

۸۔ ایک معروف شاعر سعادت یار خان کا تخلص جو فرسنامہ حکایاتِ رنگیں کے مصنّف تھے۔

رنگیں سے اُردو شعر و ادب میں استعمال ہونے والی کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

رنگیں ادا: (صفت) وہ شخص جو نئی نئی وضع اور نئے نئے انداز نکالے، طرح دار، وضعدار اور خوش ادا۔

بہادر شاہ ظفر کے بقول:

یوں تو ہیں سروِ گل اندام اور بھی اے رشکِ گُل
تجھ سا پر رنگیں ادا گلگوں قبا دیکھا نہیں [۱۷]

رنگیں خط: وہ خط جس میں گُل و بلبل اور باغ وغیرہ کا تلازمہ ہو۔

ممنوؔن نے رنگیں خط کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

الٰہی کس نگارِیں پنجہ نے یہ خط لکھا رنگیں
کہ نامہ پڑھتا کے کچھ نشاں ہیں جا بجا رنگیں [۱۸]

رنگیں غزل: دل چسپ غزل، وہ غزل جس میں گل وبلبل کا تلازمہ اور رنگینیِ مضامین پائی جائے۔ بقول ممنوںؔ:

کیا ہی رنگین غزل اور لکھی ممنون نے
صفحہ کاغذ کا گیا صفحۂ گلزار سے مِل [۱۹]

رنگیں عبارت: وہ عبارت جس میں گلزار یا باغ کا تلازمہ ہو، دل چسپ عبارت، دل چسپ مضمون، مجازاً مقفّٰی و مسجع عبارت۔

رنگیں مزاج: خوش مزاج، خوش طبع، زندہ دل، ہنس مُکھ۔

رنگیں زبان: خوش بیان، خوش ادا، شوخ زبان۔

رنگیں سخن: شوخ زباں، خوش بیاں اور خوش ادا۔

رنگیں کمان: قوسِ قزح، دھنک۔

رنگین نوا: خوش آواز، سُریلا۔

رنگینی: (اسم کیفیت) تلوّن، گُلگلینی، بھڑک، آرائش، نمائش، آراستگی، بناؤ سنگھار، خوش طبعی، خوش مزاجی، بانکپن، چھیل پن۔

رنگینیِ سُخن: خوبیِ کلام

علامہ اقبال نے رنگیں اور رنگیں نوا کو اس طرح برتا ہے:

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گُل کو زباں دے کر تعلیمِ خامشی دی
رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی [۲۰]

ریشمیں: یہ ریشم سے منسوب اسمِ صفت ہے۔ ریشم، ابریشم کا مخفف ہے جس کا معنی ہے حریر اور قیمتی کپڑا۔ یہ وہ تار ہے جو ریشم کے کیڑوں کے پیٹ میں سے نکلتا ہے۔ اسمِ صفت ریشمیں کا مطلب ہے ریشم کا بُنا ہوا، ریشم جیسا خوبصورت اور نرم و نازک۔ ریشمی اسم کیفیت ہے جب کہ ریشمیں اسم صفت ہے۔

ماہرالقادری کے بقول:

ریشمیں رومال سے ہونٹوں کی سرخی کو نہ چھو
مجھ پہ چل سکتا نہیں تیرا فریبِ رنگ و بو

منیر نیازی نے ریشمیں کا استعمال یوں کیا ہے:

اُس کے ریشمیں کپڑے ہیں یا تیز ہوا کا زور
چَھن چَھن کرتی پازیبیں ہیں یا پتوں کا شور

ایک اور شاعر (قاسم شاہ) کہتے ہیں:

وہ جو تار پھوٹے تھے ریشمیں، جنھیں بُن کے دل تھا ڈرا ہوا
کہیں اُن میں بن گئیں تتلیاں، کہیں کوئی نکلا مرا ہوا

زرّیں: زر یعنی سونے سے منسوب۔ زرّیں کا مطلب ہے سونے کا بنا ہوا، جس پر سونے کا کام کیا گیا ہو، بیش قیمت وغیرہ۔ گولڈن جوبلی کو اُردو میں جشنِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ زریں سے متعدد ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے:

زرّیں بال: سنہری پروں والا مُرغ، زریں بال سورج کو بھی کہتے ہیں۔
زرّیں پوش: زردوزی لباس پہننے والا۔
زرّیں شاخ: کنایتہً قلم۔
زرّیں عَلَم: کپڑے کا جھنڈا جس پر سونے کا کام کیا ہوا ہو۔
زرّیں قبا: سونے سے مرصّع لباس۔
زرّیں قدح: نرگس کی ایک قسم۔
زرّیں کاسہ: سُورج۔
زرّیں کلاہ: وہ جس کے سر پر سنہری ٹوپی ہو۔
زرّیں لباس: سونے سے مرصّع لباس۔
زرّیں مرغ: ایک پرندے کا نام، آفتاب کو بھی کہتے ہیں۔
جامِ زریں: سونے کا بنا ہوا پیالہ۔
جشنِ زریں: گولڈن جوبلی۔
زرینہ: (اسمِ صفت) زرّیں کی مونث، عورتوں کا نام۔

زریں کنایتہً بیش قیمت کو بھی کہتے ہیں جس کی سندر شکؔ کا یہ شعر ہے:

بارِ خاطر ہے سبک وضعوں سے رسمِ اختلاط
رشکؔ کو اقرار ہے رائے زرینِ یار کا [۲۱]

علامہ اقبال نے زریں قبا کو یوُں برتا ہے:

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زرّیں قبا؟[۲۲]

نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں:

سُن کر بسنت مطرب زرّیں لباس سے
بھر بھر کے جام پھر مے گلرنگ کے پیو

حسن شوقی کا شعر ہے:

دھرے تھالِ زرّیں میں بالا و زیر
دُرّا جاں کے ڈبگلے بٹیراں کے ڈھیر

سُرمگیں: سُرمہ ایک سیاہ رنگ کا عنصر ہے جسے پیس کر آنکھوں میں لگاتے ہیں۔ سولہ سنگار میں سُرمہ (کاجل) بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ سُرمہ سے درج ذیل ترکیبیں مستعمل ہیں:

سُرمہ آلود، سُرمۂ آواز، سُرمۂ اصفہانی، سُرمہ بھری، سُرمۂ بینائی، سُرمۂ چشم، سُرمۂ خِفا، سُرمہ خاکبیں، سُرمۂ دنبالہ دار، سُرمۂ سلیمانی، سُرمہ کش، سُرمہ کشیدہ، سُرمہ درگلو، سُرمہ سا، سُرمئی (سُرمے کے رنگ کا) وغیرہ۔

سُرمگیں اصل میں سُرمہ آگیں کا مخفف ہے جس سے ایک معروف ترکیب ''چشمِ سُرمگیں'' تشکیل پاتی ہے یعنی سرمہ لگی ہوئی آنکھ۔

سُرمگیں آنکھ دکھا کر وہ جِلا دیتے ہیں
سحر کے پردہ میں اعجازِ مسیحائی ہے[۲۳]

میر تقی میر سُرمگیں کو اس رنگ میں لیتے ہیں:

سُرمگیں چشم پہ اس شوخ کی زنہار نہ جا
ہے سیاہی مژہ میں وہ نِگہ گھات کے بیچ

زنہار پشت پا سے نہیں اُٹھتی اس کی آنکھ
اس چشمِ سرمگیں کو بہت ہے حیا سے ربط

داغ دہلوی کا کہنا ہے:

کاش سنتا نہ کوئی شور و فغاں
دل کی جا چشمِ سُرمگیں بنتی

....

جو نگاہِ سُرمگیں تھی ہو گئی وہ شرمگیں
باڑھ چڑھ کر آب اتری ہے تری تلوار کی

سنگین: سنگ کا معنی ہے پتھر، وزن، بوجھ، تمکین، وقار، وغیرہ۔ اس سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے:
سنگِ آستان، سنگِ اسود، سنگِ آہن رُبا، سنگِ باسی، سنگِ بصری، سنگِ پارس، سنگ پُشت، سنگ تراش، سنگِ خارا، سنگ دل، سنگ دانہ، سنگِ راہ، سنگ ریزہ، سنگ سار، سنگ ساز، سنگِ سُرخ، سنگِ سُرمہ، سنگِ سلیمانی، سنگِ سماق، سنگِ سینہ، سنگِ شجر، سنگ شوئی، سنگلاخ، سنگِ لرزاں، سنگِ لوح، سنگِ ماہی، سنگِ مثانہ، سنگِ مرمر، سنگِ مزار، سنگِ مقناطیس، سنگِ موسیٰ، سنگِ یشب وغیرہ۔

سنگین سنگ سے منسوب ہے جس کا معنی ہے پتھر سے نسبت رکھنے والا، پتھر کا بنا ہوا، سخت، ٹھوس، مضبوط وغیرہ۔ اس سے سنگین جرم، سنگیں خواب، سنگین سزا، سنگین دل، سنگین توبہ، سنگین جمع بندی اور سنگین کام کی ترکیبیں تشکیل پائی ہیں۔

نکلا ہے تیری مردمک چشم سے پہرا
سنگین مگر اے بُت خونخوار ہیں پلکیں [۲۴]

....

نبھے کیوں کر ہمارے اُس پری پیکر سے یارانا
وہ سنگیں دِل میں سودائی وہ بے پروا میں دیوانا [۲۵]

رشک کا شعر ہے:

سخت جانی مجھ میں ہے سنگیں دِلی ہے یار میں
صحبت ایسی ہے کہ پتھر جیسے ہو پتھر کے پاس [۲۶]

سیمیں: سیم چاندی کو کہتے ہیں۔ اس سے کئی ترکیبیں مستعمل ہیں جیسے سیم اندام، سیم پرست، سیم

تلغراف (بمعنی برقی تار)، سیم سیما (چاندی کی طرح روشن چہرہ)، سیم کش، سیم کوب، سیم گر، سیم گوں (صفت) وغیرہ۔ سیمیں سیم یعنی چاندی سے منسوب ہے۔ سیمیں بدن، سیمیں تن، سیمیں رُخ، سیمیں عذار اور سیمیں عارض محبوب کی صفات میں شامل اور مستعمل ہیں۔

آبرو شاہ مبارک کا شعر ہے:

ترے رخسارۂ سیمیں پہ مارا زلف نے کنڈل
لیا ہے اژدہا نے چھین یارو مال عاشق کا

طالب باغپتی نے کہا:

تجدیدِ عہدِ کرنسی سیمیں بدن کے ساتھ
یعنی لُٹا شباب، شرابِ کہن کے ساتھ

شرمگیں: شرم کے معانی غیرت، حیا، حجاب، ننگ، عار، ندامت، خجالت، خفت، عزّت، حرمت، خیال، پاس وغیرہ کے ہیں۔ شرم کے ذیل میں کئی ترکیبیں اور محاورے مستعمل ہیں جیسے شرمناک، شرمندہ، شرمگاہ، شرم حضوری، شرمسار، شرم زدہ، شرم آلود، شرمندۂ احسان، شرمندۂ تعبیر، شرمندہ صورت، شرمندہ معنی، شرم آنا، شرمانا، شرم رکھنا، شرم دلانا، شرم رہ جانا، شرم سے پانی پانی ہوجانا وغیرہ۔
شرمگیں، شرم آگیں کا مخفف ہے جس کا معنی ہے شرمندہ، خجل اور نادم۔

داغ دہلوی کا شعر ہے:

جو نگاہِ سُرمگیں تھی ہو گئی وہ شرمگیں
باڑھ چڑھ کر آب اُتری ہے تری تلوار کی

شکّریں: شکّر کے معانی کھانڈ، قند، چینی، نبات، میٹھے الفاظ، میٹھی گفتگو اور معشوق کے ہونٹ ہیں۔ شکّر برگ، شکّر آمیز، شکّر آویز، شکّر بادام، شکّر بار، شکّر پارہ، شکّر خور، شکّر دان، شکّر دہان، شکّر رنجی، شکّر رنگ، شکّر ریز، شکّر زبان، شکّر لب، شکّر قندی، وغیرہ اس سے مستعمل ترکیبیں ہیں۔ شکّریں کا معنی ہے شکّر سے نسبت رکھنے والا۔ اِسی سے شکّریں گفتار کی ترکیب بنی جس کا معنی شیریں سخن ہے۔

حروف ہیں کہ مٹھائی پہ چیونٹیاں دوڑیں
قلم ہے یا کوئی طوطیِ شکّریں گفتار [۲۷]

شیریں: شِیر کا معنی دودھ ہے۔ شیر خور، شیر دان، شیر گرم، شیر مادر، شیر مال، شیر وشکر وغیرہ اس سے مستعمل ترکیبیں ہیں۔ شیریں کا معنی ہے حلاوت میں شِیر (دودھ) سے نسبت رکھنے والا۔ شِیر کا مجموعی ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اس لیے اس سے نسبت برمحل اور درست ہے۔ شیریں کے معانی ''میٹھا'' کے علاوہ لذیذ، رطب، دل پسند، خوشگوار، نرم، عزیز اور پیارا ہیں۔ مشہور عشقیہ داستان کے فرہاد کی معشوقہ کا نام بھی شیریں ہے جس کا شاعری میں تلمیحاً بہت ذکر ہے۔ اسی لفظ سے، شیریں انداز، شیریں ادا، شیریں بیان، شیریں تبسم، شیریں خرام، شیریں دہاں/دہن، شیریں رقم، شیریں زبان، شیریں سخن، شیریں کلام، شیریں گفتار، شیریں مقال، شیریں نفس، شیریں شمائل، شیریں طبع، شیریں کار، شیریں لب اور شیریں نوا جیسی ترکیبیں تشکیل پائی ہیں جو اردو زبان وادب کا قابلِ قدر اثاثہ ہے۔

استاد ذوقؔ کا شعر ہے: ترے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آب دم خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آب زمزم کا [۲۸]

حبیب موسوی نے شیریں کو کس رنگ میں بیان کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

جو میں اے کوہکن دوں جانِ شیریں عشقِ شیریں میں
تو دکھلائے بجائے شیر جوئے آبگیں پتھر

عنبریں: عنبر ایک خوشبو کا نام ہے۔ عنبر آگ پر موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ عنبر بار، عنبر افشاں، عنبر بیز، عنبر آلود، عنبر سارا، عنبر سوز، عنبر شمیم، عنبر فام، عنبر آگیں وغیرہ ترکیبیں مستعمل ہیں۔ اِس سے منسوب عنبریں کا معنی ہے عنبر میں بسایا ہوا، عنبر سے مُعَطّر، عنبر کے رنگ کا، عنبر کی خوشبو دینے والا۔ اِسی سے عنبریں خال، عنبریں خط، عنبریں سنبل، گیسوئے عنبریں اور مُوئے عنبریں کی ترکیبیں بنی ہیں۔

مرزا اسداللہ خان غالب کہتے ہیں:

شِکن زُلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نِگہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟

وزیر لکھنوی کے مطابق:

عبث چھوا ترے گیسوئے عنبریں کا سانپ
ہوا ہے ہاتھ مرا میری آستین کا سانپ

عیشؔ نے زلفِ عنبریں کو یوں باندھا ہے:

لگی ہوئی ہے صبا گھات میں مجھے ڈر ہے
نہ کھول دے کہیں وہ زلفِ عنبریں اپنی

انوؔر نے گیسوئے عنبریں کو یوں برتا ہے:

نہیں کوئی سامنے تو کیا ہے جہاں ترا صید ہو چکا ہے
کہ دام گستر وہ جا بجا ہے شمیم گیسوئے عنبریں کا

غم گیں / غمیں: غم کا معنی ہے رنج، اَلَم، حزن، کلفت، ملال، افسوس، اندوہ، آزردگی، سوگ، فکر وغیرہ۔ غم آشام، غم آلود، غم آئین، غم انگیز، غم پرست، غم پرور، غم خانہ، غم خوار، غم دوست، غمدان، غم زدہ، غم دیدہ، غم فرسودہ، غمگسار، غمکدۂ عالم، غمِ ہجر وغیرہ اس سے ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں۔ غمگین کی ترکیب اصل میں غم آگیں ہے جس کا مخفف غم گیں ہے۔ شعری ضرورت کے تحت غم گیں کا مخفف غمیں بنا لیا گیا۔ اس کا معنی رنجیدہ، اُداس، مغموم، دل گیر، دل گرفتہ، آزردہ، پژمردہ خاطر، اندوہ گین، ملول، دردمند وغیرہ ہے۔ غمگین کرنا اور غمگین ہونا محاورے ہیں۔ غمگینی اس کا اسمِ کیفیت ہے۔

علاّمہ محمد اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ [۲۹]

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم
طلسمہا شکند آں دِلے کہ ما داریم [۳۰]

گندمیں: گندم یعنی گیہوں انسان کے لیے اہم ترین اناج ہے۔ گندم سے کئی ترکیبیں مستعمل ہیں جیسے گندم با، گندم بریاں، گندم رنگ، گندم گوں، گندم نما وغیرہ۔ گندمیں گندم سے منسوب ہے یعنی گیہوں کے رنگ کا، گیہُواں، سانولا جیسے گندمی رنگ۔ گندم گُوں بھی گندمیں کے معنی میں ہے۔ گندم سے اسمِ کیفیت گندمی ہے جو معنوی لحاظ سے گندمیں کے بہت قریب ہے۔

گوہریں: گوہر کا معنی موتی، جوہر، قیمتی پتھر وغیرہ ہے۔ اس سے کئی ترکیبیں بنتی ہیں جیسے گوہرِ آبدار، گوہر آگیں، گوہر افشاں، گوہر بار، گوہر بند، گوہر تاب، گوہر تر، گوہر پرور، گوہر جان، گوہر دار،

گوہردل، گوہرریز، گوہرسُفتہ، گوہرسنج، گوہرشب تاب، گوہرغلطاں، گوہرفروش، گوہرفشاں، گوہرنگاروغیرہ۔

گوہریں کا مطلب ہے گوہر سے نسبت رکھنے والا، گوہر کی سی آب وتاب رکھنے والا اور خوب صورت۔ اِس سے کئی مستعمل ترکیبیں ہیں جیسے قبائے گوہریں، کِلکِ گوہریں وغیرہ۔

مجید امجد نے اپنی نظم ''آٹوگراف'' میں اس ترکیب کو یوں استعمال کیا ہے:

وہ صفحۂ بیاض پر بصد غرور کِلکِ گوہریں پھری
حسین کھلکھلاہٹوں کے درمیاں وکٹ گری

لعلیں: یہ لعل سے منسوب ہے۔ لعل سُرخ رنگ کے ہیرے کو کہتے ہیں۔ کنایتہً معشوق کے ہونٹوں کو لعل کہا جاتا ہے جس کے لیے ایک عمدہ ترکیب لعلِ آب دار استعمال کی جاتی ہے۔ اسی طرح لبِ لعلیں، لعلِ بدخشاں، لعلِ پیکانی، لعلِ رُمّانی، لعلِ سفید، لعلِ خوشاب، لعلِ خفتان، لعلِ دوشابی، لعلِ رواں، لعلِ شکر بار، لعلِ فلک، لعلِ قبا، لعلِ شب چراغ، لعل گُوں، لعل لب اور لعلِ ناسفتہ کی ترکیبیں مستعمل ہیں۔ اس سے کئی محاورے بھی مستعمل ہیں جیسے لعل اُکھاڑنا، لعل اُگلنا، لعل جڑے ہونا، لعل لگانا، لعل توڑنا، لعل لگنا، لعل گلے ہونا وغیرہ۔

لبِ لعلیں کا استعمال ناصر کاظمی کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

پھر دیکھنا اُس کے لبِ لعلیں کی ادائیں
یہ آتشِ خاموش ذرا اور دہک لے

منیر نیازی محبوب کے لبِ لعلیں کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

چھلکائے ہوئے چلنا خوشبو لبِ لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے مہکائے ہوئے رہنا
اک شام سی کر رکھنا کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

مرمریں: مرمر ایک قسم کا سفید، زرد، سرخ اور نیلگوں قیمتی پتھر ہے جس میں بہت ملائمت اور چمک ہوتی ہے۔ مرمریں کا معنی ہے مرمر سے نسبت رکھنے والا، مرمر کی مانند، صاف وشفاف، مُلائم اور خوبصورت۔

عبدالحمید عدم کہتے ہیں:

مرمریں مرقدوں پہ وقتِ سحر
مے کشی کی بساط گرم کریں
موت کے سنگ دل غلافوں کو
ساغروں کی کھنک سے نرم کریں

مُشکیں: مُشک وہ خوشبودار سیاہ رنگ کا مادہ ہے جو نیپال، تبت، تاتار اور ختن میں ایک قسم کے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے۔ اسے کستوری بھی کہتے ہیں۔ شعرا زلفِ معشوق کی سیاہی کو مُشک سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ایک بہت مشہور ضرب المثل ہے:

''مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔''

اس سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے مُشکبار، مُشک بلاؤ، مُشک بو، مُشک بیز، مشک بید، مشک فام، مشک فشاں، مشکِ ناب، مشکِ نافہ، مشک اذفر، مُشکبُو، مُشک پاش، مُشکِ ترکان، مشکسار، مشک آلودہ وغیرہ۔

مشکیں، مُشک سے منسوب ہے جس کا معنی ہے مشک کی مانند، مشک کی خوشبو جیسا اور خوشبودار۔ اس کے علاوہ کالا، سیاہ رنگ اور سیاہ فام کا معنی بھی دیتا ہے۔ معشوق کی زلفوں کی سیاہی کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں جیسے گیسوئے مُشکیں، کاکلِ مُشکیں وغیرہ۔ اس کے علاوہ مُشکیں پرند، مُشکیں خط، مُشکیں عذار، مُشکیں کلاہ، مُشکیں کمند، مُشکیں مُو اور مُشکیں مہرہ کی ترکیبیں مستعمل ہیں۔

دیا شنکر نسیم اپنی مثنوی گلزارِ نسیم میں کہتے ہیں:

مُشکِیں زلفوں سے مَشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

ایک نامعلوم شاعر نے مُشکیں کو یوں باندھا ہے:

جب ہوا سے یار کے گیسوئے مُشکیں ہل گئے
مُشکِ نافہ صاف ہر اک گھر کا روزن ہو گیا

نرگسیں: نرگس ایک پودا ہے جس کے پتّے گھاس کی مانند مگر ذرا چوڑے ہوتے ہیں۔ موسمِ سرما میں بیچ میں سے ایک شاخ نکلتی ہے جس پر سفید اور نہایت خوشبودار پھول نکلتے ہیں جن کے درمیان

پتوں کا زرد پیالہ بنا ہوتا ہے۔اس پودے کے پھول کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔مجازاً معشوق کی مست آنکھ کو کہتے ہیں۔اس سے کئی ترکیبیں مستعمل ہیں جیسے نرگسِ بیمار، نرگسِ شہلا، نرگسِ طنّاز، نرگسِ فتّان، نرگسِ مخمور، نرگسِ نیم خواب، نرگسِ جادو، نرگسِ زنجور وغیرہ۔

نرگسیں، نرگس کے پھول سے منسوب ہے جس کا معنی ہے نرگس سے مشابہ جیسے نرگسیں آنکھ۔ نرگسی اور نرگسیں، باوجود مختلف ترکیبوں کے، تقریباً ہم معنی ہیں۔

عشرت قادری کا شعر ہے:

تابِ نگاہ تھی تو نظارہ بھی دوست تھا
اس چشمِ نرگسیں کا اشارہ بھی دوست تھا

پروین اُمِ مشتاق کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

نرگسیں آنکھ بھی ہے ابروئے خم دار کے پاس
دوسری اور بھی تلوار ہے تلوار کے پاس

نغمگیں: نغمہ کا معنی راگ، گانا، غِنا، گیت، ترانہ، موسیقی، لَے، سُریلی آواز، میٹھی آواز اور ترنّم ہے:

نغمہ کی ہے ہوَس نہ تمنّا شراب کی
ساقی بغیر بھول گئے ناؤ نوش کو [۳۱]

....

اِلٰہی اُٹھ گئی کیسی حلاوت رنج و شادی کی
نہ وہ نغمہ ہے نغمہ میں نہ وہ نالہ ہے نالے میں [۳۲]

نغمگی نغمہ کا اسمِ کیفیت ہے جس کا معنی ہے نغمے کی کیفیت، نغمہ پن، غنائیت اور ترنّم۔نغمہ سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے نغمہ پرداز، نغمہ ریز، نغمہ سنج، نغمہ زن، نغمہ طراز، نغمہ سرا، نغمہ کار اور نغمۂ تر۔نغمگیں منسوب بہ نغمہ ہے جس کا معنی ہے نغمہ اور ترنّم سے بھرپور شاعری یا آواز۔

جو طلب میری بڑھا ڈالے
وہ صدائے نغمگیں تم ہو

نگاریں: نگار نقش کا مترادف ہے جس کے مندرجہ ذیل معانی ہیں:

۱۔ تصویر، بُت، مورتی اور خوب صورت۔

۲۔ کنایۃً معشوق اور محبوب۔

۳۔ زیبائش، آرائش اور زینت۔

۴۔ وہ شکل جو عورتیں اپنے ہاتھ پر مہندی سے بناتی ہیں۔

۵۔ فارسی مصدر نگاشتن یا نگاریدن سے صیغۂ امر جو کسی اسم کے بعد آ کر اُسے اسم فاعل ترکیبی بنا دیتا ہے اور لکھنے والے کا معنی دیتا ہے مثلاً افسانہ نگار وغیرہ۔

اس سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے نگار ارمنی، نگار بندی، نگار خانہ، نگارستان، نگارش وغیرہ۔

نگاریں منسوب بہ نگار کا معنی ہے:

ا۔ مہندی لگا ہوا، حِنا بستہ اور مُنقّش۔

۲۔ آراستہ، سجا ہوا اور مزیّن۔

۳۔ مجازاً معشوق، دِلبر اور محبوب۔

ایسا تھا وہ گلشن نگاریں
رضوان جس باغ کا تھا گلچیں [۳۳]

نگیں: نگ سے منسوب نگیں اسمِ صفت ہے۔ نگ کا معنی ہے قیمتی پتھر اور شیشہ، جو زیور میں جڑا جاتا ہے۔ نگیں کا معنی ہے نگ سے نسبت رکھنے والا، نگ کی طرح خوبصورت۔ اس کی دوسری شکل نگینہ ہے۔ اِسی سے نگینہ جڑنا، نگینہ کی چوڑیاں، نگینہ سا، نگینہ گر، نگینہ ساز وغیرہ ترکیبیں اور محاورے ہیں۔

جب سے دیکھا ہے ترا نام نگیں پر کندہ
خوں ہوا جاتا ہے دل ہم یہ نگیں کیوں نہ ہوئے [۳۴] (معروف)

....

کس لعلِ آتشیں کا ہے دل اپنا شیفتہ
جس پر ہمارا نام کُھدا وہ نگیں جلا [۳۵] (آتش)

....

پاس ہر دم اُسے تعویز بنا کر رکھنا
گر نگیں دل کا کوئی نذر گزارے پیارے [۳۶] (حضور آصف)

....

نام عنقا نشان تیرے کا
جو نگیں دِل میں آشیانہ ہے (اثر)

....

تصدیق سے قریں ہو کیوں کر ترا تصور
اک لفظ بے صدا ہے اک نقش بے نگیں ہے(اکبر)

....

بے لوث محبت ہے جسے ملک سے اپنے
وہ برہنہ پا خسرو بے تاج و نگیں ہے(صفی لکھنوی)

نمکیں: نمک ایک مادہ ہے جو سوڈیم اور کلورین کا مرکب ہے۔اس میں کھاری پن اور سلُونا پن ہوتا ہے اس لیے سالنوں اور کھانوں میں ڈالا جاتا ہے۔اس سے کئی ترکیبیں مستعمل ہیں جیسے نمک آلود،نمک افشاں،نمک بند،نمک پاش،نمک پرور،نمک پروردہ،نمک چش،نمک حرام،نمک حلال،نمک خوار،نمک دان،نمک سار،نمک سُودہ وغیرہ۔نمکینی اس کا اسم کیفیت ہے جس کا معنی سلونا پن، ملاحت اور خوبی ہے۔اس سے کئی محاورے بھی اُردو زبان وادب کا حصہ ہیں جیسے نمک پاشی کرنا،نمک کا حق ادا کرنا،نمک کھانا اور نمک چھڑکنا وغیرہ۔

نمکیں،منسوب بہ نمک ہے جس کا معنی ملیح،سانولا،سلونا،گندمی رنگ،ملاحت،بانکپن،روزی روزینہ،تنخواہ،سلونی چیز کا ذائقہ اور شوخیِ کلام کا لطف ہے۔

بوسہ دے دیجیے لعلِ نمکیں کا مجھ کو
جاں نثار ایسے نمک خوار ہوا کرتے ہیں [۳۷]

ناسخ نے نمکیں کو اس طرح استعمال کیا ہے:

کوئی کڑوی ہے کوئی میٹھی
نمکیں کوئی، کوئی کھٹ مِٹھی [۳۸]

نوریں: نور کا معنی ہے روشنی،تجلّی،اُجالا،چمک،تاب،جلوہ،درخشانی،رونق،رُوپ وغیرہ۔اس سے کئی ترکیبیں مستعمل ہیں جیسے نورآگیں،نورافشاں،نورِالٰہی،نورالعین،نورباف،نورجہاں،نورِچشم، نورِدیدہ،نورعلیٰ نور،نورافزا،نورپاش،نورِایمان،نورانی،نورِبصر وغیرہ۔

نوریں منسوب بہ نور ہے جس کا معنی ہے نورانی،نورافشاں اور نور سے بھری ہوئی کوئی چیز۔

مجید امجد کا شعر ہے:

اب لبِ رنگیں پہ نوریں مسکراہٹ کیا کہوں
بجلیاں گویا شفق زاروں میں رقصاں ہوگئیں

واپسیں: واپس باز پس کا مُرادِف ہے جس کا معنی ہے پیچھے، بعد کا، لوٹایا ہوا، پھر، دوبارہ وغیرہ۔ اس سے کئی محاورے بنائے گئے ہیں جیسے واپس ملنا، واپس لینا، واپس دینا، واپس آنا، واپس جانا وغیرہ۔ اس کا اسمِ کیفیت واپسی ہے۔

واپسیں واپس سے منسوب ہے جس کا معنی ہے آخر کا، آخری۔ اس سے دمِ واپسیں جیسی معروف ترکیب مُتَشکِّل ہوئی۔ دمِ واپسیں کا مطلب ہے حالتِ نزع۔ غالبؔ کہتا ہے:

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

جون ایلیا اِس طرح کہتے ہیں:

تُو مجھے اے میرے فروغ نگاہ
اب دمِ واپسیں نظر آیا

اُردو زبان وادب میں، انسانی زندگی کے جمالیاتی پہلو بہت نمایاں ہیں۔ اِن پہلوؤں کا اظہار موزوں الفاظ اور مناسب تراکیب سے ہوتا ہے۔ اُردو زبان وادب سے وابستہ اِن جمالیاتی پہلوؤں نے راقم السطور کی حِسِ حُسن بینی وحُسن شناسی کو مہمیز کیا اور مضمون زیرِ نظر لکھنے پر آمادہ کیا۔ یہ مضمون جہاں موزوں الفاظ اور مناسب تراکیب کا مطالعہ ہے وہاں انسانی نفسیات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ زیرِ بحث الفاظ کے مادوں، مشتقات اور معانی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل لُغوی مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے:

- الیسوعی، لوئیس معلوف، المنجد (بیروت: دارالمشرق، ۱۹۷۳ء)
- بلیاوی، مولانا عبدالحفیظ، مصباح اللغات (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)
- سیّد تصدق حسین رضوی، لغاتِ کشوری، باہتمام منشی نول کشور مطبع اودھ اخبار، سن ندارد
- نیّر، مولوی نورالحسن، نوراللغات (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء)
- سیّد احمد دہلوی، مولوی، فرہنگِ آصفیہ (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء)
- عبدالحمید، خواجہ، جامع اللغات (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء)
- حقی، شان الحق، فرہنگِ تلفظ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)
- خویشگی، محمد عبداللہ خان، فرہنگِ عامرہ (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء)
- سرہندی، وارث، علمی اردو لغت (لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۱۲ء)

۲۔ اقبال، علاّمہ محمد، کلیدِ کلیاتِ اقبال (لاہور: ادارہ اہلِ قلم، ۲۰۰۵ء) ص ۲۲۵۔

۳۔ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۱، ص ۱۰۶۔

۴۔ ......ایضاً......ص ۱۰۶۔

۵۔ ......ایضاً......ص ۱۰۷۔

۶۔ نوراللغات، جلد۔۱، ص ۵۱۔

۷۔ ......ایضاً......ص ۵۱۔

۸۔ ......ایضاً......ص ۵۱۔

۹۔ کلیدِ کلیاتِ اقبال، ص ۶۰۹۔

۱۰۔ نوراللغات، جلد۴، ص ۱۵۵۱۔

۱۱۔ کلیاتِ اقبال (فارسی)، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۱ء) ص ۹۸۔

۱۲۔ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۱، ص ۱۰۷۔

۱۳۔ نوراللغات، جلد۔۱، ص ۴۱۴۔

۱۴۔ ......ایضاً......ص۴۱۴۔

۱۵۔ ......ایضاً جلد۔۲،ص۱۲۷۲۔

۱۶۔ ......ایضاً......ص۱۲۷۲۔

۱۷۔ فرہنگِ آصفیہ،جلد۔۲،ص۳۷۶۔

۱۸۔ ......ایضاً......ص۳۷۶۔

۱۹۔ ......ایضاً......ص۳۷۶۔

۲۰۔ کلیدکلیاتِ اقبال،ص۱۱۱۔

۲۱۔ نوراللغات، جلد۔۳،ص۲۴۵

۲۲۔ کلیدکلیاتِ اقبال،ص۴۴۴۔

۲۳۔ نوراللغات، جلد۔۳،ص۳۳۷۔

۲۴۔ فرہنگِ آصفیہ،جلد۔۳،ص۱۱۲۔

۲۵۔ ......ایضاً......ص۱۱۲۔

۲۶۔ نوراللغات، جلد۔۳،ص۳۷۲

۲۷۔ ......ایضاً......ص۴۴۸۔

۲۸۔ ......ایضاً......ص۴۴۸۔

۲۹۔ کلیدکلیاتِ اقبال،ص۵۷۹۔

۳۰۔ ......ایضاً......ص۷۲۵۔

۳۱۔ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۴،ص۵۸۰۔

۳۲۔ ......ایضاً......ص۵۸۰۔

۳۳۔ نوراللغات، جلد۔۴،ص۱۵۴۶۔

۳۴۔ فرہنگِ آصفیہ،جلد۔۴،ص۶۰۰۔

۳۵۔ ......ایضاً......ص۶۰۰۔

۳۶۔ ......ایضاً......ص۶۰۰۔

۳۷۔ نوراللغات، جلد۔۴،ص۱۵۵۵۔

۳۸۔ ......ایضاً......ص۱۵۵۶۔

ہندی الاصل مصادِر سے مُشتق ''نون'' پر ختم ہونے والے الفاظ

(لِسانی تناظر میں)

عصرِ حاضر کے ماہرینِ لِسانیات اس امر میں متفق ہیں کہ زبانیں دائمی طور پر تغیر آشنا رہتی ہیں۔ اس تغیر کا رخ کبھی ارتقا کی طرف ہوتا ہے تو کبھی زوال وانحطاط کی طرف۔ زوال کی انتہا یہ ہے کہ زبانیں معدوم ہو جاتی ہیں اور کوئی اُن کا نام لینے والا بھی نہیں ہوتا۔ اس تغیر کی رفتار اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ عام طور پر محسوس نہیں ہونے پاتی یہاں تک کہ کسی خاص زمانی وقفے کے بعد ماہرین اعلان کرتے ہیں کہ زبان میں تغیر واقع ہو چکا ہے۔ بعض اوقات بڑے تخلیق کاروں کے کارنامے زبان کے ارتقائی سفر کی رفتار کو تیز کر دیتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ زبان ایک ارتقائی جست بھرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

راقم السطور کے اپنے مشاہدے کی بات ہے کہ آج سے چالیس پچاس سال پہلے، ہمارے ہاں تحریر و تقریر میں آنے والے کئی الفاظ کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ زبانوں کے انحطاط اور تغیر کے اس زمانے میں، اِن میں سے بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو شاذ ہی برتے جاتے ہوں۔ تغیر کی اگر یہی رفتار رہی تو آنے والے وقتوں میں یہ الفاظ غیر مانوس ہو جائیں گے اور اِن کے استعمال کو یقیناً ناپختہ اظہار سے تعبیر کیا جائے گا۔

لُغت پر غور کرنا راقم کے ذوق اور مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ ''نون'' پر مکمل ہونے والے الفاظ سے راقم کو یک گونہ دل چسپی اور رغبت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حُسن شناسی کی حِس موزوں، خوب اور مناسب الفاظ کی تلاش میں رہتی ہے۔ دوسری اور بڑی وجہ ''نون'' پر مکمل ہونے والے الفاظ کے مادوں اور اشتقاقات میں اترنے اور اُن پر غور کرنے کی راقم السّطور کو عادت اور دل چسپی ہے۔ بہت کم

لوگ، اُردو میں مستعمل ''نون'' پر ختم ہونے والے عربی الاصل الفاظ مثلاً عثمان، نعمان، عرفان، فُرقان، قربان، لقمان، کتمان، عمران، ریحان، وجدان وغیرہ کے مادے پر غور کرتے ہیں۔ عام لوگ اس پہلو پر جستجو نہیں کرتے اور اُنھیں بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے الفاظ سمجھ کر توجہ نہیں دیتے۔

راقم کے غور وخوض کا ماحصل یہ بھی ہے کہ ہندی الاصل مصادر سے مُشتق 'نون' پر ختم ہونے والے الفاظ بھی حُسنِ صورت اور معنیٰ میں یکتا ہیں۔ ان الفاظ کی اپنی اہمیت، دلکشی اور خوبی ہے جیسے دھڑکنا سے دھڑکن، چلنا سے چلن، جلنا سے جلن، اُلجھنا سے اُلجھن، سُلجھنا سے سُلجھن، لگنا سے لگن اور تھکنا سے تھکن وغیرہ۔ ان موزوں اور خوب الفاظ کی بازیافت اور اِن کے استعمال کی جہتوں کی طرف راقم نے دل چسپی لی اور مضمون زیرِ نظر لکھنے کا ارادہ کیا۔[ا]

ہندی الاصل مصادر سے اسمِ صفت، اسمِ کیفیت اور حاصلِ مصدر بنانے کے کئی طریقے ہیں جیسے:

وٹ سے: بناوٹ، لگاوٹ، سجاوٹ، رکاوٹ۔

ہٹ سے: مسکراہٹ، گھبراہٹ۔

وا سے: بڑھاوا، بلاوا، دکھاوا۔

اؤ سے: بچاؤ، چھڑکاؤ، جھکاؤ، لگاؤ۔

پ سے: ملاپ۔

ن سے: الجھن، دھڑکن، جلَن۔

ی سے: چوری، ٹھگی۔

مضمون زیرِ نظر میں، ہندی الاصل مصادر سے تشکیل پانے والے ایسے الفاظ کا استعمال اور اُن کے معنوں کی جہتوں کو پیش کیا گیا ہے جن کے آخر میں ''نون'' آتا ہے۔ ان الفاظ میں سے معنوی اعتبار سے کچھ اسمِ صفت ہیں، کچھ حاصل مصدر اور بعض اسمِ کیفیت۔ اِن الفاظ کا استعمال بھی، غیر محسوس طریقے سے، روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے بلکہ کچھ کا استعمال تو متروک ہو بھی چکا ہے۔ یہ الفاظ لُغتوں اور فرہنگوں میں تو موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر آج کل تخلیق کیے جانے والے ادب کا حِصّہ نہیں بن رہے ہیں۔

آیئے! ایسے الفاظ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اُن کا معنوی جائزہ بھی لیتے ہیں:

اُبٹن: (بُٹنا گھولنا سے) یہ ایک خوشبودار مسالہ ہے جس سے بدن کا میل اُترتا، رنگ نِکھرتا اور بدن خوشبودار رہتا ہے۔

اُپچن: (اُپچنا مصدر سے) بمعنی اُگنے، پُھوٹنے اور نشو ونما پانے کا عمل۔

اُترن: (اُتارنا اور اُترنا مصدر سے) بمعنی اُتارا ہوا کپڑا جس کا استعمال ترک کر دیا جائے۔ پھٹا پرانا مستعمل لباس جو غریبوں اور ناداروں کو بخش دیا جائے۔

اٹکن: (اٹکنا مصدر سے) بمعنی رکاوٹ، مشکل، جھنجھٹ۔

اُٹھان: (اٹھنا مصدر سے) بمعنی خیز یدگی، حَشر، رفع، آغاز، نقطۂ عروج، شباب، بلندی۔

اٹیرن: (اٹیرنا مصدر سے) بمعنی چرخی جس پر سُوت لپیٹا جائے۔ اَٹّی بنانے کا آلہ، دھاگے کی اَٹّی، سُوت کا لچھّا۔

اُچاٹن: (اُچاٹنا مصدر سے) بمعنی بیزاری، اُداسی، دل برداشتگی۔

اَدھن: (ادھن ہونا سے) بمعنی وہ پانی جو کھانا، چاول، دال وغیرہ پکانے کے لیے جوش کیا جاتا ہے......گرم پانی۔

اُڑان: اُڑنا مصدر سے یہ اسمِ کیفیت ہے۔ اُڑان بولنے میں مونث ہے، اس کا معنی ہے پرواز اور اڑنے کی کیفیت، جیسے کہا جاتا ہے: ''میر صاحب کے یہاں بڑی اُڑان کے کبوتر ہیں۔''

شکیل اعظمی کہتے ہیں:

پروں کو کھول زمانہ اُڑان دیکھتا ہے
زمیں پہ بیٹھ کے کیا آسمان دیکھتا ہے

اُڑچَن: ہندی الاصل مصدر اُڑچنا سے حاصل مصدر ہے۔ یہ مونث ہے اور اس کے معانی ہیں رکاوٹ، دِقّت، پیچیدگی، مُزاحمت اور تردّد۔

اُڑَن: اُڑنا سے حاصلِ مصدر ہے بمعنی پرواز۔ یہ مذکر لفظ ہے اور کنایۃً پریوں کی سواری کے تخت کو کہتے ہیں۔ اس کی دیگر مثالیں:

اُڑن طشتری اور اُڑن کھٹولا ہیں، شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

کاندھا اُسے دیں گی آ کے پریاں
تابوت مرا اُڑن کھٹولا ہو گا [۲]

اُگن: (اُگنا مصدر سے) بمعنی بالیدگی، روئیدگی، نمو، بڑھنے پُھولنے کی قوت۔

اُلجھن: یہ اُلجھنا مصدر سے اسم صفت ہے۔ اس کے مختلف معنوں میں سے خلش، بے چینی، تشویش، گھبراہٹ وغیرہ ہیں:

اُلجھن تمام عمر یہ تارِ نفس میں تھی
دل کی مراد عاشقی میں یا ہَوَس میں تھی (نامعلوم)

....

اپنی اُلجھن کو بڑھانے کی ضرورت کیا ہے
چھوڑنا ہے تو بہانے کی ضرورت کیا ہے
لگ چکی آگ تو لازم ہے دھواں اُٹھے گا
درد کو دل میں چھپانے کی ضرورت کیا ہے (ندیم گلانی)

اُلجھنا مصدر سے حاصل مصدر الجھاؤ ہے جس کے معانی ہیں گُتھی، بکھیڑا، جھگڑا، مُشکل اور دِقّت وغیرہ۔

بٹورن: (بٹورنا مصدر سے) بمعنی جمع کی ہوئی چیز، سمیٹی ہوئی چیز، کپید گی۔ اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے دَھن بٹورن یعنی دولت بٹورنے والا۔

بجان: (بجانا مصدر سے) مِز مار (جمع مزامیر) یعنی آلاتِ موسیقی سے ساز اور آواز پیدا کرنے کا عمل۔

بجُھان: (بجُھنا مصدر سے) بمعنی اِنطِفاء، افسردگی، رنجیدگی، غمگینی، اُداسی، مایوسی وغیرہ۔

برتن: یہ برتنا مصدر سے حاصل مصدر ہے جس کا معنی ہے وہ ظرف جو استعمال میں ہو یعنی بھانڈا:

اُجلا ترا برتن ہے اور صاف ترا پانی
اک عمر کا پیاسا ہوں مجھ کو بھی پلا پانی (احمد مشتاق)

....

برتن برتن چیخ رہی تھی کون سمجھتا اس کی بات
دل کا برتن خالی تھا اُس برتن بیچنے والی کا (ممتاز گورمانی)

برتن سے مختلف کہاوتیں بھی اردو ادب میں مستعمل ہیں جیسے ''بڑے برتن کی کُھرچن بھی بہت ہے''............''برتن سے برتن کھنک ہی جاتا ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ گھر والوں میں کسی نہ کسی بات پر تکرار ہو ہی جاتی ہے۔ برتن سے محاورہ بھی ہے ''برتن کھنکنا'' مٹی کے ظرف کا وہ آواز دینا جس سے اس کا ٹوٹا ہونا معلوم ہو:

تمیز کیوں نہ فغاں سے دل شگفتہ ہو
جو برتنوں میں ہو ٹوٹا ہوا کھنکتا ہے [۳]

بِرہَن: بِرہا یعنی جدائی، ہجر اور فراق کی ستائی ہوئی۔ روگن اور مہجور عورت۔

منتظر ہے کسی مخصوص سی آہٹ کے لیے

زندگی بیٹھی ہے دہلیز پہ برہن کی طرح (مرتضیٰ برلاس)

بَسَن: بسنا مصدر سے یہ حاصلِ مصدر ہے جس کے مختلف معانی ہیں جیسے رہائش، مکان، گھر، رہنا سہنا، دولت، پوشاک، پہناوا وغیرہ:

ہوئی ہے جان مجھے زندگی مرن تجھ بن

کفن ہوئی ہیں بدن کے اوپر بسن تجھ بن (آبرو شاہ مبارک)

بکھرن: (بکھرنا مصدر سے) بمعنی انتشار، پریشانی اور پراگندگی۔

بندھن: بندھن مذکر ہے اور بندھنا مصدر سے مشتق۔ اس کے مختلف معانی ہیں جیسے بستگی، ربط، بندش، روک، لگاؤ، لاگ، شادی، دستور العمل، اِنضباطِ اوقات وغیرہ:

پیار کے بندھن خون کے رشتے ٹوٹ گئے خوابوں کی طرح

جاگتی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کیا کیا کاروبار ہوئے (بشر نواز)

....

امیرؔ اُڑ گئی گھاس مٹی ہے والا

ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا [۴]

اس سے مراد وہ رسی یا فیتا بھی ہے جس سے کوئی چیز بندھی ہو:

چُھوٹ کے تجھ سے تیرے کاہیدے پریشانی میں ہیں

ہجر نے بندھن چھڑایا دستۂ جاروب سے [۵]

بھرن: (بھرنا مصدر سے) بمعنی آمودگی، تکملہ، تتمہّ، پریدگی، معمور، ضمیمہ وغیرہ۔

بَھرَن: (بَھرَن پڑنا یعنی زور کی بارش ہونا سے) جل تھل، زور کی بارش وغیرہ۔

بھیجن: (بھیجنا مصدر سے) بمعنی فرستادگی، تنزیل وغیرہ۔

بیلن: (بیلنا مصدر سے) ۱۔ کپاس سے بنولے نکالنے کی مشین ۔۲۔ گنے کا رس نکالنے کی مشین۔ ۳۔ لکڑی کا وہ مدوّر اوزار جس پر آٹے کا پیڑا رکھ کر روٹی بنائی جاتی ہے۔

پِٹن: (پِٹنا مصدر سے یعنی مار کھانا۔ چوٹ کھانا) ماتم، کہرام، رونا پیٹنا، مار کٹائی وغیرہ۔

پٹکن: (پٹکنا مصدر سے) بے چینی، بے کلی، دھکاّ، گرنا وغیرہ۔

پچن: (پچنا مصدر سے) ہضم، اِنہضام، گواریدگی، تحلیل، برداشت وغیرہ۔

پکپن: (پکانا مصدر سے) پُختگی، دانائی، عقلمندی۔

پُونچھن: یہ پونچھنا مصدر کا حاصلِ مصدر ہے۔ جو چیز دیگ، دیگچے یا کھانے کے برتن کو پُونچھنے سے نکلے، کُھرچن ......مجازاً بچا کُھچا کھانا۔ کہا جاتا ہے ''دیگچی سے سالن نکال کر خود کھالیا پونچھن مجھے دے دی۔'' وہ کپڑا جس سے کھانے کے برتن پونچھے جائیں، اسے جھاڑن اور صافی بھی کہتے ہیں۔ وہ کپڑا جس سے نجاست پاک کر کے پھینک دیں۔ سب سے آخر میں پیدا ہونے والے بچے کو بھی پُونچھن کہتے ہیں:

هم اِسی سے پُونچھتے ہیں دُردِ مَے
صافیِ مَے اب تو پُونچھن ہو گئی [٦]

پھَبَن: (بروزن چَمن) یہ پھبنا مصدر سے حاصلِ مصدر ہے۔ یہ مؤنث لفظ ہے جس کے معنی زیبائش، آرائش، سجاوٹ، تناسب، موزونی، چھب اور ادا کے ہیں:

بال سیدھے بھی ترے قہر ہیں پیارے لیکن
مار ڈالے ہے پھبن مجھ کو شِکن والوں کی [٧]

....

صفحۂ رخ پہ ترے خوبیِ خط کی ہے پھبن
ہے سُویدا دلِ عاشق کا ترا خالِ ذقن [٨]

....

پریّم دیکھو تو سہی زخموں کے زیور کی پھبن
شاعری بن کے دلہن اور بھی شرمائے ہے (پریم وار برٹنی)

پھٹکن: (پھٹکنا مصدر سے) اناج کا کوڑا کرکٹ جو پھٹکنے سے نکلتا ہے۔

پھَٹَن: (پھٹنا مصدر سے) بمعنی شگافیدگی، چاک، تڑخ۔

پھِرَن: (پھرنا مصدر سے) بمعنی گشت اور سیر۔

پَھڑکن: یہ پھڑکنا مصدر سے حاصلِ مصدر ہے جس کے مختلف معنی بے قراری، اضطراب، بے چینی، تڑپ، حرکت اور تپش ہیں۔ پھڑکنا سے پھڑک بھی مستعمل ہے جس کے معنی پھڑ پھڑاہٹ، نتھنوں کی حرکت اور تپک ہیں۔ پھڑکن اور پھڑک کے معنوں میں پھڑکنت بھی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ ''پھڑکن کی اولاد'' کا مطلب ہے نہایت تمنّا اور آرزو کی اولاد، ناک رگڑے کی اولاد، ناز پروردہ اور لاڈلی اولاد (آصفیہ)۔ ایک کہاوت ہے ''پھنس گئی تو پھڑکن کیسی۔''

سعادت حسن منٹو کے افسانے ''دھواں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''اچھا''...... مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی ''کیسے پھڑکتا تھا؟''، ''یوں یوں'' مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔''

پھِسلن: (پھسلنا سے حاصلِ مصدر) چکنی جگہ جہاں سے پاؤں پھسل جائے۔ لغزش، وعدے سے پھرنا، فریفتگی وغیرہ۔ اسی سے پھسلاہٹ اور پھسلاٹ ہے:

آ گئی ابر میں پانی سے غضب کی پھسلن
برق کا پاؤں ہر ایک مرتبہ جاتا ہے پھسل[۹]

....

پھسلن یہ کناروں پہ یہ ٹھہراؤ ندی کا
سب صاف اشارہ ہیں کہ گہرائی بہت ہے (اکھلیش تیواری)

پُھوٹن: (پُھوٹ پڑ جانا سے) نا اتفاقی، ناراضی، اعضاء شکنی، دشمنی اور اَن بَن۔

پھیرن: یہ پھرنا مصدر سے ہے جس کا معنی ہے گُھمانا، چکر دینا، پِھرانا اور گشت کرنا۔ پھیرن عورتوں کے لباس لہنگے کو کہتے ہیں جو چکر اور گُھوم کے مماثل ہوتا ہے۔

پَھیلان: (پھیلانا سے) وُسعت، پھیلاؤ، کشادگی، وازیدگی، نشر اور فراخی۔

پھینکن: (پھینکنا سے) یہ پھینکنا مصدر کا اسم کیفیت ہے۔

پِیٹن: پیٹنا سے اسمِ کیفیت جیسے تالی پیٹن یعنی اظہارِ مسرت۔

تپکن: یہ تپکنا مصدر سے حاصلِ مصدر ہے۔ تپکنا کا معنی ہے پھوڑے میں درد اور ٹیس پڑنا جب کہ تپکن کا مطلب ہے ٹیس، جلن اور تپک۔

تَپَن: تپنا مصدر سے یہ حاصلِ مصدر ہے۔ تپنا کا معنی گرم ہونا، جلنا اور بھبھکنا ہے جبکہ تَپَن گرمی، سوزش، جلن اور سینک کو کہتے ہیں۔

ترُپّن: (ترُپنا مصدر سے) تُرپائی۔ بخیے کے اوپر کی سِیون۔

ترَشَن: ترشنا مصدر (بمعنی چاقو یا چُھری سے کٹنا) سے حاصل مصدر ہے۔ ترشن کا معنی ہے تراشہ، چھیلن وغیرہ۔

ترَپن: (تڑپنا سے) بے چینی، اضطراب، تلملاہٹ، بے قراری اور تر پڑاہٹ۔

تڑقن: (تڑقنا مصدر سے) پانی خشک ہو جانے کے بعد چکنی مٹی کی زمین پر درزیں بن جانا۔

تلَن: یہ تلنا سے اسمِ کیفیت ہے۔

تھکن: یہ تھکنا سے حاصلِ مصدر ہے۔اس کے معنی تھکاوٹ، تکان، ماندگی، کوفت، ناطاقتی، خستگی، بے ہمتی، مایوسی وغیرہ ہیں:

کتنے بھی گھنیرے ہوں تری زلف کے سائے
اک رات میں صدیوں کی تھکن کم نہیں ہوتی[۱۰]

....

دن بھی ہے گرم دھوپ بھی ہے کڑی
راہ چلنے کی بھی تھکن ہے بڑی [۱۱]

....

نہ انتظار کی لذّت نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا بدن (احمد فراز)

....

ٹپکن: (ٹپکنا مصدر سے) تقطیر، ریزش، بوند اور قطرہ۔

ٹَسَن: (ٹسنا مصدر سے) بمعنی زور یا دباؤ سے کپڑے کا پھٹ جانا، چاک، تڑخ، دراڑ، شگاف، بگاڑ وغیرہ۔

ٹِکان: (ٹِکا رہنا سے) اِستادگی، نصب، قیام، ٹھہراؤ اور قرار۔

ٹُوٹن: (ٹوٹنا مصدر سے) شکستگی، کسر، کسی چیز کا ٹوٹا ہوا حصہ، چُورا، ٹکڑے اور میل جول کی بندش۔

ٹیکن: (ٹیکنا مصدر سے) ٹیک، سہارا وغیرہ۔

جاگرن: (جاگنا مصدر سے) بیداری، صحو اور ہوشیاری۔

جُڑَن: (جُڑنا مصدر سے) ملاپ، وصل، مِلن، چسپاں وغیرہ۔

جلن: (جلنا مصدر سے) یعنی تپک، سوزش، گرمی، حِدّت، غُصّہ، طیش، رنج، حسد، کینہ اور دشمنی وغیرہ:

سلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رتجگوں کی جلن (احمد فراز)

....

ٹوٹے ہوئے خوابوں کی چبھن کم نہیں ہوتی
اب رو کے بھی آنکھوں کی جلن کم نہیں ہوتی[۱۲]

....

اس لیے تو سینے کی جلن نہیں جاتی
بے قدروں کو جو دل میں بسا رکھا ہے (نامعلوم)

جھاڑن: (جھاڑنا سے) بمعنی جھاڑنے کا کپڑا، وہ چیز جو جھاڑنے سے نکلے یعنی کوڑا کرکٹ۔

جَھڑَن: (جھڑنا مصدر سے) جھڑنے کے بعد جو کچھ حاصل ہو، کُھرچن، تلچھٹ، نفع اور سُود۔

جُھکان: (جھکنا سے) بمعنی رجحان، میلان، خمیدگی اور جھکاؤ۔

جُھکن: (جھکنا سے) بمعنی رکوع، انکسار اور عاجزی۔

جِیوَن: (جینا مصدر سے) زندگی۔

ہم نے کتنے دھوکے میں سب جیون کی بربادی کی
گال پہ اک تِل دیکھ کے اِن کے سارے جسم سے شادی کی (سیّد ضمیر جعفری)

....

جیون مجھ سے میں جیون سے شرماتا ہوں
مجھ سے آگے جانے والو میں آتا ہوں (حبیب جالب)

چُبھن: یہ چُبھنا سے حاصل مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی نوک دار شے کے چُبھنے سے ہونے والا درد، خلش، کھٹک اور تپک وغیرہ:

سب گوارا ہے تھکن ساری دُکھن ساری چُبھن
ایک خوشبو کے لیے ہے یہ سفر جیسا بھی ہے (انور مسعود)

....

کانٹوں کی گفتگو سے خلش دل میں کم نہ تھی
پھولوں کے تذکرے سے چبھن اور بڑھ گئی (اعجاز رحمانی)

چکھن: (چکھنا مصدر سے) ذوق، لُطف، حظ وغیرہ۔

چَلَن: بروزن وَطَن (چلنا مصدر سے) بمعنی چال چلن، سیرت و کردار، رفتار، چال، وضع اور روش:

منہدی سے ہے شعلہ قدم اُس رشکِ پری کا
پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا [۱۳]

بمعنی روش، رویّہ، طور، طریقہ اور ڈھنگ:

تعلق رُوح سے مجھ کو جسد کا ناگوار ہے
زمانے میں چَلَن ہے جاروں کی آشنائی کا [۱۴]

بمعنی رِیت، رسم ورواج اور دستور:

سکۂ داغِ جگر اک دن مرے کام آئیں گے
عشق کے بازار میں اُن کا چلن ہو جائے گا [۱۵]

بمعنی عادت، سُبھاؤ اور برتاؤ:

ساقی وہ پلا ئے کہ دو عالم ہوں فراموش
ہو جائے خدائی سے نرالا چلن اپنا [۱۶]

چَلَن چلنا......یعنی رفتار اختیار کرنا:

پیشتر حشر سے ہوتی ہے قیامت برپا
جو چَلَن چلتے ہیں خوش قد یہ چَلَن ہے کس کا [۱۷]

چَلَن بگڑنا......یعنی رفتار ناموزوں ہونا، سلامت روی میں فرق آنا:

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور اِنساں کی چال اُس کا چَلَن بگڑا [۱۸]

جدید شعراء کے کلام سے چلن کے استعمال کی کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

کی محبت تو سیاست کا چَلَن چھوڑ دیا
ہم اگر عشق نہ کرتے تو حکومت کرتے (نامعلوم)

....

چال اور ہے دنیا کی ہمارا ہے چَلَن اور
وہ ساخت ہے کچھ اور یہ بے ساختہ پن اور (ناطق گلاوٹھی)

چھان: (چھاننا مصدر سے) بمعنی اِنتقاد، دریافت اور تحقیق۔

چھاجن: (چھاجنا مصدر بمعنی چھپر باندھنا، چھپر ڈالنا سے) چَھپر، پھُوس کا سائبان، پھُوس کی چھت وغیرہ۔

چھُپن: (چھپنا مصدر سے) بمعنی پوشیدگی، اخفاء اور فرار۔

چِھلَن: (چِھلنا مصدر سے) بمعنی خراش، ستردگی اور رگڑ وغیرہ۔

چھُوَن: (چھُونا مصدر سے) بمعنی مس، ہاتھ لگنا......جسم کا جسم سے لگنا۔

چھیدن: (چھیدنا سے) بمعنی سوراخ، چھید اور طعن وطنز۔

چھیلن: (چھیلنا مصدر سے) بمعنی تراشہ، چِھلکا جو چھیلنے سے نکلے۔

دُکھن: (دُکھنا مصدر سے) بمعنی تکلیف، درد اور تھکاوٹ:

دل نے جو عمر بھر کمائی ہے
وہ دُکھن دل سے جائے گی کب تک (جون ایلیا)

کبھی احباب کے پھٹتے ہوئے جوتوں کی دکھن
کبھی دنیا کے چٹختے ہوئے اعضا کی پُکار (فرحت اِحساس)

تمام شب کی دُکھن، بے کلی، سبک خوابی
نمودِ صبح کو درماں سمجھ کے کاٹی ہے (محمود ایاز)

دل کو مژدہ ہو کہ وہ بھی خیر سے جاتی رہی
آہ سے پہلے جو کچھ محسوس ہوتی تھی دُکھن (سلیم احمد)

ابنِ انشاء نے دُکھن کو اپنے مشہور گیت میں اس طرح استعمال کیا ہے:

جوگی کا بنا کر بھیس پھرے — برہن ہے کوئی، جو دیس پھرے
سینے میں لیے سینے کی دُکھن — آتی ہے پوَن، جاتی ہے پوَن

دھارن: (دھارنا مصدر سے) پکڑ، برداشت، قبضہ، حصول، ذمہ، بچاؤ، پہناوا، سوچ وغیرہ۔

دھرن: (دَھرنا مصدر حاصل مصدر) دَھرنا کا معنی ہے رکھنا، جمانا، ٹِکانا، سپرد کرنا وغیرہ۔ اِسی سے دَھرن کا معنی ہے زمین، بچّہ دان، رِحم، ناف وغیرہ۔

دھڑکن: (دھڑکنا مصدر سے) بمعنی تڑپ، اِختلاجِ قلب، ہَولِ دل، بے چینی، بے قراری، خوف، اضطراب، دَھک دَھک وغیرہ:

اُن کو بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا
دل کی دھڑکن مگر نہیں جاتی (نامعلوم)

دل کی دھڑکن کے پیامات سے ڈر جاتے ہیں
عمر ایسی ہے ہر بات سے ڈر جاتے ہیں
خشک پتّو نہ گرو ٹھہرے رہو شاخوں پر
وہ اندھیروں کی ملاقات سے ڈر جاتے ہیں (صابر دت)

دھنسن : (دھنسنا مصدر سے) بمعنی گُھس جانا۔

دھووَن: (دھونا سے) بمعنی روشنائی کی دھوون، شوریدگیِ روشنائی، وہ پانی جس میں کوئی چیز دھوئی گئی ہو۔

ڈُوبن: (ڈوبنا سے) بمعنی غرقابی، پوشدگی، نقصان، تباہی، بربادی وغیرہ۔

ڈولن: (ڈولنا مصدر سے) ڈولنا کا معنی ہے ہلنا، چلنا پھرنا، ٹہلنا وغیرہ۔ اِس مصدر سے متشکل ڈولن کا معنی ہے ڈولنے والی کوئی چیز، ڈولا اور گھوارہ۔

ڈھان: (ڈھانا سے) بمعنی اِنہدام، پامالیدگی، بربادی وغیرہ۔

ڈھکن : (ڈھانکنا مصدر سے) بمعنی سرپوش، برتن کو ڈھانکنے والا طشت، ڈھکنا وغیرہ۔

رَڑکن: (رَڑکنا مصدر سے) رَڑکنا کا معنی ہے چُبھنا خلش ہونا اور درد ہونا۔ حاصلِ مصدر رَڑکن کا مطلب ہے چُبھن، خلش اور درد۔

معروف شاعر اُستاد دامنؔ کہتے ہیں:

جھڑے تیر تُوں مارے نیں وچ سینے
جے کر کڈھن نئیں دیندا، رَڑکن تے دے

رولن: (رولنا مصدر سے) رولنا کا معنی ہے چُننا، ہاتھ سے موٹا جدا کر لینا، چھاج سے پھٹکنا وغیرہ۔ رولن کا معنی ہے وہ چیز جو رولنے کے بعد رہ جائے یعنی پھٹکن

رہن: (رہنا مصدر سے) جیسے رہن سہن۔

سِڑن: (سڑنا سے) بمعنی بوسیدگی، سڑاند اور بدبو۔

سجن : (سجنا مصدر سے) بنا ٹھنا، آراستہ، بانکا اور چھیل چھبیلا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لیکن کنایۃً محبوب، دوست، رفیق اور پیارے کے لیے بولا جاتا ہے۔

سجن ٹک نازسوں مجھ پاس آ آہستہ آہستہ
چھپی باتیں اپس دل کی سنا آہستہ آہستہ (ولی دکنی)

....

شبِ سیاہ ہوا روز اے سجن تجھ بن
مثالِ شمع جلے اہلِ انجمن تجھ بن (آبروشاہ مبارک)

سُلجھن : (سلجھنا مصدر سے) اُلجھن اور پیچیدگی کا نقیض، کسی معاملے کو سلجھانے کا جذبہ، تجربہ، رویّہ

اور مزاج۔ عقدہ کشائی، اور اِنکشافِ معاملات:

یہ الجھن یہ سُلجھن کا ہے جو تماشا
اسے نسلِ انسانی سے آزادی دے دے (نامعلوم)

سُوجن: سُوجنا مصدر سے حاصل مصدر ہے جس کا معنی ہے ورم، آماس وغیرہ۔
سیکھن: (سیکھنا سے) بمعنی تحصیل، تجربہ، پڑھائی وغیرہ۔
سِیوَن: (سینا مصدر سے) سلائی، ٹانکا، بخیہ وغیرہ۔
کارن: (کرنا مصدر سے) بمعنی سبب، واسطہ، باعث، لیے اور خاطر:

دیکھ ہماری دید کے کارن کیسا قابلِ دید ہوا
ایک ستارہ بیٹھے بیٹھے تابش میں خورشید ہوا (ابنِ انشاء)

....

گو مجھے تانسیگی باجی تیرے کارن اے ددا
میں نہیں کرنے کی تجھ کو شور، مت ٹسوے بہا [۱۹]

ایک دوہے کا بول ہے:

نین بھئے دھوندلے، نیر رہو بھرپور
انجن کارن بھیجیو تنک چرن کی دھور [۲۰]

کترن: (کترنا مصدر سے) بمعنی کتری ہوئی دھجی، ریزہ، ٹکڑا، چھانٹن وغیرہ۔
کٹن: (کٹنا مصدر سے) مار پیٹ، سزا، تراش، زخم وغیرہ۔
کُوٹن: (کُوٹنا مصدر سے) بمعنی کوفتگی، مار پیٹ اور زدوکوب۔
کہن: (کہنا مصدر سے) کہنے کا ڈھنگ، طرزِ گفتار، کہاوت، قول، بچن، بات اور مقولہ۔
کھان: (کھانا مصدر سے) بمعنی خورش، اَکل، کھانا، طعام وغیرہ۔
کُھرچن: (کھرچنا مصدر سے) بمعنی پکتے میں جو طعام سُرخ و بریاں ہو کر ہنڈیا کے پیندے میں جم جاتا ہے۔ پکی ہوئی ہنڈیا اور دیگ کے پیندے میں چپکا ہوا کھانا، تہِ دیگ۔ پنجابی میں اِسے گھروڑی کہتے ہیں۔ پیٹ کی پونچھن یعنی مذاقاً سب سے اخیر بچے کو کہا جاتا ہے۔ کہاوت ہے "بڑے برتن کا کھرچن بھی بہت ہے" اور "جتنی دیگ اتنی کھرچن۔" ضرب المثل ہے "کُھرچن متھرا

کی اور سب نقل'، یعنی متھرا کی مٹھائی بہت مشہور ہے۔

کھڑن: (کھڑا ہونا سے) بمعنی اِستادگی، رکود، قیام، اُٹھان، ٹھہراؤ، مَقَرّ اور اِستادگاہ۔

کِھلَن: (کِھلنا مصدر سے) بمعنی تزہیر، پھول کا کِھلنا، کلی کا پُھوٹنا، شگفتگی، نکھار، سجاوٹ وغیرہ۔

کُھلَن: (کُھلنا مصدر سے) بمعنی انکشاف، افشا، جہر، کُشاد، پھَبَن وغیرہ۔

کھودن: (کھودنا مصدر سے) بمعنی کاویدگی، تفحص، کُرید، نقاشی، جستجو، دریافت، سُراغ اور تلاش۔

کھولن: (کھولنا مصدر سے) بمعنی کشادگی، عُریانی، آزادی، اِفشا وغیرہ۔

کھیلن: (کھیلنا مصدر سے) بمعنی کھیلنے کے واسطے جیسے یہ گیت کا بول ہے ''انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند۔''

بابا گورونانک جی نے کہا تھا:

جو تُو پریم کھیلن کا چاؤ　　سر دھر تلی، گلی میری آؤ

اِت مارگ پَیر دھریجے　　سر دیجیے کان نہ کیجیے

(ترجمہ: اگر تمھیں محبت کا کھیل کھیلنے کا شوق ہے تو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر ہماری گلی میں آؤ اس طرف قدم رکھنا تو سر دینے سے مت ڈرنا)

گِرن: (گرنا مصدر سے) بمعنی فتادگی، ہبوط، سقوط، گراوٹ، اِضمحلال، تباہی اور بربادی۔

گُزران: (گزارہ کرنا سے) بمعنی معاش، گزارہ، بسراوقات، گزربسر وغیرہ۔

گوندھن: (گوندھنا مصدر سے) بمعنی بافتگیِ مُو، بال گوندھنے کا عمل اور سر کے بالوں کی چوٹی۔

گَھٹن: (گھٹنا مصدر سے) بمعنی کمی، تخفیف، قلت اور موت۔ اس کی جمع گھٹنائیں ہے جس کا مطلب ناگہانی اموات (Causalities) ہے۔

گُھٹن: (گُھٹن ہونا سے) بمعنی گرمی جو ہوا بند ہونے کی وجہ سے ہو، حبس، اِنقباض، تنگیِ نفس وغیرہ۔

گَھٹن: (سنسکرت لفظ ہے اور مذکر) بمعنی کوشش، تکمیل، ملاپ، ترکیب وغیرہ۔

گِھسن: (گِھسنا مصدر سے) بمعنی رگڑ، مَلنا، اُجالنا، صیقل کرنا، سائیدگی اور زدودگی۔

گھسیٹن: (گھسیٹنا مصدر سے) بمعنی وہ نشان جو کسی چیز کے زمین پر گھسیٹنے سے پڑ جائے۔

گُھلَن: (گُھلنا مصدر سے) بمعنی تحلیل، مُلائمت، نرمی، پگھلاہٹ وغیرہ۔

گھونٹن: (گھونٹنا مصدر سے) جیسے گلا گھونٹن، خنق وغیرہ۔

لپیٹن: (لپیٹنا مصدر سے)   بمعنی لپیٹنے کا کپڑا، چرخ اور بیلن وغیرہ۔

لٹکن: (لٹکنا مصدر سے)   بمعنی آویختگی، ناک کا زیور جو لٹک رہا ہو، جُھمکا، آویزے، گھنٹے کا پنڈولیم، جُھولن، شاقول، جھالر، فانوس، جُھولا، کوئی چیز جو لٹک رہی ہو، ایک پرندہ جو پنجوں کے بل اُلٹا لٹکتا ہے۔

لگن: (لگنا مصدر سے)   بمعنی نسبت، لگاؤ، تعلق، وابستگی......دُھن، لو، خیال، دھیان:

بھوکے غریب دل کی خدا سی لگن نہ ہو
سچ ہے کہا کسی نے کہ بھوکے بھجن نہ ہو [۲۱]

اے شمع! تری آگ میں جل جل کے پتنگے
مرتے ہیں مگر دل کی لگن کم نہیں ہوتی [۲۲]

بمعنی شوق، اشتیاق، اُمنگ، آرزو، تمنّا، خواہش، ولولہ اور جوش وخروش:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اِک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوئی بستی جگا دی (مولانا الطاف حسین حالؔی)

بمعنی پریت، محبت، عشق، اُنس، پیار، اُلفت، حُب، دوستی اور میلانِ خاطر:

آہ ہوتی ہے لگن آخر وبالِ سر یہاں
عشق پروانہ سے سیکھے شمع بھی سر بیچنا [۲۳]

لگن لگانا: (فعل متعدی) بمعنی عشق کرنا، لَو لگانا اور محبت کرنا:

پروا نہیں پروانہ کے جلنے کی تجھے آہ
اے شمع کوئی خاک لگن تجھ سے لگاوے [۲۴]

لگن لگنا: (فعل لازم) بمعنی تعشق ہونا، محبت ہونا، پریت ہونا، دل لگنا:

لگ گئی جس کی لگن کیا وہ پھر افسوس جیے
شمع جلتی ہے سراپا درِ فانوس لیے [۲۵]

لنگھن : (لنگھنا مصدر سے) کُود، پھاند، چھلانگ، پھلانگ وغیرہ۔

لیپن : (لیپنا مصدر سے) بمعنی لپائی، لیپ، پلستر، سفیدی وغیرہ۔

مَرن : (مرنا مصدر سے) بمعنی مرگ، موت، قضا، اجل، مرنے کا وقت، مرجانا، جان دینا، مرگ گیت بمعنی مرثیہ:

وہ سنگِ راہِ وصل ہے یہ ننگِ رسمِ عشق

مرنا کٹھن ہوا مجھے جینا مرن ہوا [۲۶]

بمعنی مصیبت، آفت، تباہی:

پرِ پرواز جب تک تھے تمنّا تھی رہائی کی

مرن اب ہے اگر اس بے پر و بالی میں چھوٹے تو [۲۷]

مِلَن : (ملنا مصدر سے) بمعنی یافت، نَیل، ملاقات جیسے ایک کہاوت ہے "مِلَن ملے ہیرے کیسی دل میں پھانکیں کھیرے کیسی۔" ایک گیت کا ٹکڑا ہے "مورے سیّاں کا ملنوا کیسے ہو۔"

بمعنی راہ و رسم، میل جول وغیرہ:

جدا ہوئے تھے قریب آ کے ہم سدا کے لیے

مِلَن کی پیار بھری رات کا تھا پہر کوئی

میں تشنگی کو لیے ڈھونڈتا رہا پانی

اگرچہ پاس مرے بہہ رہی تھی نہر کوئی

(ڈاکٹر زاہد شیخ)

مَلَن : (مَلنا مصدر سے) بمعنی مالیدگی، مسح اور مالش۔

مُنڈن / مونڈن : (مُنڈنا اور مونڈنا مصدر سے) حجامت، سر کا منڈایا جانا، بچے کے بالوں کا پہلی دفعہ منڈایا جانا اور اس سلسلے کی رسم۔

نٹن : (نٹنا مصدر سے) نٹنا کا معنی ہے انکار کرنا، منظور نہ کرنا اور نٹوں کا پیشہ اختیار کرنا۔ اِس مصدر سے متشکل نٹن کا معنی ہے اِنکار، نامنظوری اور نٹ کی تانیث یعنی نٹنی۔

ہِلَن : (ہلنا مصدر سے) بمعنی حرکت، جنبش اور لرزش۔

حواشی اور حوالے

۱۔ راقم السّطور یہ مضمون لکھ چکا تھا اور مشینی کتابت بھی ہوگئی تھی۔ اِسی اثنا میں برادرِ محترم پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد نے اپنی مُرتّبہ کتاب ''اُردو حریفۂ میکالے'' مِن اَلفِ الحراث راقم کو عنایت فرمائی۔ یہ کتاب بلا شبہ لُغت کا ایک نادر خزانہ ہے۔ لُغت کی روایتی کتابوں سے الگ، اس کی نرالی شان ہے۔ اس قابلِ قدر کتاب کو ۲۰۲۰ء میں شائع کرنے کا شرف معروف اشاعتی ادارے، مثال پبلشرز فیصل آباد کو حاصل ہوا ہے۔ راقم کو اعتراف ہی نہیں بلکہ خوشی ہے کہ وہ اس کتاب سے بہرہ ور ہوا جس کے نتیجے میں اپنے مضمون کو نظرِ ثانی سے گزارا۔

۲۔ مسرورؔ بحوالہ نور اللغات، جلد۔۱، از مولوی نور الحسن نیّر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء) ص ۲۹۰

۳۔ شاد بحوالہ......ایضاً............ص ۵۷۸

۴۔ امیرؔ بحوالہ......ایضاً............ص ۶۵۴

۵۔ رشکؔ بحوالہ......ایضاً............ص ۶۵۴

۶۔ داغؔ بحوالہ......نور اللغات، جلد۔۲، ص ۸۲۶

۷۔ مُصحفیؔ بحوالہ......ایضاً......ص ۸۷۰

۸۔ نظیرؔ بحوالہ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۱، از سیّد احمد دہلوی، (لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء) ص ۵۴۵

۹۔ قدرؔ بحوالہ نور اللغات، جلد۔۲، ص ۸۸۰

۱۰۔ قیصر الجعفری، سنگِ آشنا، (دہلی۔ انڈیا: مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۷ء) ص ۴۷

۱۱۔ منیرؔ بحوالہ نور اللغات، جلد۔۲، ص ۱۰۱۴

۱۲۔ سنگِ آشنا، ص ۴۷

۱۳۔ ناسخؔ بحوالہ نور اللغات، جلد۔۲، ص ۱۱۶۷

۱۴۔ آتشؔ بحوالہ......ایضاً......ص ۱۱۶۷

۱۵۔ آتشؔ بحوالہ ......ایضاً......ص ۱۱۶۸

۱۶۔ نسیمؔ بحوالہ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۲، ص ۱۱۷

۱۷۔ آتشؔ بحوالہ نور اللغات، جلد۔۲، ص ۱۱۶۸

۱۸۔ آتشؔ بحوالہ......ایضاً ص۱۱۶۸

۱۹۔ رنگینؔ بحوالہ......فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۳، ص۴۲۰

۲۰۔ ......ایضاً......ص۴۲۰

۲۱۔ نظیرؔ بحوالہ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۴، ص۲۰۴

۲۲۔ سنگِ آشنا، ص۴۷

۲۳۔ ظفرؔ بحوالہ فرہنگِ آصفیہ، جلد۔۴، ص۲۰۴

۲۴۔ شاہ نصیرؔ بحوالہ......ایضاً......ص۲۰۴

۲۵۔ ......ایضاً......ص۲۰۴

۲۶۔ راسخؔ بحوالہ نوراللغات، جلد۔۴، ص۱۲۳۴

۲۷۔ شادؔ بحوالہ......ایضاً......ص۱۲۳۴

''کے حوالے سے'' کا غلط استعمال

ہمارے ہاں ریت بن چکی ہے کہ 'کے تعلق سے'...... 'کے بارے میں'...... 'کے ذیل میں'...... 'کے سلسلے میں'...... 'کے ضمن میں'...... 'کی بابت'...... 'کی بدولت'...... 'کی مناسبت سے'...... 'کی نسبت سے'...... 'کے لحاظ سے'...... 'کے اعتبار سے'...... 'کی رعایت سے'...... 'پر مشتمل' ...... 'کے لئے'...... 'کی بنا پر'...... 'کی وجہ سے'...... 'کے ذریعے'...... 'کے مطابق'...... 'کے طور پر'......اور 'کے معاملے میں' وغیرہ کی جگہوں پر بار باراور تواتر کے ساتھ ''کے حوالے سے'' لکھا اور بولا جاتا ہے جس کی کوئی معنوی مناسبت نہیں ہوتی نہ ہی سماعت کو کسی طور پر بھلا لگتا ہے۔ ''کے حوالے سے'' کا یہ استعمال اردو زبان میں ایک جدّت تو کہی جاسکتی ہے لیکن قواعد اور مفہوم کے مطابق حرفِ ربط (Preposition) کے طور پر اس کا ایسا استعمال درست نہیں۔ ایک نامی ادیب نے اپنی کتاب میں لکھا:

''لاہور کے حوالے سے اپنے بچپن کی ایک بات نہیں بھولتی۔''

اس جملے میں ''کے حوالے سے'' کا استعمال جو ربط پیدا کرنے کے لیے ہے، میرے نزدیک محلّ نظر ہے۔ یہاں ''لاہور کے تعلق سے'' یا ''لاہور کے بارے میں'' ہونا چاہیے تھا۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے، ماضی قریب کے ایک معروف میزبان، جو مشہور ادیب بھی ہیں، اپنے ٹی وی ناظرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

''میں اس مائیکروفون کے حوالے سے اپنے ناظرین کو بتانا چاہوں گا......''

ادیب میزبان کی زبانی ''کے حوالے سے'' کا استعمال سنا تو کانوں کو کچھ عجیب سا لگا کیونکہ یہاں ''کے حوالے سے'' کے بجائے ''کے ذریعے'' کا محل تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ہر دوسرے جملے میں ''کے حوالے سے'' کو استعمال کرنے کے عادی سے ہو گئے ہیں۔

برقی میڈیا پر، ہر دوسرے جملے میں، کے حوالے سے سنائی دیتا ہے جو ایک وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اخباری کالم نگار، مدیر اور ٹیلی وژن کے پڑھے لکھے میزبان اور اینکر پرسن بھی کے حوالے سے کے اس غلط استعمال کے بغیر دو جملے لکھنے اور بولنے سے قاصر محسوس ہوتے ہیں۔ ٹی وی چینلز پر ہونے والی گفتگو، اخبار اور رسالوں میں شائع ہونے والی تحریروں میں سے کچھ جملے مثال کے طور پر مِن وعَن نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ اس سطح پر گفتگو کرنے کے حوالے سے شہزادی کا غالباً پہلا ایکسپوژر (exposure) تھا۔

۲۔ آپریشن کے حوالے سے پولیس کے اختیارات کی بحالی کی مدت ختم ہو گئی۔

۳۔ سول ملٹری تعلقات کے حوالے سے دونوں کے ایک ہی صفحہ پر ہونے......۔

۴۔ فلاں ایئر لائن کے ملازمین نے نجکاری کے حوالے سے صدارتی آرڈی نینس واپس......۔

۵۔ دنیا میں تخلیق کے حوالے سے دو قوانین موجود ہیں۔

اِن جملوں میں 'کے حوالے سے' کا مفہوم کیا ہے؟ اس بے معنی استعمال سے مذکورہ جملے، سیاق وسباق کے ہوتے ہوئے بھی، مبہم ہو گئے ہیں حالانکہ لکھنے والوں کا مقصد اور مدعا یہ تھا:

۱۔ اس سطح پر گفتگو کرنے کے لیے شہزادی کا غالباً پہلا ایکسپوژر (exposure) تھا۔

۲۔ آپریشن کے معاملے میں پولیس کے اختیارات کی بحالی کی مدت ختم ہو گئی۔

۳۔ سول ملٹری تعلقات کے بارے میں دونوں ایک ہی صفحہ پر ہونے چاہئیں۔

۴۔ فلاں ایئر لائن کے ملازمین نے نجکاری کے بارے میں صدارتی آرڈیننس واپس لے لیا گیا۔

۵۔ دنیا میں تخلیق سے متعلق دو قوانین موجود ہیں۔

اردو زبان میں لفظ ''حوالہ'' کے صرف دو معنی ہیں۔ ایک معنی تو کسی کو کچھ دے دینے کا ہوتا ہے جیسے ''گھر کی چابیاں نوکر کے حوالے کر دیں۔'' انگریزی میں اس مفہوم کا ترجمہ To hand over کے الفاظ سے کیا جائے گا۔ ہُنڈی کے ذریعے رقم بھجوانے کے لئے بھی لفظ ''حوالہ'' کا استعمال کیا جاتا ہے یعنی اتنی رقم فلاں جگہ آپ کے حوالے کر دی جائے گی یعنی دے دی جائے گی۔ ''حوالے'' کا دوسرا مطلب اردو زبان میں بعینہٖ وہی ہے جو انگریزی میں لفظ "Reference' کا ہے مثلاً:

۱۔ اسامہ بن لادن کی موت کی خبر سی این این کے حوالے (reference) سے تمام مقامی چینلز دے

رہے ہیں۔

۲۔ میں اپنی بات کی تائید میں کسی کتاب یا مضمون کا حوالہ (reference) نہیں دے سکتا۔

آج کل برقی میڈیا کے پروگراموں کے میزبانوں کی زبانی کچھ اس قسم کے جملے بار بار سنائی دیتے ہیں:

- اپنے محسوسات کے حوالے سے بتائیے۔ (یہاں کے بارے میں ہونا چاہیے)
- تعلیم کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟ (یہاں کے سلسلے میں ہونا چاہیے)
- نظریات کے حوالے سے دونوں میں بُعدالمشرقین ہے۔ (یہاں کی مناسبت سے ہونا چاہیے)
- اپنی تقریری صلاحیتوں کے حوالے سے اعتماد کا فقدان ہے۔(یہاں کے ضمن میں ہونا چاہیے)

اپنے بے محابا استعمال کی وجہ سے کے حوالے سے، بہت مہمل ہو گیا ہے۔ اکثر اوقات اِس بے معنی استعمال سے جملہ مکمل طور پر مبہم ہو جاتا ہے۔ سیاق وسباق کے ہوتے ہوئے بھی یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھنے یا بولنے والے کا مقصد کیا تھا۔ عام حروفِ ربط کی جگہ ''کے حوالے سے'' کا یہ غلط استعمال اب ٹی وی چینلز اور تحریر و تقریر کی بدولت اس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آپ کسی منچلے کو ترنگ میں آ کر اِس طرح کہتے سنیں گے:

''مجھے فلاں لڑکی کے حوالے سے پیار ہو گیا ہے۔''

اسم فاعل کے آخری حرف کی ''یا'' میں تبدیلی

''فاعل'' کے وزن پر آنے والے ایسے مذکر اسما بھی ہیں جنھیں بولتے وقت اُن کے آخری حرف خاص کر عین اور ح کو ''یا'' میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور اُنھیں گایا، چھایا اور آیا کے آہنگ میں بولا جاتا ہے۔ اکثر پڑھے لکھے بھی اس غلطی کو دُہراتے رہتے ہیں جیسے ضائع سے ضایا، شائع سے شایا، مائع سے مایا، نافِع سے نافیا، واقع سے واقیا، جامع سے جامیا، تابِع سے تابیا، واضح سے واضیا اور صالح سے صالیا وغیرہ۔ اِن متغیر اور مخرّب الفاظ کا مسلسل استعمال ہوتا رہتا ہے۔

کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ میں آپ کا تابیا فرمان شاگرد ہوں۔ (تابِع فرمان)

۲۔ میں نے جامیا مسجد میں نماز پڑھی۔ (جامع)

۳۔ آپ پانی بہت ضایا کرتے ہیں۔ (ضائع)

۴۔ روز نامہ نوائے وقت کئی شہروں سے شایا ہوتا ہے۔ (شائع)

۵۔ جہانگیر کا مقبرہ دریائے راوی کے کنارے واقیا ہے۔ (واقع)

۶۔ مادے کی تین حالتیں ہیں ٹھوس، مایا اور گیس۔ (مائع)

۷۔ آپ کا موقف واضیا نہیں ہے۔ (واضح)

۸۔ ہمیں علمِ نافیا حاصل کرنا چاہیے۔ (نافِع)

۹۔ حضرت صالیا علیہ السلام کو اللہ نے اونٹنی کا معجزہ عطا فرمایا۔ (صالح)

۱۰۔ وہ جامیا پنجاب لاہور میں پڑھتا ہے۔ (جامع)

۱۱۔ یہ بہت افسوس ناک واقیا ہے۔ (واقِعہ)

نعت خواں حضرات نے بھی اس بگاڑ اور ناروا تصرّف کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایک معروف نعت خوان ترنم میں پڑھ رہے تھے:

ع دو جہاں ہے تاباءِ فرمانِ ختم المرسلین

انھوں نے تابِع کو تاباءِ میں بدل کر زبان کو خراب کرنے کی کوشش کی۔ اِسی طرح شافِع محشر کو نعت خواں حضرات شافاءِ محشر ادا کرتے ہیں۔ آج کل محمد شافے اور محمد رافے نام کے طور پر بہت عام ہو رہے ہیں۔ لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ یہ اصلاً محمد شافِع اور محمد رافِع ہیں۔

ممبئی (انڈیا) سے میرے کرم فرما، ندیم صدیقی نے جامعہ مِلیہ اسلامیہ، دہلی کے ایک شعبے کے سائن بورڈ کی تصویر اپنے واٹس ایپ کے ذریعے راقم کو بھیجی۔ یہ سائن بورڈ اُوپر سے نیچے تین سطروں پر مشتمل تھا۔ اوپر کی سطر ہندی رسم الخط میں تھی۔ یقیناً ہندی درست لکھی ہوگی۔ درمیان والی سطر اُردو میں تھی:

''چیف پروکٹر آفس جامیہ ملیہ اسلامیہ''

جامعہ کو جامیہ لکھنا اور وہ بھی اِسلامی اور اُردو یونیورسٹی میں، لمحۂ فکر ہے۔ نیچے والی سطر انگریزی میں تھی اور درست لکھی ہوئی تھی۔

واقع اور واقعہ، جامع اور جامعہ...... اِن سب کو واقیا اور جامیا ہی بولا جاتا ہے۔ اسی طرح صنائع اور بدائع کو بڑی ''خوش اُسلوبی'' سے صنایا اور بدایا کہا جاتا ہے۔ اِعادہ کو اِیادہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی جاتی۔ تنازُع، تنازیا ہو گیا ہے۔ یہی حال مُتنازِع، مُضارِع اور موضِع کا ہے جو بد قسمتی سے متنازیا، مضاریا اور موضیا میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

تعقیدِ لفظی کا عیب

تعقید کا لغوی معنی ہے مضبوط باندھنا اور گرہ دینا۔ یہ عقد سے نکلا ہے جس کا مطلب ''گرہ'' ہے۔ اصطلاح میں تعقیدِ لفظی کا مفہوم ہے جملے میں لفظوں کا اپنی اصل جگہ پر نہ ہونا، قاعدے کے خلاف لفظوں کو آگے پیچھے کر دینا، جس سے جملے کی اصل مراد سمجھنے میں دِقّت ہو۔ تعقیدِ لفظی کا عیب عبارت کے حُسن کو گہنا دیتا ہے جس سے لکھنے والے کا اناڑی پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ آج کل لکھی جانے والی نثر میں اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اخبارات و رسائل اور کتابوں میں اس عیب کو دہرایا جاتا ہے حتیٰ کہ بول چال میں بھی اس عیب سے بچنے کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ گودام میں ایک ہزار گندم کی بوریاں ہیں۔

۲۔ کوئی مسلمانوں کی مملکت امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتی۔

۳۔ حالیہ سینٹ کے الیکشن میں کچھ ارکانِ اسمبلی نے اپنی پارٹی کو دھوکا دیا۔

(اس سے لگتا ہے سینٹ حال ہی میں وجود میں آئی ہے)

۴۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ میرا موقف بھی سنا جائے۔

۵۔ میرا خیال بھی رکھیں۔

درست جملے اس طرح ہوں گے:

۱۔ گودام میں گندم کی ایک ہزار بوریاں ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی کوئی مملکت امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتی۔

۳۔ سینٹ کے حالیہ الیکشن میں کچھ ارکانِ اسمبلی نے اپنی پارٹی کو دھوکا دیا۔

۴۔عدالت سے میری درخواست ہے کہ میرا موقف بھی سنا جائے۔

۵۔میرا بھی خیال رکھیں۔

تعقیدِ لفظی کا شاہکار مرزا اسداللہ خان غالب کا یہ مصرع ہے:

ع ملتے ہیں خود بخود میرے اندر کفن کے پاؤں

اس مصرعے سے یہ لگتا ہے کہ مرزا غالب کے اندر کفن کے پاؤں ہیں جو ہل رہے ہیں۔ حالانکہ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ کفن کے اندر بھی اُن کے پاؤں خود بخود ہل رہے ہیں۔ ایسا تھا تو بھی یہ کمال مرزا صاحب ہی کو حاصل تھا۔

حرفِ عطف کا غلط استعمال

بیان میں زور اور وزن پیدا کرنے کے لیے، ہم معنی اور باہم گہرا تعلق رکھنے والے دو اسموں کو ایک ساتھ لکھ دیا جاتا ہے۔ ایسے دو اسموں کے درمیان حرفِ عطف (واؤ عاطفہ) کا استعمال جائز اور روا نہیں ہے کیونکہ یہ واؤ معنوی فرق کو واضح کرنے کے لیے ہوتی ہے جب کہ یہاں دونوں اسم ایک ہی معنیٰ رکھتے ہیں۔ ایسے ہم معنیٰ دو اسموں کا اکٹھے استعمال فصیح مانا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں، کہ غلط نگاری اب وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے، لکھنے اور بولنے میں حرفِ عطف (واؤ عاطفہ) کا غلط استعمال عام ہے۔ صحیح اور غلط، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتے ہوئے اِن مہمل ''قلمی پاروں کو'' غلط ثابت کرنا ضروری ہے۔ کچھ ایسی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں جنھیں دیکھ کر واضح ہوگا کہ حرف عطف کے استعمال سے صحیح کو غلط کر دیا گیا جیسے چاق چوبند، سوچ بچار، بلند بالا، چیخ پکار، بلند بانگ، ناپ تول وغیرہ درست ہیں لیکن حرفِ ربط کا بے جا تصرف کر کے انھیں غلط لکھا اور بولا جاتا ہے جیسے چاق و چوبند، سوچ و بچار، بلند و بالا، چیخ و پکار، بلند و بانگ، ناپ و تول وغیرہ۔

روز مرہ گفتگو اور تحریر میں در آنے والی واؤ کے غلط تصرف کی مثالوں میں سے میل و ملاپ، حساب و کتاب، نوک و جھوک، شبانہ و روز، دُور و دراز، رنگ و روپ، قول و قرار، شور و غل، خاطر و مدارت، رہن و سہن، دیدہ و دانستہ، منکر و نکیر، سان و گمان بھی ہیں جن کی اصل صورت میل ملاپ، حساب کتاب، نوک جھوک، شبانہ روز، دور دراز، رنگ روپ، قول قرار، شور غل، خاطر مدارت، رہن سہن، دیدہ دانستہ، منکر نکیر، سان گمان وغیرہ ہے۔ دار و مدار، شور و غُل اور کار و بار اگرچہ حرفِ عطف ''واؤ'' کے ساتھ مستعمل اور مروّج ہو چکے ہیں لیکن معنوی طور پر دار مدار، شور غل اور کاربار ہیں۔

معروف ماہرِلسانیات پروفیسر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں:

''اگر اُردو میں دو ایسے اسم استعمال ہوں جو مل کر ایک معنیٰ دیں یا جن کا تعلق ایک دوسرے سے بہت گہرا ہو تو دونوں کے بیچ میں حرفِ عطف کا لانا نہ صرف غیر فصیح ہے بلکہ اکثر غلط ہوتا ہے ملاحظہ ہو: ماں باپ، بھائی بہن، ہندو مسلمان، باپ بیٹا، جورو خصم، جوتا ٹوپی، انگیا کرتی، ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، ناک نقشہ، تانا بانا، کھانا پینا، لینا دینا، کھیل کُود، رنگ رُوپ، آنا جانا، پیسنا پکانا، سینا پرونا، پکانا راندھنا (یا رِیندھنا)، بھلا چنگا، خاک دھول، سمجھ بوجھ، جانچ پڑتال، دیکھ بھال وغیرہ۔''

(بحوالہ مقالاتِ عبدالستار صدیقی، جلد اوّل، مجلس ترقیِ ادب، لاہور)

ذرائع اِبلاغ، بے نیلِ مرام اور قوسِ قزح مرکب اضافی ہیں جنھیں بعض غلط نگار ذرائع و ابلاغ، بے نیل و مرام اور قوس و قزح تحریر کر دیتے ہیں۔ ''دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا'' ایک محاورہ ہے لیکن غیر محتاط لوگ ''دقیقہ وفروگذاشت'' رقم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ ''السلام علیکم'' میں واؤ ڈال کر ''السلام وعلیکم'' بلکہ ''اِسلام وعلیکم'' لکھنے سے نہیں شرماتے۔ یہی صورت خط کتابت کی ہے جسے غلط طور پر خط و کتابت لکھا جاتا ہے جس کا معنی بنتا ہے ''خط اور لکھنا''۔ خط کتابت اصل میں اضافتِ مقلوب ہے جس کی صحیح صورت کتابتِ خط ہے یعنی خط لکھنا۔ بعض لسان شناس بہاء الدین اور علاء الدین میں ہمزہ کے ساتھ واؤ لکھنا معیوب قرار دیتے ہیں۔

لفظ ''حکمتِ عملی'' کا غلط استعمال

حکمت کا معنی دانائی، عقل، تدبیر اور کسی چیز کی حقیقت دریافت کرنے کا علم ہے۔ حکمتِ عملی (بہ ترکیبِ فارسی) کا معنی وہ علم ہے جو تجربے اور عمل سے حاصل ہو۔ اِس کے ذیل میں مُلکی مصلحت، شہری نظام، گھر کا انتظام، تہذیب اور اخلاق آتے ہیں۔

آج کل نشر و اشاعت کے ذرائع اس جامع اور مثبت ترکیب کا استعمال خاصا غلط کر رہے ہیں، جیسے: فلاں نے بُری حکمتِ عملی اختیار کی'' ...... ''یہ ایک احمقانہ حکمتِ عملی ہے'' ...... ''حکومت کی یہ تباہ کُن حکمتِ عملی ہے'' وغیرہ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''حکمتِ عملی'' میں اگر حکمت یعنی دانائی ہے تو وہ بُری، احمقانہ اور تباہ کُن کیسے ہوگئی؟ حکمت کا تو مطلب ہی دانائی، عقل، ہر چیز کی حقیقت دریافت کرنے کا علم، تدبیر اور ڈھنگ وغیرہ ہے، یعنی وہ علم جو تجربہ اور عقل سے حاصل ہو۔ اِسی میں تہذیب، اخلاق، گھر کا انتظام اور شہری نظام آتا ہے۔ حکمتِ عملی میں دانائی، عقل اور علم وغیرہ سب شامل ہیں، لہٰذا ترکیب ''حکمتِ عملی'' صرف مثبت معنی ہی میں استعمال ہوسکتی ہے۔ اِسے چالاکی، بدنیتی، غلطی، بدانتظامی اور بدعملی کے مفہوم میں نہیں لیا جاسکتا۔

''مجھے''۔۔۔فاعل کا نہیں، مفعول کا حرف ہے

طالب علمی کے زمانے ہی سے اُردو کے اساتذہ نے یہ بات ہمارے شعور میں ڈال دی کہ جُملہ ''میں نے لاہور جانا ہے'' غلط ہے اور اس کے بجائے ''مجھے لاہور جانا ہے'' درست ہے۔ راقم سوچا کرتا تھا کہ اس جملے میں ''میں نے'' کا کیا قصور ہے اور ''مجھے'' کس دلیل کی بنا پر صحیح ہے؟ اساتذہ کا یہ فیصلہ سن کر چپ ہو گئے کہ اہلِ زبان اِسی طرح کہتے ہیں لہٰذا ہم پابند ہیں۔ کئی معاملات میں اندھی تقلید فکر و نظر اور سوچ بچار کو تالے لگا دیتی ہے اور سوچ کے دیگر زاویوں کو مسدود کر دیتی ہے۔ اُردو زبان کے مطالعے کے ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین (آنجہانی) کی کتاب ''عام لسانیات'' نظر سے گزری تو ''میں نے جانا ہے'' کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر بہت حقیقت پسندانہ نظر آیا۔ اُنھوں نے ''مجھے جانا ہے'' کے بارے میں اہلِ زبان کے نقطۂ نظر پر کُھل کر تنقید کی ہے۔ آیئے! اُن کی زبانی سنتے ہیں:

> ''میں نے جانا ہے'' اس جملے کو پنجابیوں کا انداز اور اسلوب سمجھ کر اسے غلط قرار دیا جاتا ہے۔ یُو پی والے (اہلِ زبان) ''مجھے جانا ہے'' یا ''مجھ کو جانا ہے'' کو صحیح سمجھتے ہیں۔ دراصل ''میں'' فاعلی حالت ہے اس لیے ''میں نے جانا ہے'' ہی قواعد کے اعتبار سے صحیح ہے۔ ضمیر ''مجھے'' میں مفعولی حالت ہے مثلاً اس نے مجھے مارا۔ اور ''کو'' فاعل کا حرف نہیں بلکہ مفعول کا ہے۔ مثلاً اس نے مجھ کو مارا۔ لہٰذا ''مجھے جانا ہے'' کے بجائے ''میں نے جانا ہے'' ہی درست ہے۔ یو پی والے اگر اسے غلط بولتے ہیں تو وہ اپنی یہ غلطی اہلِ پنجاب پر نہیں لاد سکتے۔''

ڈاکٹر گیان چند جین، عام لسانیات، (نئی دہلی۔ انڈیا، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۱۹۸۵ء) ص: ۲۰

برقی ذرائع اِبلاغ کی ایک انوکھی اِختراع

اُردو زبان کے مقابل ایک ''متوازی اُردو'' بڑی تیزی سے پنپ رہی ہے۔ خود غرضی اور نفسانفسی کے اس دور میں، اس طوفانِ بدتمیزی سے نمٹنے کے لیے، نہ کسی کو فکر ہے اور نہ ہی پروا۔ خاکم بدہن بہت بڑا خطرہ دکھائی دے رہا ہے کہ کہیں متوازی اُردو اصل اُردو کی جگہ نہ لے لے۔ ایک دور تھا کہ ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور قومی اخبارات و جرائد اصلاحِ زبان و ادب کا مؤثر ذریعہ ہوا کرتے تھے۔ اِن اداروں کا کردار جامعات وکلیات سے کم نہیں ہوتا تھا۔ افسوس! آج یہ ادارے اپنا لسانی تشخص کھو بیٹھے ہیں۔ ٹیلی وژن پر بیٹھے اینکر پرسن اور میزبان بسا اوقات تلفظ کی غلطیوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ایک ذمہ دار افسر سے راقم نے اس صورتِ حال کا گلہ کیا تو انھوں نے برملا کہا، ''عوام کی ضرورت خبر کا ابلاغ ہے نہ کہ صحتِ الفاظ، ہماری ترجیح محض خبر کا ابلاغ ہے۔''

عربی سے اُردو میں آنے والے ایسے الفاظ کم نہیں ہیں جو ''میم'' سے شروع ہوتے ہیں اور ''میم'' پر پیش آتی ہے۔ یہ الفاظ عام طور پر اسم فاعل اور اسم مفعول ہوتے ہیں جیسے مُنتظِر اور مُنتظَر، مُختصِر اور مُختصَر وغیرہ۔ ''میم'' سے شروع ہونے والے کسی لفظ پر زبر آئے تو وہ عام طور پر اِسمِ ظرف ہوتا ہے جیسے مَجلِس، مَقتل، مَنظر وغیرہ یا پھر اسم مفعول ہوتا ہے جیسے مظلوم، مقتول، مجبور وغیرہ۔ ٹیلی وژن چینلز نے سوچی سمجھی سازش یا جہالت کے تحت یہ اُصول اور فارمیٹ اپنا لیا ہے کہ 'میم' سے شروع ہونے والے وہ الفاظ جن کے پہلے حرف پر پیش آتی ہو اُسے خواہ مخواہ زبر کے ساتھ پڑھا اور لکھا جائے جیسے مُثبت کو مَثبت، مُغوی کو مَغوی (اصل میں مُغویٰ)، مُندَرج اور مُندَرجہ کو مَندرج اور مَندرجہ، مُختص کو مَختص، مُنحرف کو مَنحرف،

مُنہدم کو مَنہدم، مُنتخب کو مَنتخب، مُنفرد کو مَنفرد، مُنتشر کو مَنتشر، مُنقطع کو مَنقطع، مُختصر کو مَختصر، مُتقِم مزاج کو مَتقِم مزاج، مُنتقِل کو مَنتقِل، مُشتمل کو مَشتمل، مُراسلہ کو مَراسلہ، مُصنِّف کو مَصنِّف، مُمکن کو مَمکن اور مُعین کو مَعین۔ اسی طرح فارسی ترکیب رُونُمائی کو رَونَمائی کہتے ہوئے سُنا گیا ہے۔ ان مثالوں میں زبر لگا کر بگاڑے گئے الفاظ بے معنیٰ ہو گئے ہیں۔ ایسا کرنے اور سوچنے والے زبان کے معاملے میں قطعی طور پر جاہل ہیں۔ مُثبت کو مَثبت کہنے والے ایک حضرت کو ٹوکا تو ''کمالِ اِستدلال'' سے کہنے لگے، ''اچھا! یہ بتاؤ پھر مَنفی کو مُنفی کیوں نہیں کہتے؟''

بہنا، سہنا اور کہنا سے فعل امر کا غلط اِملا

بہنا، سہنا اور کہنا مصدر سے فعل امر 'بہہ'، 'سہہ' اور 'کہہ' کا املا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ یہ اُن غلط العام کلمات میں شامل ہیں جو آج کل، غلط طور پر مروّج ہو گئے ہیں۔ اردو مصدر جانا، کھانا، پینا، لکھنا، پڑھنا اور رہنا وغیرہ سے صیغۂ امر بنانے کے لئے مصدر کا آخری حصّہ 'نا' حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً جانا سے جا، کھانا سے کھا، پینا سے پی، لکھنا سے لکھ، پڑھنا سے پڑھ اور رہنا سے رَہ وغیرہ۔ اِسی قاعدے کے تتبّع میں بہنا، سہنا اور کہنا سے صیغۂ امر بَہ (بَ + ہ)، سَہ (سَ + ہ) اور کَہ (کَ + ہ) تشکیل پاتا ہے یعنی لکھنے اور بولنے میں صرف ایک ''ہ'' آتی ہے۔ اِسی طرح فعل حال جاری 'بَہ رہا ہے'، 'سَہ رہا ہے' اور 'کَہ رہا ہے' لکھنے اور بولنے میں درست ہے۔

ناروا طور پر ان میں ایک ''ہ'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے یکے بعد دیگرے دو ''ہ'' جمع ہو جاتی ہیں مثلاً بہنا سے بہہ (ب + ہ + ہ)، سہنا سے سہہ (س + ہ + ہ) اور کہنا سے کہہ (ک + ہ + ہ)۔ ایسا شاید اس لیے کیا جاتا ہے کہ بِہ (اسم صفت)، سِہ (عدد) اور کِہ (ربط، عطف، علّت اور صلہ کے لئے حرفِ بیان) فعل امر کے مندرجہ بالا صیغوں کے مماثل ہیں اور لکھنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''ہ'' کا اضافہ کرنے سے امر کے اِن صیغوں کا تلفظ بگڑ جاتا ہے۔ بہنا سے بَہ (Beh)، سہنا سے سَہ (Seh) اور کہنا سے کَہ (Keh) درست ہے مگر بہہ (Baheh)، سہہ (Saheh) اور کہہ (Kaheh) درست نہیں ہے۔ مماثلت کے اِشکال کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لکھتے اور بولتے وقت محض زبر اور زیر کے صوتی فرق کو ملحوظ رکھا جائے یعنی کَہ اور کِہ، سَہ اور سِہ، بَہ اور بِہ۔

''خُوب صُورت'' کا بے جا اِستعمال

خُوب (زِشت اور بد کا نقیض) کے معنے عمدہ، نفیس، حسین، جمیل، خوش نما، زیبا اور دل کش کے ہیں۔ اس سے کئی ترکیبیں تشکیل پاتی ہیں جیسے خُوب رُخ، خوب رُو اور خُوب صُورت وغیرہ۔ اِن میں سے ''خوب صُورت'' اُردو میں سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ خُوب صُورت کا معنی ہے 'حسین چہرے والا'۔ یہ ترکیب کسی ایسی ذات یا شے کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے جس کی کوئی ہیئت، چہرہ، شکل یا ظاہری صورت ہو جیسے کوئی جانور یا انسان۔ ہمارے ہاں اس کا بے محابا استعمال کیا جاتا ہے۔ بات بات پر اور مسلسل اس کا استعمال بے جا اور ناروا ہو جاتا ہے۔ ہم یہ تک نہیں سوچتے کہ جسے خُوب صُورت کہہ رہے ہیں اُس کا چہرہ اور شکل ہے بھی یا نہیں؟ حتیٰ کہ ہمارے شعرا اور ادبا بھی اسے بڑی بے دردی سے استعمال کرتے ہیں جیسے:

غالب کی فلاں غزل کتنی خُوب صُورت ہے۔

شاعر کا خیال بہت خُوب صُورت ہے۔

بھلا غزل اور خیال کی کوئی ظاہری شکل ہے؟ یہی بات صرف ایک لفظ سے ادا کی جاسکتی ہے:

غالبؔ کی فلاں غزل کتنی 'خُوب' ہے۔

شاعر کا خیال بہت 'خُوب' ہے۔

'خوب صورت' وہیں استعمال ہونا چاہیے جہاں کوئی صورت، شکل کوئی ہیئت واقع ہو مثلاً:

یہ بچہ خُوب صُورت ہے۔

یہ پھول خُوب صُورت ہے۔

یہ قلم کتنا خُوب صُورت ہے۔

کسی آراستہ چیز کے بارے میں کہا جائے تو بھی ٹھیک ہے جیسے ''یہ لباس خُوب صُورت ہے'' وغیرہ۔

مصدرِ میمی ''مَحبت'' وغیرہ کا تلفظ

اُردو میں مستعمل کچھ ایسے عربی اسما ہیں جن کی حیثیت مصدرِ میمی کی ہے۔ زیادہ تر لوگ ان کے تلفظ کرنے میں غلطی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ یہ اسما میم سے شروع ہوتے ہیں اور قاعدے کے مطابق ان کے پہلے حرف میم پر زبر آتی ہے اور آخر میں پوری ت سے مکمل ہوتے ہیں جیسے مَحبت، مَذلّت، مَذمّت، مَرمّت، مَسرّت، مَشقت وغیرہ۔ ان اسما کے میم پر زبر آئے گی ورنہ پیش لگانے سے صورتِ مفعولی پیدا ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر غور کیجیے:

مُحِبّ اسم فاعل مذکر ہے جس کا معنی ہے محبت کرنے والا۔ اس سے اسم مفعول مذکر مُحَبّ بنتا ہے جس کا معنی ہے ''وہ مرد جس سے محبت کی جائے'' مُحَبَّۃٌ (مَحبت) اسم مفعول مونث بن جاتا ہے جس کا معنی ہو جائے گا ''وہ عورت جس سے محبت کی جائے'' قرآنِ مجید میں بھی مُحبت نہیں مَحبت استعمال ہوا ہے:

﴿وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّۃً مِّنِّی﴾ (القرآن، طٰہٰ: ۳۹)

(اور میں نے تمھارے اوپر اپنی طرف سے محبت کا اثر ڈال دیا تھا)

نَبات اور نِبات میں فرق

دو مختلف اللّسان اور مختلف المعنی لفظوں نَبات (Nabaat) اور نِبات (Nibaat) کو لکھتے اور بولتے وقت نافہمی سے ایک ہی لفظ سمجھ لیا جاتا ہے۔ بعض فرہنگوں میں بھی ان دو لفظوں کو، زبر اور زیر کے فرق سے سمجھانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی جس کی وجہ سے معنوی التباس پیدا ہوجاتا ہے۔ اس نافہمی کے پس منظر میں لغوی رموز سے عدمِ توجّہ اور عدمِ دل چسپی کے رویّے کارفرما ہیں۔ آیئے! اِن دونوں کے لغوی اور معنوی فرق کو سمجھیں:

نَبات (Nabaat)

یہ عربی لفظ ہے اور اردو میں مونث بولا جاتا ہے۔ اِس کا معنی ہے سبزہ، روئیدگی، بُوٹی، گھاس، پات، درخت اور ہر وہ چیز جو زمین سے اُگے۔ نَبات خود اسمِ جمع ہے لہٰذا اِسے ''نباتات'' بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہمارے ہاں جامعات وکلیات میں Botony Department کو اُردو میں شُعبۂ نباتات لکھا، پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے جب کہ Biology Department کو شعبۂ حیاتیات کہتے ہیں۔ یہ امر راقم السطور کی سمجھ سے بالا ہے کہ حَیات سے ''حیاتیات'' کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اِسی طرز پر نَبات سے ''نباتیات'' کیوں نہیں وضع کیا گیا، ''نباتات'' پر کیوں اکتفاء کیا گیا ہے؟۔ ''حیاتیات'' کی اصطلاح پر ممتاز نقاد، مترجم اور ادیب محمد سلیم الرحمٰن کی پھبتی بہت برمحل اور اُن کے ذوقِ سلیم پر دال ہے۔ اُن کے بقول ''حیاتیات'' کی ''ح'' کو الگ کرلیں تو باقی ''یات یات'' بچتا ہے۔

نِبات (Nibaat)

یہ فارسی لفظ ہے اور اُردو میں مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے مصری، قند، مصری کی قلم یا کوزہ۔ بقول شاعر:

دھو کے دلواتی ہے شیریں دہنی اے نوشاہ

کھائیے کھائیے مصری وہ نبات آپہونچی (اختر دہلوی)

(بحوالہ نوراللغات، جلد چہارم، ص ۱۴۸۷)

شادی کی ایک رسم کو محاورۃً ''نبات چُنوانا'' کہا جاتا ہے۔ ایک ترکیب شاخِ نبات بھی ہے یعنی میٹھی شاخ۔ اقبالؒ ''خضرِ راہ'' میں فرماتے ہیں:

ساحرِ اَلمُوط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش

اور تُو اے بے خبر سمجھا اِسے شاخِ نبات

میرے علم اور مشاہدے میں ایک خاتون کا نام شاخِ نبات ہے جو ایک کتاب کی مصنِفہ ہیں۔

غلطی ہائے مضامین

الفاظ ہماری سوچ اور خیالات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ یہ ہماری آواز ہی نہیں، ہمارے خیالات، جذبات اور اِحساسات کی رُوح ہوتے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے دوسروں تک اپنے دل کی دھڑکنیں پہنچاتے ہیں۔ الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری اپنی اِنتہا کو پہنچ چکی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس طرز پر نہ غور کیا جاتا ہے نہ احتجاج۔ لفظ کو غلط اور بے احتیاطی سے استعمال کرنے کے کئی اسباب ہیں جن میں کم علمی، کم فہمی، زُود نویسی اور جہالت زیادہ اہم ہیں۔ بدقسمتی سے اس گمراہی کو ترقی پسندی کا عنوان دیا جاتا ہے۔ الفاظ کی بے توقیری کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

حیرانگی یا حیرانی؟

بعض ادیبوں اور شاعروں کی تحریوں اور کلام میں لفظ حیرانگی راہ پا چکا ہے۔ یہ لفظ حیرانگی نہیں حیرانی ہونا چاہیے یا پھر حیرت۔ بالعموم ''ہ'' والے فارسی الفاظ کے آگے کیفیت کا لاحقہ ''گی'' لگتا ہے جیسے دیوانہ سے دیوانگی، تحفہ سے تحفگی، زندہ سے زندگی، شرمندہ سے شرمندگی، بیوہ سے بیوگی اور تشنہ سے تشنگی۔ لفظ حیران کے آخر میں ''ہ'' نہیں ''ن'' ہے۔ اس قاعدے کے مطابق حیرانی ہوگا جیسے انسان سے انسانی، جان سے جانی، دیوان سے دیوانی وغیرہ۔ اِس ضمن میں یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ ''حیرانی کی بات ہے'' کے بجائے ''حیران کن بات ہے'' میں زیادہ فصاحت ہے۔

طوطی یا تُوتی؟

لکھے ہوئے لفظ ''طوطی'' کو دیکھ کر پہلا تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ یہ ''طوطا'' کی تانیث ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اُردو زبان و ادب میں طوطی (یا تُوتی) سے تشکیل پانے والا ایک محاورہ اور دوسری

ضرب المثل بہت مشہور ہیں۔ ''طوطی (یا تُوتی) بولنا'' اور ''طوطی (یا تُوتی) کی آواز نقّار خانے میں کون سنتا ہے۔'' استاد ذوقؔ کا لقب بھی ''طوطیٔ ہند'' تھا۔ زیرِ بحث معاملہ یہ ہے کہ اُردو میں درحقیقت طوطی ہے یا توتی؟ یہ فارسی لفظ ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے تُوتی ہے۔ اہلِ دہلی اسے مذکر بولتے ہیں گو بقاعدۂ اُردو تانیث ہے۔ تُوتی ایک خوش آواز چھوٹا سا پرندہ ہے جو توت (شہتوت) کے موسم میں اکثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ پرندہ توت (شہتوت) کمالِ رغبت سے کھاتا ہے چنانچہ توت کی شوقینی کی بنا پر اس کا نام تُوتی رکھا گیا ہے۔

طوطی اصل میں تُوتی کا معرب املا ہے۔ یہ اِملا اردو میں بھی در آیا ہے لیکن اصل میں تُوتی (تُو تیت سے) ہی ہے۔ محاورے ''تُوتی بولنا'' کا مطلب ہے کسی ہنر یا خوبی کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہونا۔ ضرب المثل ''تُوتی کی آواز نقّار خانے میں کون سنتا ہے'' کا معنی ہے کہ نوبت خانے (نقارہ پیٹنے کی جگہ) میں شور کے زیادہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے سے پرندے تُوتی کی آواز کوئی نہیں سن سکتا لیکن اس ضرب المثل کا مرادی مفہوم یہ ہے کہ بڑوں کے سامنے چھوٹوں کی رائے کی کوئی وُقعت اور اہمیت نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ لاعلمی سے طوطی (توتی) کو ایک ساز سمجھتے ہیں۔ یہ خیال حقیقت کے برعکس ہے۔

اِستعاراتی یا اِستعاری؟

ممبئی (ہندوستان) سے راقم کے کرم فرما، معروف لسان شناس اور صحافی ندیم صدیقی اردو کی صحت، نفاست، سلاست اور لطافت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے ''استعارہ'' پر بات کرتے ہوئے راقم سے پوچھا:

> ''اگر کوئی جملہ لکھا جائے تو اس میں آپ کی رائے استعاراتی کے حق میں ہوگی یا اِستعاری کے ساتھ؟''

راقم کا جواب ''اِستعاری'' تھا جس پر ندیم صدیقی نے صاد کیا۔ اِسی نہج پر، میرے نزدیک اُلوہیاتی تصور، تہذیباتی رکھ رکھاؤ، تلمیحاتی پس منظر، تالیفاتی کاوش، صوتیاتی تاثر، تشکیلاتی دور، تحقیقاتی پیش رفت، لسانیاتی رموز، تمثیلاتی پہلو اور تخلیقاتی جہت کی جگہ اُلوہی تصوّر، تہذیبی رکھ رکھاؤ، تلمیحی پس منظر، تالیفی کاوش، صوتی تاثر، تشکیلی دور، تحقیقی پیش رفت، لسانی رموز، تمثیلی پہلو اور تخلیقی جہت کہنا اور لکھنا درست اور مناسب ہے۔ البتہ کچھ اِستثناء ہیں جیسے حادثاتی موت، جامعاتی تحقیق وغیرہ کیونکہ اِن کا چلن اور استعمال اس قدر زیادہ ہو چکا ہے کہ اب حادِثی موت اور جامعی تحقیق کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔

خودرَو یا خودرُو؟

ہم جنگلی بُوٹیوں کو عام طور پر ''خودرَوْ'' بُوٹیاں کہتے ہیں جو ایک غلط ترکیب ہے۔ رَو رفتن مصدر سے ہے جسے اُردو میں مونث بولا جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے دھارا، سَیل، بہاؤ، لہر اور مَوج۔ بطور لاحِقۂ فاعلی اس کا مطلب ہے ''چلنے والا'' جیسے تُندرَو، تیز رَو، راہ رَو اور سُست رَو وغیرہ۔ جنگلی بوٹیوں کے لیے اصل ترکیب خودرُو ہے یعنی بغیر کاشت کیے اُگا ہوا کوئی پودا یا بُوٹی۔ رُو رُستن یا روئیدن مصدر سے ہے جس کا معنی ہے اُگنا۔

خُرد (بمعنی چھوٹا) یا خورد؟

خُرد فارسی اِسم صفت ہے جس کا معنی ہے چھوٹا، کم عمر، کم زر اور کم جُثہ۔ اِسی سے خُرد بین اور خُردسال کی ترکیبیں بنی ہیں۔ خورد، خوردن مصدر (کھانا) سے ہے جو ایک الگ لفظ ہے۔ خُرد کی جگہ خورد غلط اِملاء ہے۔ اِسی طرح خورد بین، خوردسال اور خوردسالی کی ترکیبیں بھی غلط ہیں۔ یہ اصل میں خُرد بین، خُردسال اور خُردسالی ہیں۔

اُردو حریفۂ میکالے ـــــ مِن اَلف اِلحراث
(اُردو کے مُتوازی ایک نئی زبان)

لسانی اِنتشار اپنی اِنتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دیگر وجوہ کے علاوہ ایک بڑا سبب لفظ کے ماخذ تک رسائی سے گریز کا رویہ ہے۔ لسانی اشتقاق اور لفظ و معنی کے اِنسلاک سے نا آشنائی اِس اِنتشار کا دوسرا بڑا سبب ہے۔ فی زمانہ، شعر و نثر کے اساتذہ اور لسان شناس نئے الفاظ کو قبول کرنے کی صلاحیت کا چرچا کر کے اُردو کو مضبوط اور توانا کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر دوسری طرف بنیادی اور اساسی الفاظ کو غیر مانوس اور متروک قرار دے کر مجرمانہ گریز کا رویہ اپنا رہے ہیں۔ ایسا کرنے کی وجہ اُن کی اپنی سُستی اور کاہلی ہے کہ وہ لفظ کے مادے میں اُتر کر تفحص و تجسس کی تکلیف سے بچنا چاہتے ہیں۔ لسانی تہذیب کے تواتر کی مخالفت کرتے ہوئے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا جاتا ہے کہ آخر اِن خشک اور غیر مانوس الفاظ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اُردو کے مستقبل کے بارے میں یہ سوچ اور رویہ اُردو سے محبت کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکر ہے۔ نظر انداز اور ترک کیے گئے ایسے الفاظ کی طرف توجہ نہ دی گئی تو وہ دن دُور نہیں کہ یہ اپنی اصل سے کٹ جائیں گے اور اِن کا ماخذ۔۔۔ زبان اور ذہن دونوں سے محو ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ زبان کمزور اور پست رہ جائے گی۔

''اُردو حریفۂ میکالے'' [۱] لسانی انتشار کے اِن حالات میں، میرے سامنے تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آئی۔ اس کا مطالعہ شروع کیا تو بادی النظر میں محسوس ہوا کہ اس کا فاضل مصنف الف الحراث [۲] لسانی اور لغوی تہذیب کے تواتر کا نمائندہ ہے۔ مطالعہ جاری رہا، پہلے تاثر اور احساس کے مقابل دیگر تاثرات بھی پیدا ہوتے گئے جن کا وزن پہلے تاثر سے کہیں زیادہ ہے۔ اتفاق اور اختلاف کے اِمتزاج نے ایک راہ سجھائی کہ کیوں نہ اس کتاب کے حسن و قبح پر تنقیدی اور تجزیاتی انداز میں خامہ فرسائی کی جائے۔

''اُردو حریفۂ میکالے'' پہلی بار ۱۹۵۹ء میں، مکتبہ دین و دُنیا لاہور سے شائع ہوئی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ علمی، ادبی اور لسانی دُنیا میں یہ کتاب بے حسی کی گرد کی دبیز تہوں تلے دبی رہی اور کسی نے یاد کیا نہ ذکر۔ ۲۰۲۰ء میں ممتاز لسانی محقق، ادیب اور مترجم پروفیسر ڈاکٹر سعید احمد [۳] نے یہ نادر و نایاب کتاب دریافت کی، اسے نہایت محنت اور سلیقے سے ترتیب و تہذیب کے عمل سے گزارا اور حُسنِ اہتمام سے اسے شائع کیا۔ اُردو دُنیا کے لوگوں کو ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اِس اعجوبۂ روزگار کتاب کو زندہ رکھنے کی سعی کی ہے۔

الف المحراث کا اصل نام، فاضل مرتب کے مطابق، ممتاز انصاری تھا۔ وہ اپنے قلمی نام کے معنی ''ہل کا پھل'' یا بہ زبانِ انگریزی Alpha of the Plough بتایا کرتے تھے۔ وہ بہت دل چسپ و عجیب شخصیت کے مالک تھے۔ پستہ قد الف المحراث نے اپنا حلیہ بھی کچھ عجیب بنا رکھا تھا۔ سردیوں گرمیوں میں لمبی شیروانی پہنتے تھے اور سر پر قائداعظم کے طرز کی ٹوپی پہنتے تھے۔ سگریٹ اور چائے کے بے حد شوقین تھے۔ تنگدستی کے باوجود خودداری کا وصفِ خاص رکھتے تھے۔ عام طور پر مقبولِ عام بگلہ مارکہ سگریٹ پیا کرتے تھے۔ اگر وہ نہ ملتی تو مجبوراً ذرا مہنگی قینچی کی ڈبی خریدتے۔ مالِ مفت کے روادار نہیں تھے۔ کفایت شعاری کے طور پر یا غربت کے مارے سڑک سے اُٹھا کر جمع کیے ہوئے سگریٹوں کے آدھے یا تہائی ٹوٹے اُن کی پنشن کی رقم تمام ہونے کے آخری دنوں کا سہارا ہوتے۔ غیور اتنے تھے کہ چائے بھی کسی سے نہ پیتے۔ کبھی دستِ طلب دراز نہ کرتے۔ اپنی تھوڑی بہت پنشن یا کتابوں کی یافت سے گزر اوقات کرتے۔ بیوی بچوں کی قید سے آزاد تھے۔ اکیلے تھے اور اکیلے ہی خاموشی سے دُنیا چھوڑ گئے۔ [۴]

الف المحراث کے قلم سے تین کتابیں یادگار ہیں: ۱۔ اُردو حریفۂ میکالے، ۲۔ اُردو کی پہلی سیڑھی، ۳۔ خاطرِ غبار۔ خاطرِ غبار کے بیک ٹائٹل پر اُن کی یہ تحریر درج ہے:

> ''سنِ ولادت ۱۹۱۹ء۔ تعلیم دہم کامیاب۔ بعد و قبل تقسیم P.M.A.D میں تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ایوب نے نوکری چھینا۔ نتیجتاً اب تک بھوکا۔ تصانیف کہ زیرِ باز نگاہ ہیں ان شاء ۱۹۷۶ء میں منشورہ ہوں گی: ہندی عود، اعلا اُردو، اِبلیس فردوس، لندن مسافرین، ہند قصص، زندگی نامہ رومی بلخی، وقت الابن، و نالندہ بغداد۔۔۔ منشورہ اُردو حریفۂ میکالے، اُردو کی پہلی سیڑھی۔'' [۵]

غالب گمان ہے کہ شاید الف المحراث کی زندگی میں یہ کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی ہوں

گی۔ اس کی بدقسمتی ہے کہ اُسے اپنی زندگی میں اور بعدالموت بھی، اہلِ علم و ادب کی طرف سے پذیرائی نصیب نہ ہوسکی اور اُس کے لسانی اجتہاد کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ جہاں تک راقم السطور سمجھ سکا ہے اُس کے ذاتی حالات، ہیئت کذائی اور عسرت و اِفلاس زمانے کی ناقدری کا سبب بنے۔ غربت اور بے بسی بڑی ظالم چیز ہے۔ الف المحراث کی اپنی خودداری، اَنا اور بہت حد تک خود پسندی نے بھی اُسے اپنے معاصرین سے دُور رکھا۔ معاصرین کی طرف سے بھی نظرانداز کرنے، قبول نہ کرنے، ناقدری اور حسد کے رویے دیکھے جا سکتے ہیں۔ 'ادبِ لطیف'، 'فنون'، 'اوراق' اور دیگر معاصر مجلّوں اور جریدوں میں اُن کی کوئی تحریر یا اُن کے فن پر کسی اور کا مضمون شائع نہیں ہوا۔ سب سے بڑا سبب اُس کے اپنے لسانی اِجتہاد ہیں جن سے اِتفاق کرنا مشکل تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ صحبتِ ناجنس کا شکار ہو گئے تو یہ بھی کوئی غلط بات نہیں ہے۔

فاضل مرتب ڈاکٹر سعید احمد ''اُردو حریفہٗ میکالے'' کو لغت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اُردو حریفہٗ میکالے'' کے اِن دو سو صفحات پر طائرانہ نگاہ ڈالیں تو الف المحراث کی لغت اور لسانیات سے دل چسپی اور دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لسانی لطائف اور مختلف مسائل پر الف المحراث کی اُفتادِ طبع اور انفرادو اجتہاد کے پیشِ نظر انھیں اُردو زبان کا البیلا لغت نویس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔'' [۶]

ڈاکٹر سعید احمد کی یہ بات کسی حد تک درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو کسی حتمی درجہ بندی میں نہیں لایا جا سکتا۔ اگر اس کتاب کے ایک بڑے حصے کو دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ کتاب اُردو سے ملتی جلتی ایک متوازی اور متبادل زبان کی اِختراع کی ایک کوشش نظر آتی ہے۔ ''اُردو حریفہٗ میکالے'' کا ذیلی عنوان ہے [انگریزی خط پر] جس سے مراد ہے On the line of English یعنی بطرزِ انگلش یا بطریق انگریزی۔ کتاب کے عنوان میں لفظ ''میکالے'' [۷] نے تاریخی جہت پیدا کر دی ہے۔ الف المحراث نے اس نام کو بطور علامت لا کر دُکھ کے اُس احساس کو تازہ کیا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کو ۱۸۳۵ء میں انگریزی کے بطور ذریعۂ تعلیم نفاذ پر ہوا۔

''اُردو حریفہٗ میکالے'' کا پیش چہرہ جسے ملا کر ''پیشچہرہ'' لکھا گیا ہے کتاب کے مندرجات کے بارے میں ایک اِبتدائی تاثر ضرور فراہم کرتا ہے:

یہ ایک لاقابلِ ابطال صلادت وصداقت ہے کہ خلافِ لشکر (اُردو) آج کل تحت بر میں صرف ایک نہیں بل کہ عدیدالسنہ برجنگ ہیں مگر چوں کہ یہ زاردیدہ ہے لہاذا اس کا کیان اپنے مخالفین کے لیے ایک محدلۂ بخار (اسٹیم رولر) ہے لہاذا اجہدِ لسان محرکِ تصنیف ہاذا ہے۔

میر اقلم آپ کے تقابل میں صفر ہے لہاذا اغلطات واسہا سے مبرا ومعرا نہیں ہوں تاہم تحسین واستمالت ملتمس ومتوقع ہے عدم استمالت وتہکم صرف میرے لیے نہیں بل کہ بہر زبان ضرب موت نکلے گا۔ ہر مشورہ، تنکیت وتنظیر وغیرہ وغیرہ معرفت مکتبہ مذکورلوح پر بھیجی جا سکتی ہے۔ ہر ممکن وقابلِ عمل اِطلاع توجہ پائے گی۔ چوں کہ زبان میں غالباً نہیں بل کہ یقیناً اپنی قسم کی اوّل سعی ہے نیز ایک عتیداً قابلِ افسوس وغیر مساعد حالات میں لکھی گئی ہے۔ اُردو دُنیا سے اتم تعاون وسخاوغیرہ وغیرہ ملتمس ہے۔[۸]

ارک بلقیس

سلیمان شہر　　　　　　　　　　　　　　　　الف المحراث

۱۶۔۱۰۔۵۹

ڈاکٹر اسلم انصاری کے قیاس کے مطابق، ارک بلقیس سے کوئینز روڈ اور سلمان شہر سے لاہور شہر مراد ہیں۔ اُن کے نزدیک ارک بلقیس اور سلیمان شہر کی قرینِ قیاس اور معقول تشریح اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں ''ارک'' یا ''ارگ'' سے مراد ایسا چھوٹا قلعہ یا سرکاری عمارت ہے جو ایک بڑے قلعے میں بنائی گئی ہو۔ بلقیس سے مراد ملکہ ہے جو مصنف نے ملکہ وکٹوریا کے لیے بطور علامت استعمال کی ہے۔ لاہور میں پنجاب اسمبلی کے سامنے ایک چھوٹی سی مسقّف عمارت میں ملکہ وکٹوریا کا بت رکھا رہتا تھا جو برطانوی استعمار اور اقتدار کی علامت تھا۔ مصنف نے غالباً اس عمارت میں بیٹھ کر یہ تحریر لکھی ہو گی اور چونکہ عمارت بلقیس کی ہے تو شہر لازماً سلیمان کا ہوگا۔ یوں لاہور کو سلیمان شہر کہا گیا ہے۔[۹]

اگر کوئی پوچھے کہ یہ پیش چہرہ کس زبان میں ہے اور اس کا مطلب کیا ہے تو گمانِ غالب ہے کہ پوچھنے والا اور جس سے پوچھا جا رہا ہو، دونوں حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں گے۔ آخر یہ کون سی زبان ہے جس میں کہیں کہیں اُردو کے الفاظ بھی در آئے ہیں۔ ''اُردو حریفۂ میکالے'' کے غیر مانوس ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک ساختہ زبان ہے جس کے بارے میں مصنف کا اِدّعا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ایسی ہی زبان لکھنی اور بولنی چاہیے۔

الف المحراث کی لسانی اور لغوی کاوشوں کے تعین کے لیے پانچ علمی وادبی شخصیات کے اُن کے بارے میں تاثرات کو اس مضمون کا حصہ بنایا جارہا ہے۔ اِن پانچوں کی الف المحراث سے ملاقات رہی۔ ان میں سے پہلے تین اس دُنیا میں نہیں ہیں، دو الحمدللہ بقیدِ حیات ہیں:

۱۔ پروفیسر قیوم نظر، خاطرِ غبار (انتقاد بر غبارِ خاطر) پر تبصرہ کرتے ہوئے طنزاً اور تعریضاً الف المحراث ہی کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عاہلِ نثرا الف المحراث قلم میں غیر متوازن ہے۔ اُردو ''نادرست راہ سے ہٹا کر درست'' پر لانے کی لگن میں ایک بڑا حصہ بھینٹ چکا ہے۔ فی صد کامیابی کیا ہے؟۔۔۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔ پر لگن نہیں سراہنا لائقِ افسوس سرد مہری ہے۔''[۱۰]

۲۔ احمد ندیم قاسمی تحسین کے ساتھ ساتھ اُن کے کیے گئے کام پر حرف بھی رکھتے ہیں:

''لسانی تشکیلات کے معاملہ میں کوئی مانے یا نہ مانے، پر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خود ساختہ اِصطلاحات والفاظ وغیرہ وغیرہ زبان میں ہنوز غیر مقبول ہیں۔ یہی اور فقط یہی اِس کی لاثانی اِنفرادیت ہے۔''[۱۱]

۳۔ ناصر زیدی (مُدیر ادبِ لطیف) لکھتے ہیں:

''الف المحراث 'ادبِ لطیف' کے دفتر میں مجھے شرفِ ملاقات بخشنا کبھی نہ بھولتے۔ میں اُن کی ''اُردودانی'' سے محظوظ ہوتا، مگر بطور مدیر ''ادبِ لطیف'' اُن کی کوئی تحریر چھاپنے سے گریزاں رہتا۔''[۱۲]

۴۔ ڈاکٹر اسلم انصاری سے الف المحراث کی بابت راقم السطور کی تفصیلی گفتگو ہوئی، اُن کا کہنا ہے:

''الف المحراث بیسویں صدی کی لسانی دُنیا کا ایک دل چسپ اور عجیب وغریب کردار ہے۔ اُن کی زندگی نہایت عسرت میں گزری۔ میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کررہا تھا اور کالج سے متصل وولنز ہاسٹل میں مقیم تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے وہ چند مرتبہ ہاسٹل میں میرے پاس آئے۔ ایک روز الف المحراث ہمارے ہاسٹل میں آئے اور اپنی کتاب ''اُردو حریفۂ میکالے'' متعارف کرائی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں جب جلدی جلدی ان کی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا تو انھوں نے کہا ''اپنا وقت لیجیے، اپنا وقت لیجیے''۔ یہ گویا انگریزی کے Take Your Time کا اُردو متبادل تھا اور مراد یہ تھی کہ تسلی سے دیکھیے۔ الف المحراث کے پاس ایک شکستہ اور

قدیم زمانے کی بائیسکل تھی جس کا ہینڈل پکڑے میلوں پیدل چلتے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پل میاں میر کے قریب ایک کچی آبادی میں رہتے تھے۔ تنگ دست اتنے کہ لکھنے کے لیے کاغذ خریدنے کی انھیں استطاعت نہیں تھی۔ دیواروں اور عمارتوں سے مختلف کمپنیوں کے تازہ چسپاں اشتہار اُکھاڑتے اور کپڑے سے لیئی صاف کر کے اُنھیں خشک کر لیتے اور اپنے استعمال میں لاتے۔ وہ عربی، فارسی اور ہندی کے فاضل تھے۔ مادے سے، اپنے ہی قاعدے کے مطابق، الفاظ تشکیل دینے کا گُر جانتے تھے جو اکثر اُن کے خود ساختہ ہی ہوتے۔

حضرت الف المحراث قد و قامت کے اعتبار سے حضرت احسان دانش سے ملتے جلتے تھے۔ سادہ لباسی میں بھی اُنھیں کے پیروکار لگتے تھے۔ چہرے کے نقوش قدرے موٹے اور کھڑے کھڑے سے تھے۔ آواز مناسب تھی اور لب و لہجہ شائستہ تھا۔ اُن کے بارے میں اُنھی دنوں آخری اِطلاع ایک عزیز دوست کی طرف سے یہ ملی کہ وہ معروف ناول نگار الطاف فاطمہ کے بھائی تھے۔ یاد آیا کہ الطاف فاطمہ بھی شاید ہماری کلاس فیلو یا سیشن فیلو رہی تھیں۔ اہم بات یہ ہے کہ الطاف فاطمہ لکھنؤ کی رہنے والی تھیں لیکن الف المحراث میں لکھنویت کے کوئی آثار نہیں تھے، واللہ اعلم بالصواب۔'' [۱۳]

۵۔ معروف بزرگ لسان شناس محمد احسن خان الف المحراث کے ہم عصر ہیں۔ الف المحراث سے ان کی ملاقات بھی رہی۔ وہ اُن کے بارے میں کہتے ہیں:

''یہ اپنے آپ کو میم میم انصاری کہتے تھے۔ راوی کے پار شاہدرہ کی کسی کچی آبادی میں مقیم تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ہدفِ تنقید بناتے اور اُن کے علمی کام کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے۔ اُن کا ذِکر کرتے ہوئے تمسخر اور استہزا کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ وہ ان کا ذِکر آزاد کھیم کرنی کے نام سے کرتے اور اُن کے لہجے میں تحقیر کا پہلو ہوتا۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ میلے کچیلے کپڑوں اور خستہ حالی میں دیکھا۔ وہ قابلِ رحم انسان تھے جنھیں دیکھ کر ترس آتا تھا۔ الف المحراث کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کہا کرتے تھے کہ یہ وقت سے پہلے پیدا ہو گئے ہیں۔

اِن کی خود ساختہ زبان میں کھردرا پن زیادہ ہوتا تھا۔ وہ درحقیقت لسانی بے راہ روی

کا شکار تھے۔ اُنھوں نے یہ خودساختہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کیوں کی، اس کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ذہانت کی باتیں کرتے جو دل کو بھلی لگتیں لیکن زیادہ تر وہ خبط کی سطح پر رہتے۔ وہ کئی باتوں کو مہمل، مبہم اور غیر واضح چھوڑ دیتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مثلاً اُردو حریفہ میکالے کے انتساب کو لے لیں مکرس۔۔۔آ کاح۔۔۔ر۔۔۔ا۔۔کو۔۔۔ یہ سب ایسے اشارے ہیں جو سر سے گزر جاتے ہیں۔ اُن کی اس کاوش کا مقصد کیا تھا یہ بھی واضح نہیں ہے۔''[۱۴]

••••

ہر چیز کو اُلٹ پلٹ کر دینے کی خواہش الف المحراث کی اُفتادِ طبع کا جزوِلا ینفک ہے۔ وہ عملِ تقلیب کے دیوانے ہیں اور تقلیبِ ترکیب کو ''ہنر'' کے طور پر آزماتے ہیں۔ انھیں لفظوں میں تبدیلی اور تصرف کرنے کا ''ملکہ'' حاصل ہے۔ لفظوں کے استعمال کے بارے میں جدت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ زبان نا قابلِ فہم، ادق اور مشکل بھی ہو جائے تو اُنھیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لفظوں کو ہیر پھیر کر نئے معنوی جہتیں تلاش کرنے کے شوق میں اِن سے بہت غلطیاں سرزد ہوئیں۔ اِن کا عملِ تقلیب بغیر کسی قرینے اور قاعدے کلیے کے ہے جس کے سبب سے بیشتر مقلب الفاظ اپنے معنی اور اصل صورت و شکل کھو بیٹھے ہیں۔

تقلیبِ ترکیب، اُردو زبان وادب میں، کوئی ممنوعہ قاعدہ نہیں ہے۔ ایسی درجنوں مقلب ترکیبیں ہماری روزمرہ اُردو کا حصہ ہیں جو اصول اور قاعدے سے تشکیل پائی ہیں مثلاً پیش لفظ، پس منظر، پیش منظر، سرِوَرَق، پس نوشت وغیرہ۔ یہ عملِ تقلیب سے پہلے لفظِ پیش، منظرِ پس، منظرِ پیش، وَرَقِ سر اور نوشتِ پس تھیں۔ الف المحراث جو واقعی ہل کا پھل ہیں، زبان کی زمین میں دھنس کر اُسے بے طرح تہس نہس کرنے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ ان کی تقلیبانہ مہارت کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ قوم ذی (ذی قوم)، شعور ذی (ذی شعور)، علمِ ذُو (ذُوعلم)، جلال ذُو (ذوالجلال) وغیرہ۔ الف المحراث اس قاعدے کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ذو اور ذی لاحقۂ فاعلی ہیں جو اسم سے پہلے آتے ہیں۔ انھیں اسم کے بعد میں لانے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

۲۔ اسود حجر (حجرِ اسود)، بعید رویت (ٹیلی وژن)، بعید صوت (ٹیلی فون)، صغیر صوت (مائکروفون)، قرطاس وزن (پیپر ویٹ)، تفویض تخم (باؤنڈری کمیشن)، حدیقہ دیہ (گارڈن پارٹی)، عجال امر

(آرڈیننس) وغیرہ۔ دوسری زبانوں سے اِصطلاحات کا ترجمہ کرتے ہوئے الف المحراث ترجمہ نگاری کے اصول وقواعد کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ ایسی کوشش میں یہ الفاظ اپنا معنی ومفہوم کھو دیتے ہیں۔

۳۔ الف المحراث کو وہم تھا کہ معروف کتبِ نثر میں لکھی گئی اُردو، درست نہیں ہے۔ یہ لسانی فروگزاشتوں سے بھری ہوئی ہیں لہٰذا انھوں نے اِن بڑے بڑے ادیبوں کی خبر لی، اُن کی تصانیف کو لسانی اعتبار سے غلط قرار دیا اور اِصلاح کے نام پر اُن کا لسانی پوسٹ مارٹم کر دیا:

ا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہورِ زمانہ ''غبارِ خاطر'' کو غلط قرار دے کر خود ''خاطر غبار'' کے نام سے پوری کی پوری کتاب کی اِصلاح کر کے رکھ دی۔

۲۔ مرزا غالب کی ''عودِ ہندی'' اور ''اُردوئے معلّٰی'' کا بھی تیا پانچا کیا اور اِصلاح کرتے ہوئے ''ہندی عوذ'' اور ''اعلیٰ اُردوٗ'' لکھ ماری۔

۳۔ سرسیّد احمد خاں کے سفر نامہ ''مسافرانِ لندن'' کی مقلوب صورت ''لندن مسافرین'' لکھی۔

۴۔ ڈپٹی نذیر احمد کی ''ابن الوقت'' کو ''وقت الابن'' کر دیا۔

۵۔ عبدالحلیم شرر کے ناول ''فردوسِ بریں'' اور ''زوالِ بغداد'' کی ''ابلیسی فردوس'' اور ''نالندہ بغداذ'' کے نام سے اِصلاح کی۔

۶۔ محمد حسین آزاد کی ''قصصِ ہند'' کو ''ہند قصص'' میں تبدیل کر دیا۔

۷۔ شبلی نعمانی کی ''سوانحِ مولانا روم'' کو ''زندگی نامہ رومی بلخی'' بنا دیا۔

••••

الف المحراث فارسی لفظ میں تصرف کر کے ''گی'' کے اضافے کی اختراع کے موجد ہیں۔ اس اختراع سے کچھ الفاظ میں تو خوشگوار معنوی جدت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بیش تر درست الفاظ قاعدے سے ہٹ کر بگاڑ کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً آگاہی، قرعہ اندازی، درشتی، درازی، یکسانی، لرزش، چیرہ دستی، پامالی، گریز، سنگ زنی، درستی، پُرسش، گمان، فراموشی، بسیاری، موشگافی، جاں فشانی، راستی، دل فگاری اور ناشناسی کی جگہ وہ آگاہیدگی، قرعہ اندختگی، درشتگی، درازگی، یکسانگی، لرزیدگی، چیرہ دستگی، پامالیدگی، گریختگی، سنگیدگی، درستگی، پرسیدگی، گمانیدگی، فراموشیدگی، بسیارگی، موشگافیدگی، جاں فشانیدگی، راستگی، دل فگاریدگی اور ناشناسیدگی لاتے ہیں تو یہ اِختراع لفظی ومعنوی بگاڑ پر منتج ہوتی ہے۔ اِس طرح کی کچھ اور مثالیں پریدگی، سائیدگی، گوش بریدگی، کاویدگی (کاوش)، آشردگی، کستگی، کپیدگی، کمیدگی، مالیدگی،

آشکاریدگی، گزیدگی، وازیدگی، چریدگی، دمیدگی، زدُودگی، خندیدگی، ورغلانیدگی، گواریدگی (گوارا)، خیزیدگی، سترِدگی، دہشیدگی، آزمودگی، پاشیدگی، کمیدگی، رنگیدگی، خفیدگی، ناپزیرفتگی (ناپزیری)، ناپدیدگی، آیندگی، خیزیدگی، شگافیدگی، فرستادگی، اِستادگی، لیسیدگی وغیرہ کی صورت میں ملتی ہیں۔ البتہ کچھ ساختہ الفاظ ایسے بھی ہیں جو طبعِ سلیم کو ناگوار نہیں گزرتے مثلاً شیرنوشیدگی (رضاعت) سرزدگی (ارتکاب)، پروانگی (اذن) وغیرہ۔

اپنی کتاب میں الف المحراث، شخصیات کے بارے میں بعض تاریخی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں مثلاً ''ہاجرہ'' لفظ کے تحت اُس کا معنی والدۂ ذبیح لکھا ہے جب کہ دوسری جگہ ''سارہ'' لفظ کے تحت اس کا معنی مادرِ ذبیح بتاتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ انھیں ذبیح کے بارے میں یہ واضح نہیں ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ ہیں یا حضرت اسحاقؑ۔ حقیقت میں ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہی ہیں جو حضرت ہاجرہ کے بطن سے تھے۔ اِسی طرح لفظ ''بُشرا'' کا معنی ایک جگہ ''مُنجیِ یوسفؑ (چاہ سے)'' لکھتے ہیں تو دوسری جگہ اِسی لفظ کا معنی ''وہ جس نے یوسف کو چاہ سے نکالا'' لکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''بشرا'' نامی کوئی شخص نہیں ہے جس کا حضرت یوسفؑ کے احوال سے کوئی تعلق ہو۔

قرآن پاک میں آتا ہے:

قَالَ یَا بُشْرٰی ھٰذا غُلامٌ۔[۱۴] ترجمہ: وہ بولا زہے قسمت یہ تو (نہایت حسین) لڑکا ہے۔

''سُدوم'' لفظ کے تحت لکھتے ہیں ''عہدِ لوطؑ کا ایک قاضی'' یہ معنی تاریخی اور واقعاتی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ سُدوم اُس قوم کا نام ہے جس کی طرف حضرت لوطؑ پیغمبر بن کر آئے۔

خودساختہ طرزِ اِملاء اختیار کرتے ہوئے ایسے لفظوں کو غلط لکھ جاتے ہیں جن کی متغیر صورت کو قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اللّٰہ کو الاّہ اور لہٰذا کو لہاذا لکھتے ہیں۔ یہ طرزِ اِملا اُردو میں کبھی رائج نہیں رہا ہے۔ اُنھوں نے اِملاء میں کچھ ایسی تبدیلیاں بھی کی ہیں جو حددرجہ مضحکہ خیز ہیں مثلاً حتی المقدور، حتی الوسع اور حتی الامکان کو حتا مقدور، حتا وسع اور حتا ممکن لکھتے ہیں۔ الف المحراث انبیاء کے ناموں میں بھی جی بھر کر تصرف کرتے ہیں جیسے عیسیٰ، موسیٰ اور یحییٰ کو عیسا، موسا اور یحیا لکھتے ہیں۔ بعض تبدیلیاں لفظ کو ذومعنی کر گئی ہیں مثلاً عظمیٰ کو عظما لکھتے ہیں۔ عظما پر اعراب نہ لگا ہوا ہو تو یہ عظیم کی جمع بھی سمجھی جا سکتی ہے۔

مصنف خودساختہ جمع بنانے کے بھی اِمام ہیں مثلاً غلطی کی جمع غلطات، محلّ کی جمع امحال، مہم کی جمع مہام، سہو کی جمع اسہا قاعدے کی رُو سے غلط ہیں۔

ارتاق (سمٹاؤ) کے ذیل میں دی گئی اِصطلاحات تقریباً تمام ہی اُس کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں اور زیادہ تر غیر واضح ہیں۔ان کی اپنی ساختہ کچھ ایسی اِصطلاحات بھی ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی آ جاتی ہے مثلاً خودنوشت آپ بیتی کے لیے ''حیات ذات تذکرہ''۔۔۔ بنک اسکوائر کے لیے ''سکّہ منقد''۔۔۔شکر بازار کے لیے ''مقند''۔۔۔'وہ جگہ جہاں انسان نہ پہنچا ہو' کے لیے ''غیر مسفر ارض''۔۔۔سمندری، زمین اور فضائی ڈاکوؤں کے لیے ''بحری سلّاب، برّی سلّاب، فضائی سلّاب''۔۔۔'وہ مرد جو رذیلہ سے منکوح ہو' کے لیے ''چپ دستہ کتخدائی''۔۔۔وہ رذیلہ جو کسی شریف سے منکوحہ ہو کے لیے ''راست دستہ کتخدائی'' وغیرہ۔ یہ حرفی اور لفظی تلخیص اور اِختصار اُردو زبان میں کہیں بھی رائج نہیں۔

افتاق (پھیلاؤ) کے باب کے ذیل میں بھی اِسی طرح کی بوالعجبیاں ہیں جو سب کی سب نہایت غیر واضح اور ساختہ اِصطلاحیں ہیں مثلاً جن سے حیوانات، جمادات اور نباتات۔۔۔پچد سے پرند، چرند اور درند۔ البتہ سول لائن کے لیے ''مدنی حد''۔۔۔ چھاؤنی کے لیے ''معسکر'' خوب، موزوں، دل چسپ اور قابلِ قبول ہیں۔

مضاد (متضاد) الفاظ کے ذیل میں بھی دل چسپ اور مضحک الفاظ نظر آتے ہیں مثلاً برّی کی بجائے برّانی، گرمی کے لیے تتاہٹ وغیرہ۔ البتہ مرثیہ کے لیے ''مرن گیت'' کی اِصطلاح خوش گوار اور مانوس جدّت ہے۔

تصحیح غلط امثال و محاورات کے ذیل میں مُصحّحہ ضرب المثل اور محاورہ اصل کا ساتھ نہیں دیتا مثلاً 'چوری اور سینہ زوری' کے لیے ''سرقہ و معرکہ''۔۔۔'حلوائی کی دُکان اور دادا جی کی فاتحہ' کے لیے ''دُکانِ قنّاد و قُلِ جد'' مضحکہ خیز ہیں۔ اس باب میں الف المحراث کی کوشش زبان کے چلن کے مخالف اور غیر متعلقہ نظر آتی ہے۔

''اُردو حریفۂ میکالے'' کے مطالعے سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ فاضل مصنف نے یہ ''لسانی تشکیل'' اُردو کے، کچھ نمونے کے جملے، ذہن میں رکھ کر کی۔ اس ضمن میں سرسیّد احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں اُن کے پیشِ نظر رہی ہوں گی۔

••••

الف المحراث کی اس کتاب میں مذکور عربی اور فارسی کے زیادہ تر الفاظ کو لغوی مصادر سے ثابت اور تلاش کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ کبھی اُردو میں استعمال ہی نہیں ہوئے۔ عربی الاصل لفظ کا معنی فارسی

اور ہندی میں دیا جائے تو یہی تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ اُردو کی نہیں، عربی، فارسی اور ہندی کی لغت ہے۔ مصنف کو جتنی اور جس طرح کی عربی، فارسی اور ہندی آتی تھی وہ سب کی سب اُس نے اپنی اس ''لغت'' میں شامل کر دی ہے۔

مصنف لفظ کے اُردو میں مستعمل معنی کو چھوڑ کر غیر مانوس معنی روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ کے اِنتخاب اور معنی کے تعین میں اِبہام اور اُلجھن کا شکار رہتا ہے۔ لفظوں کو ہیر پھیر کر ساختہ معنوی جہتیں روشناس کرانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مصنف نے کہیں کہیں الفاظ کے سامنے، لفظ کے عربی، فارسی اور ہندی ہونے کی علامت لگائی ہے۔ اصولی طور پر یہ ہر لفظ کے سامنے ہونی چاہیے تھی۔ اِعراب کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ یہ بہت ضروری تھا، تا کہ فاعل، مفعول، جمع، مصدر، اسمِ ظرف اور دیگر کا تعین ہو سکے مثلاً کتاب میں ایک لفظ ''مصید'' بغیر اعراب کے دیا گیا ہے جو اصل میں مُصَیَّد ہے جو اسم مفعول ہے جس کا معنی ہے شکار کیا گیا۔ اُردو میں اس کا معنی مصنف نے شکر دہ (شکار کیا ہوا) لکھا ہے جو ان کا اپنا ساختہ ہے۔

کتاب میں ایسی مثالیں کم نہیں ہیں کہ دیا گیا لفظ بہت آسان ہے لیکن اس کا بتایا گیا معنی بہت مشکل اور غیر مانوس ہے مثلاً لاش کا معنی کتاب میں جیفہ درج کیا گیا ہے جو عربی الاصل ہے۔ اُردو میں مستعمل لفظ '' مُردار'' لاش کا بہترین متبادل ہے۔ لب کے معنی شفت درج کیے گئے ہیں اور شفت بھی عربی لفظ ہے حالانکہ لب کا مترادف اُردو میں ہونٹ ہے۔ مصنف لفظ کے معنی کا تعین کرتے ہوئے کئی موقعوں پر ذُو معنویت کا مظاہرہ کر گئے ہیں مثلاً اِنہزام کا معنی ہار مندرج ہے۔ مصنف کے پیشِ نظر ہار سے مراد شکست ہی ہے، مگر وہ چُوک گئے کہ ہار ذو معنٰی لفظ ہے۔ اس کا معنی شکست بھی ہے اور گلے کا ہار بھی۔

لفظ کے اِنتخاب اور اس کے معنی کے تعین میں مصنف سے کئی فروگزاشتیں سرزد ہوئیں مثلاً قتع کا معنی کاٹ لکھا ہے، جب کہ اس معنی کے لیے لفظ قطع ہے۔ قتع ایک الگ لفظ ہے جس کا معنی 'ذلیل ہونا' ہے۔ ''غایت'' کا معنی پرچم درج کیا گیا ہے جب کہ اس کا معنی غرض اور اِنتہا ہے۔ رایت کا معنی جھنڈا ہے غایت کا نہیں۔ اس لغت میں ایسے لفظ بھی بکثرت ملتے ہیں جن کے معنی لفظ کے مادے سے غیر متعلق ہیں مثلاً اسمع کا معنی سراسیمہ دیا گیا ہے۔ سمع (س م ع) کے مادے میں سراسیمگی کا کوئی معنی نہیں ہے، اس مادے سے سماعت، سمیع، سامع، سماع، سماعی وغیرہ ہے۔

کچھ منتخب الفاظ ایسے پیش کیے جاتے ہیں جن کے دیے گئے معنی کے ساتھ اتفاق کرنا مشکل ہے:

الفاظ	کتاب میں دیئے گئے معنی	اُردو میں رائج معنی
سان	رسم ورواج	اُردو میں سان دھار تیز کرنے والے پتھر کو کہتے ہیں۔
شان	کام	اُردو میں اس کا معنی عزت، دبدبہ اور طاقت ہے۔
صحت	درستگی	درستگی نہیں بلکہ تن درستی ہے۔
عُمران	آسودگی	آبادی اور معاشرت سے متعلق جیسے علم العمران یعنی آبادیات اور معاشریات کا علم۔
تحکیم	مداخلت	اس کا معنی ''فیصلہ کرنا'' ہے۔ لفظ اور معنی کا آپس میں کوئی لغوی اور معنوی تعلق نہیں ہے۔
تاختہ	مخمّلہ	فارسی لفظ کا معنی عربی میں ہے۔ لطف کی بات ہے کہ ان دونوں لفظوں کا اُردو میں استعمال نہیں ہے۔
غِیبت	ضد حضارت	اُردو میں مستعمل معنی ''پیٹھ پیچھے کی بدگوئی'' ہے البتہ غَیبت کا معنی غیر موجودگی ہے۔
فاتر	نیم گرم	اُردو میں کمزور، سست اور خراب کو کہتے ہیں جیسے فاتر العقل۔
مَبلَغ	کُل	یہ اسمِ ظرف ہے جس کا معنی ہے پہنچنے کی حد۔
مجموعہ	بٹورنا	جمع (ج م ع) کے مادے سے یہ مفہوم بعید از قیاس ہے۔
معانقہ	گلا لپٹ	بابِ مفاعلہ سے معانقہ کا معنی ہے دو آدمیوں کا گلے ملنا۔
مُتعلِّم	وہ جو تعلیم دیتا ہو	تعلیم دینے والا مُعلِّم ہوتا ہے جب کہ مُتعَلِّم تعلیم حاصل کرنے والے کو کہتے ہیں۔
مَو رِد	پونجی	یہ ظرفِ مکاں ہے جس کا معنی ہے وارِد ہونے کی جگہ۔
اسر	زندگی ٔزنداں	قید خانے کی زندگی کے لیے اُردو میں اَسارت اور اسیری دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔
مشیر	وہ جو اِشارہ کرتا ہے	اُردو میں مشیر مشورہ دینے والے کو کہتے ہیں۔

قیامت	سرپرستی	مادے سے ہٹ کر معنی ہے۔لغوی مصادر میں اس معنی کا وجود نہیں ہے۔ایسی بوالعجبیاں دیکھ کر قاری چکرا جاتا ہے۔
ازیز	کھدبداہٹ	یہ دونوں لفظ لغوی مصادر سے دستیاب نہیں ہو سکے۔معنی کا مترادف بھی دینا چاہیے تھا۔
اِستار	ایک متروک عربی وزن	اُردو کی لغت میں اسے شامل کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔
عصامی	خودساختہ	عصم (ع ص م) کے مادے سے یہ معنی بھی خودساختہ ہے۔
اِصرار	بوجھ	اُردو میں ''ضد کرنے'' کو کہتے ہیں۔
اَشعار	دوہا	اشعار شعر کی جمع ہے جب کہ دوہا شاعری کی ایک صنف ہے۔
اعالت	موناک	لفظ اور معنی دونوں ہی اُردو بان میں نادرالوجود ہیں۔
اِنتساب	لگاؤ	مُعنوَن کرنا، کسی کے نام کرنا۔
عیّار	آوارہ	آوارہ نہیں بلکہ اس کا معنی چالاک ہے۔
ایثار	چڑھاوا	اپنی ضرورت پر کسی کی ضرورت کو ترجیح دینا۔قربانی کا جذبہ۔
اِستعفاء	تیاگ	ذمہ داری سے سبکدوش ہونا۔
بط	اددردک	لفظ اور معنی، دونوں اُردو میں مستعمل نہیں۔
بَرَکہ	تلیّا	اُردو طرزِ املا میں یہ لفظ برکت ہے۔
بصّاص	بھیدیا	لفظ اور معنی، دونوں اُردو میں مستعمل نہیں ہیں۔
پاس	تین گھنٹوں کا وقفہ	لحاظ، پاسداری۔
عجم	استعمالِ نقاط	اس کا معنی ''غیر عرب'' ہے۔
ثقل	دُرد(تلچھٹ)	بوجھ اور گرانی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
تَوَسُّل	اِلتجا	توَسُّل میں وسیلے کے حصول کا تصوّر ہے اِلتجا کا نہیں۔
سرِیّہ	کنیز برائے جماع	سریّہ کا یہ مفہوم بوالعجبی ہے۔سریّہ وہ معرکہ ہوتا ہے جس کے لشکر کو آپ ﷺ نے بھیجا ہو لیکن خود شمولیت نہ فرمائی ہو۔

آل	بنس	اِن دونوں لفظوں کا آپس میں کوئی معنوی تعلق نہیں۔
آمادگی	فراہمی	// // // // // //
اِمالہ	تبدیلیِ حرفِ علّت	اِمالہ میل سے ہے یعنی مائل کرنا، جھکانا۔ قواعد کے مطابق الف کا ی کی طرف اور زبر کا زیر کی طرف جھکنا۔
عُملہ	بدکاری	لفظ کے مادے سے ایسا کوئی معنی نہیں نکلتا۔ یہ لفظ اُردو میں مستعمل بھی نہیں۔
قتل	بلندی، دستور	کسی کو جان سے مار دینا۔
نُزہت	اَنگ	تروتازگی، پاکیزگی اور خوشی۔
وبال	ناتوانائی	عذاب، آفت، مصیبت۔
واجب	درکار	ضروری، لازِم اور لائق۔
وجیہہ	قابلِ ذکر	اصل میں وجیہ ہے بمعنٰی خوش شکل اور خوبصورت۔
خامہ	لیکھنی	لیکھنی ساختہ اور غیر مانوس لفظ ہے۔ قلم ہی رواں اور مانوس لفظ ہے۔
رُف	کمیدگیِ زیریں لبِ زن	ترکیب در ترکیب جو اُردو میں غیر مانوس ہے اور سمجھنا مشکل ہے۔
رقش	بسیار رنگیدگی	لفظ اور معنی دونوں اُردو میں مستعمل نہیں۔
ریاح	باد۔وایو	یہ کیسی اُردو ہے کہ عربی لفظ کا معنی فارسی اور ہندی میں لکھ دیا گیا لیکن اُردو میں مستعمل لفظ ''ہوا'' لکھنا گوارا نہیں کیا۔
رجم	سنگیدگی	اُردو میں سنگ زنی مستعمل ہے۔
سالِک	گُرو	لفظ اور دیئے گئے معنی میں کوئی تعلق نہیں۔
تعویز	جنتر	جنتر جادو ٹونے کے معنوں میں آتا ہے جب کہ تعویز کے اُردو میں معنے ہیں اللہ کی پناہ میں آنا یا گلے میں پہننے والی چاندی یا چمڑے کی چھوٹی سی ڈبیا جس میں دفعِ شر کے لیے کوئی تحریر ہوتی ہے۔

عقّار	دارو	عقّار عربی لفظ ہے جو قواعد کے اعتبار سے اسمِ مبالغہ ہے۔اس کا معنی ''کاٹنے والا'' کے ہیں۔دارو اور عقار کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔
غبن	فراموشیدگی	خیانت،خورد بُرد۔
غُل	پیاس	شور اور ہنگامہ۔
غوث	فریاد	فریاد کو پہنچنے والا،مدد کرنے والا۔
مباشر	والنٹیر	یہ لفظ مباشرت سے ہے یعنی مباشرت (جماع) کرنے والا۔
قمِل	شپشناک	قمل عربی لفظ ہے جس کا معنی جُوں ہے۔شپشناک کسی بھی اُردو لغوی مصدر سے ثابت نہیں۔
ہُریرہ	بلّی	بلّی نہیں بلکہ بلّی کا بچہ۔یہ اسمِ تصفیر ہے۔
حسّان	دانا	حسّان کا معنی ''بہت خوبصورت'' ہے دانا ہرگز نہیں۔ یہ اسمِ مبالغہ کا صیغہ ہے۔
عراضہ	ضیف سے تحفہ	یہ معنی غیر واضح ہے۔غراضہ کا معنی ہے وہ ہدیہ جو سفر سے آنے والا شخص صاحبِ خانہ کو پیش کرتا ہے۔مہمان کے لیے اُردو میں ضیف کا اِستعمال شاذ ہے۔البتہ اِسی مادے سے ضیافت عام لفظ ہے جو دعوت کے لیے مستعمل ہے۔
ہاشم	معرفہ اسم	ہاشم کا معنی ہے گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگونے والا۔

''اُردو حریفۂ میکالے'' میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کے معانی بہت موزوں، خوب، برمحل اور قابلِ قبول ہیں مثلاً سبب (کارن)، سکّہ (آلۂ بیع وشرا)، مصرف (جائے خرچ)، ہزّال (ٹھٹھولیا)، باڈی گارڈ (محافظ شخص)، میڈیکل بورڈ (طبی مجلس)، وائسرائے (نائب سلطان)، مارشل لا (عسکری قانون)، سول لا (مدنی قانون)، بندر (ساگر منڈی)، ثقافت (دیس ریت)، جاسوس (راز جُو)، اِذن (پروانگی)، عاصی (پاپی)، عشوہ (پریم چال)، ماخذ (جائے یافت) وغیرہ۔

کچھ الفاظ اور اِصطلاحات ایسی بھی نظر آئیں گی جن کے معنی دیکھ اور پڑھ کر ہنسی چھوٹ جاتی

ہے مثلاً ڈاکیا (چھٹی بانٹو)، ٹونٹی دار لوٹا (ٹوئنٹیلا لوٹا)، تاروں بھری رات (نجمی لیل)، یارِ وفادار (وفی صدیق) وغیرہ۔

''اُردو حریفۂ میکالے'' پر نقد و تجزیہ کے لیے اچھا خاصا وقت درکار ہے۔ خدا لگتی بات ہے کہ ہر ہر لفظ اور اس کے معنی کو اس کے مادے اور اشتقاق کے تناظر میں پرکھنا پی ایچ۔ڈی کی سطح کا کام ہے۔ الف المحراث کے لسانی اور لغوی اجتہاد سے اِختلاف کے باوجود یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ مصنف عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے فاضل ہیں۔ انھوں نے بہت محنت اور جگر کاوی سے اپنی اس کتاب کو قابلِ قدر بنایا۔ بڑی سطح پر کیے گئے کام سے اختلاف ہونا کام کی اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتا ہے۔ اِختلاف بُرا رویہ نہیں ہے، اِسی سے فکر و نظر کی راہیں کھلتی ہیں۔ اِختلاف نہ ہو تو یہ سمجھ لیا جائے کہ لوگوں نے لکھنا اور پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔

راقم السطور، اس کتاب کا ناقدانہ جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ عربی، فارسی اور ہندی سے نابلد اُردو داں طبقے کے لیے اس کتاب کی نہ تو کوئی افادیت ہے اور نہ ضرورت۔ البتہ وہ اہلِ علم جو لغت اور لسان شناسی کا شوق رکھتے ہیں، لسانی تقابل کے تناظر میں اس کتاب میں ان کے لیے بہت کچھ ہے۔

زبان کے کسی اصول پر، یہ کتاب پورا نہیں اُترتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی یہ متبادل صورت حد سے زیادہ غیر مانوس اور ناقابلِ استعمال ہے۔ الف المحراث نے زبانِ اُردو کی ساخت و پرداخت کے ضمن میں اپنی طرف سے پُرخلوص محنت کی ہے لیکن اس نئی لسانی تشکیل میں وہ زبان کے بارے میں بنیادی باتیں فراموش کر گئے ہیں۔ اُن کی اس کوشش پر ڈاکٹر اسلم انصاری اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''کوئی بھی زبان مطلق نہیں، ہر حال میں اضافی (Relative) اور ثقافتی صورتِ حال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بلکہ بالفاظِ دیگر ہر زبان کسی خاص ثقافت کا لسانی مظہر ہوتی ہے۔ زبان کی حیثیت کسی معاشرے کے من مانے اِتفاقِ رائے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی بھی محقق ثابت نہیں کر سکتا کہ کسی زبان کے اصول و قواعد پر کسی سماج کا اِتفاق کب ہوا۔ زبان میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں زبانیں ارتقائی سفر طے کرتی ہیں۔ اِسی تغیر کے نتیجے میں زبانیں بوجوہ

زوال پذیر ہوتے ہوتے مٹ بھی جاتی ہیں جیسا کہ پاکستان کے شمالی علاقے کی بعض زبانیں مٹ چکی ہیں یا مٹتی جا رہی ہیں۔ اِسی اصول کے نتیجے میں بعض زبانوں کو معرضِ خطر میں قرار دے دیا گیا ہے۔ زبان کے بارے میں کچھ اور حقائق پر مبنی اصولی باتیں بھی ہیں جنھیں پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نتیجے کا حصول ناگزیر ہے کہ زبانیں اِنفرادی یا اجتماعی اِرادے اور شعوری اِتفاقِ رائے سے تخلیق نہیں کی جاسکتیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض خاص گروہوں اور پیشہ وروں کی ایک گروہی اور خفیہ زبان بھی ہوتی ہے جسے عموماً اِصطلاحاتِ پیشہ وران سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن وہ بھی مرورِایّام سے وجود میں آتی ہے اور زبانوں کے مرکزی دھاروں سے ہمیشہ الگ رہتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات معدوم بھی ہو جاتی ہے۔'' [۱۶]

''اُردو حریفۂ میکالے'' تصنیف کرنے کی غرض و غایت کیا تھی؟ خود الف الحراث کا ذہن اس بارے میں مبہم اور غیر واضح ہے۔ کتاب کے مطالعے سے کسی حد تک اُن کے اِرادے اور نیت کا سراغ مِل جاتا ہے کہ وہ اپنی ساختہ زبان کی ترویج چاہتے تھے۔ اِس کوشش میں وہ خلطِ مبحث کا شکار ہو گئے اور پے در پے اُن سے غلطیاں سرزد ہوتی گئیں۔ لفظوں کی توڑ پھوڑ کے بعد، جو زبان اُنھوں نے بنائی۔۔۔ بہت ثقیل، غیر مانوس اور غریب ہے۔ وہ زبان کے اصول اور چلن کے فلسفے کو نہ سمجھ سکے۔ ثقالت اور غرابت کو عیب گردانے کی بجائے ہنر مان بیٹھے اور اس حقیقت کا اِدراک نہ کر سکے کہ اِن کی ساختہ زبان اِبلاغ سے مکمل طور پر عاری ہے۔ جو زبان اِبلاغ اور چلن کا ساتھ نہ دے سکے، رواج پذیر نہیں ہو سکتی جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ ''اُردو حریفۂ میکالے'' کی وجہ تسمیہ کی بابت مرتّبِ کتاب ڈاکٹر سعید احمد نے مورخہ ۱۷/اپریل ۲۰۲۱ء کو واٹس ایپ کے ذریعے راقم السطور کو بتایا:

''الف الحرا ث کا اپنا قلمی نام ہی عجیب نہیں اُس کے کام بھی غریب ہیں۔ اُس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا اِسمیاتی نظام (Nomenclature) بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ مطبوعہ کتاب ''خاطرِ غبار'' کی طرح تمام غیر مطبوعہ کتب کے نام تقلیب و تحریف کا خوب نمونہ ہیں۔ ''اُردو حریفۂ میکالے'' میں صورتِ حال اور بھی مختلف ہے چونکہ یہ کتاب 'انگریزی خط پر' تجنیسِ صوتی کے اُصول پر ترتیب دی گئی ہے اس لیے اُردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ نام میں موجود لفظ ''میکالے'' توجہ طلب ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برِصغیر میں انگریزی نظامِ تعلیم لارڈ میکالے کا منصوبہ یا 'تحفہ' ہے۔ لارڈ میکالے مغربی تعلیم و فلسفے کے حامی اور اُردو اور دیگر مشرقی علوم کے سخت مخالف تھے۔ اِس کے برعکس الف الحرا ث السنۂ شرقیہ کے دیوانے اور دلدادہ تھے اور اُردو کو انگریزی کا حریف سمجھتے تھے۔ محمد کاظم نے ''اُردو حریفۂ میکالے'' کا ترجمہ Urdu the Rival of English کیا ہے۔ میری ناقص رائے میں یہاں ''میکالے'' سے مراد انگریزی ہے۔ زبانیں چونکہ مؤنث ہیں اِس لیے حریف کی بجائے حریفہ کہا ہے۔ تو ''اُردو حریفۂ میکالے'' کا مطلب ہوا اُردو جو انگریزی کی حریف اور ہم پلّہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۔ الف الحراث مصنف کا قلمی نام ہے جو اُن کی جدّتِ طبع کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس قلمی نام کے معنی ''ہل کا پھل'' یا بہ زبانِ انگریزی Alpha of the Plough ہیں۔ الف الحراث کا اصل نام ممتاز انصاری تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی استعداد میٹرک تھی۔ بعد ازاں اپنے شوق سے کئی زبانوں میں مہارتِ تامہ حاصل کر لی۔ ممتاز انصاری وزارتِ دفاع کے ذیلی محکمے پاکستان ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کرتے رہے جہاں انھیں اُردو کے مشہور شاعر عبدالحمید عدم کی سرپرستی اور رفاقت میسر رہی۔ ۱۹۵۹ء میں صدر ایوب کے دورِ حکومت میں ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ الف الحراث آزاد منش تھے۔ ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ بیوی بچوں اور گھر گرہستی کے جنجال سے یکسر آزاد رہے۔ مالی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے لیکن کبھی کے سامنے دستِ طمع دراز نہ کیا۔ تھوڑی سی پنشن کی رقم اور کتابوں کی یافت سے گزر بسر کرتے رہے۔

۳۔ ڈاکٹر سعید احمد، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں، صدرِ شعبۂ اُردو ہیں۔ معاصر ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ سائنس، فلسفہ اور نفسیات کا بھی انھیں گہرا شعور ہے۔ ''داستانیں اور تصوّرِ خیر و شر''،

''داستانیں اور حیوانات''، ''پرطاؤس''، ''رسالۂ چہاریہ''، ''گریہ بر کنارِ دریا''، ''نامہ نامی نظمیں''، ''مقطعے مطالعے'' اور ''اُردو شعراء کا سائنسی شعور'' اِن کی قابلِ قدر تصانیف ہیں۔

۴۔ الف المحراث، اُردو حریفۂ میکالے، مرتب: ڈاکٹر سعید احمد (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۲۰ء)، ص ii۔iii

۵۔ ایضاً، ص v

۶۔ ایضاً، ص xiv

۷۔ لارڈ میکالے (۱۸۵۹ء۔۱۸۰۰ء) انیسویں صدی کا برطانوی سیاست دان اور مسلّمہ ادیب جس نے برصغیر میں فارسی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم ختم کر کے انگریزی کو لازمی طور پر ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ اسے برصغیر میں انگریزی زبان اور تہذیب و ثقافت کے فروغ میں اہم کردار کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

۸۔ اُردو حریفۂ میکالے، ص ۴

۹۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ۹ مئی ۲۰۲۱ء کو ای میل کے ذریعے راقم السطور کو یہ رائے لکھ کر بھیجی۔

۱۰۔ اُردو حریفۂ میکالے، ص iv

۱۱۔ ایضاً، ص iv

۱۲۔ ناصر زیدشہر زندہ دلاں کی دل چسپ شخصیتیں، بحوالہ اُردو حریفۂ میکالے، ص i

۱۳۔ ۲۶/اپریل ۲۰۲۱ء کو ڈاکٹر اسلم انصاری نے بذریعہ فون الف المحراث کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

۱۴۔ محمد احسن خان نے ۲۰ مئی ۲۰۴۱ء کو بذریعہ فون راقم السطور سے الف المحراث کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور اُن کے بارے میں اپنا تاثر ریکارڈ کروایا۔

۱۵۔ سورۃ یوسف: ۱۹

۱۶۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے ۹ مئی ۲۰۲۱ء کو ای میل کے ذریعے راقم السطور کو یہ رائے لکھ کر بھیجی۔

اُردو، ہندی اور ''ہندوستانی''—— پروفیسر عبدالستار دلوی کا نقطۂ نظر

(غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

زبان اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔[۱] انسانی شخصیت میں یہ ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان ہی وہ خاص صفت اور صلاحیت ہے جو انسان کو دوسرے جانداروں سے الگ اور ممتاز کرتی ہے۔ اسی لیے انسان کی منطقی تعریف ''حیوانِ ناطق'' قرار دی گئی ہے۔ زبان، انسان کا ثقافتی تلازمہ ہے۔ یہ انسان کے سماجی، نفسیاتی اور تخلیقی تجربات و معاملات کی آئینہ دار و آئینہ گر ہوتی ہے۔ زبان بنیادی طور پر اظہار و ترسیل، تفہیم و تشریح اور نشر و اشاعت کا سب سے مؤثر اور فطری آلۂ کار ہے۔ ایک زندہ زبان کسی نہ کسی طور سے بدلتی ہوئی صورتوں کا اشاریہ بھی ہوتی ہے۔ زبانوں میں تغیر کا اصول بنیادی تصور کیا گیا ہے، یعنی زبان کوئی بھی ہو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن چوں کہ یہ تبدیلی اتنی آہستہ ہوتی ہے کہ بوقتِ وقوع اس کا پتا نہیں چلتا لیکن جب یہ تبدیلی محسوس حد تک ظہور پذیر ہو چکتی ہے تو ماہرینِ زبان اس تبدیلی کو علمی اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہر زبان کے ساتھ متعلقہ قوم کی تہذیب، تمدن، تاریخ اور روایات وابستہ ہوتی ہیں۔ مذہب، معاشرت اور زبان کے لحاظ سے برعظیم پاک و ہند دنیا کا ایک مخلوط خطہ ہے۔ اس اعتبار سے کثیر لسانی معاشرے میں لسانی، مذہبی اور معاشرتی نزاعات کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ برعظیم پاک و ہند کی ہزار سالہ تاریخ ایسے نزاعات سے مملو ہے۔ اُردو کے تحفظ اور اس کی پرورش میں اگرچہ مسلمانوں کا کردار کلیدی حیثیت کا حامل رہا ہے مگر دیگر اقوام کا بھی کسی نہ کسی طور سے اس کی پرداخت میں حصّہ ہے۔ رتن ناتھ سرشار، مالک رام، نول کشور، منشی پریم چند، ہری چند اختر، تلوک چند محرومؔ، پنڈت دیا شنکر نسیم، سری رام، پنڈت برج نارائن چکبست، پنڈت برج موہن کیفی دتاتریہ، کرشن چندر، رام بابو سکسینہ، منشی تیرتھ رام فیروز پوری،

دیوان سنگھ مفتون، فراق گورکھپوری، گیان چند، آنند نرائن ملاؔ، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مسز سروجنی نائیڈو کی اردو زبان و ادب کے بارے میں خدمات سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے؟ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے بڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لئے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے وقتاً فوقتاً استعمال بھی کیا ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم اُردو کو اپنے خیالات کے اظہار کا بھرپور اور مؤثر وسیلہ بنایا۔

اُردو دنیا کے علمی اور ادبی حلقوں میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا نام اور کام اپنی بھرپور پہچان رکھتا ہے۔ اُن کی لسانی اور ادبی کاوشوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ معروف لسان شناس اور نامی ادیب اُن کی محبت اور اُن سے تعلق کا دم بھرتے ہیں۔ اُن کی وقیع علمی، ادبی، لسانی، تدریسی اور انتظامی خدمات گزشتہ صدی کے آخری چار اور موجودہ صدی کے پہلے دو عشروں کی فضائے ادب پر چھائی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پندرہ سال (۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۲ء) بانی ڈائریکٹر مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر ممبئ (انڈیا) رہے۔ پندرہ سال (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۷ء) ممبئ یونی ورسٹی ممبئ (انڈیا) میں کرشن چندر پروفیسر اور صدر، شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۲۰۰۷ء سے تا حال انجمنِ اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئ (انڈیا) سے ڈائریکٹر کے طور پر وابستہ ہیں۔ راقم سے ان کا رابطہ فون اور خط کتابت کے ذریعے دو سالوں سے مسلسل قائم ہے۔ ہماری گفتگو اور خط کتابت کا مرکزی موضوع اُردو لسانیات ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی متنازع کتاب ''ایک بھاشا...... دو لکھاوٹ، دو ادب'' منظر عام پر آئی تو اُردو سے محبت رکھنے والے ادیبوں نے اس کے جواب میں بہت کچھ لکھا۔ ڈاکٹر دلوی صاحب نے ردِّ عمل کے طور پر ''دو زبانیں، دو ادب'' لکھی تو پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی) نے اس کتاب پر تبصرے میں ''ہندوستانی'' کے بارے میں اپنی رائے دی۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ (علی گڑھ) نے ایک خط کے ذریعے ڈاکٹر پاریکھ صاحب کی رائے کو سراہا۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور کے تحقیقی مجلّے ''صحیفہ'' [۲] میں یہ خط شائع ہوا تو راقم اور دلوی صاحب کے مابین ''ہندوستانی'' کے تعارف، پس منظر اور اس کی بابت اُن کے نقطۂ نظر پر ہماری گفتگو بذریعہ فون اور خط کتابت دراز ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے راقم سے درجنوں مرتبہ ٹیلی فون پر تفصیلی گفتگو کرنے کے علاوہ چھے خطوط بھی لکھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ چودہ مشاہیرِ ادب کے اپنے نام لکھے گئے بائیس غیر مطبوعہ خطوط بھی بھیجے جن کا زمانۂ تحریر گزشتہ صدی کا ساتواں، آٹھواں اور نواں عشرہ ہے۔ ان غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی

میں، دلوی صاحب کے بارے میں، مشاہیرِ ادب کی کچھ آراء پیش کی جاتی ہیں:

معروف ماہرِ لسانیات رشید حسن خان:

''آپ ہندوستان کے اور اُردو کے سفیر ہیں جو خیر سگالی کے جذبات کو مشرق میں پھیلا رہے ہیں، مصر سے ترکی تک۔ یہ شرف کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے، اور یوں کم آتا ہے کہ کم اور بہت کم لوگ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔'' [۳]

''آرام کرنا آپ کے مزاج میں شامل نہیں اور کام کرنا طبیعت کا جز ہے، یوں سکون تو آپ کے یہاں گویا حرام ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آپ نے نیک نامی کے ایسے اور اتنے مرحلے بخوبی طے کیے ہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔'' [۴]

پروفیسر مسعود حسین خان:

''کچھ دنوں قبل آپ کی فاضلانہ تصنیف 'اُردو زبان اور سماجی سیاق' دست بدست مجھ تک پہنچی۔ شوق سے پڑھی۔ حسبِ معمول اُسے آپ کی لسانی معاملات میں گہری بصیرت کا غماز پایا۔ آپ لسانی مسائل پر توازن کے ساتھ لکھتے ہیں اور جذبات کی رَو میں نہیں بہہ جاتے۔ متعلقہ مواد تک آپ کی دسترس رہتی ہے۔'' [۵]

''آپ کی تازہ تصنیف 'دو زبانیں، دو ادب' کا ایک نسخہ ہم دست ہوا۔ بینائی کی کمزوری کے باوجود اسے پڑھتا چلا گیا، خوب پایا، کیا بہ اعتبارِ انشا، کیا بہ اعتبارِ تحقیق اور کیا باعتبارِ وسعتِ نظر! آپ کو یہ سہولت حاصل ہے کہ ہندوستان کی آریائی زبانوں کے روابط پر (مراٹھی جاننے کی وجہ سے) گہری نظر ہے۔ اس سے قبل بیگ صاحب [۶] کا کتابچہ اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی نکتہ بہ نکتہ جواب دیا ہے 'مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی'۔ اس بارے میں آپ کی وسعتِ نظر بہت زیادہ ہے۔ کاش مرحوم گیان چند جین اسے پڑھ سکتے۔'' [۷]

ڈاکٹر رفیق زکریا:

''آپ کا کام ہمیشہ پختا [پختہ] ہوتا ہے۔ آپ سھی [صحیح] معنوں میں Researcher ہیں۔ ترجمہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دونوں زبانوں پر عبور ضروری ہے۔ آپ اُردو اور مراٹھی کو نہ صرف جانتے ہیں بلکہ دونوں میں ماہر ہیں۔'' [۸]

عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی (برادرِ اکبر خلیل الرّحمٰن اعظمی):

''آپ کی ذات سے مجھے جو اُنس اور لگاؤ رہا اور آپ نے میرے ساتھ جو شریفانہ اور ہمدردانہ رویہ رکھا اُس کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میری علمی ترقی اور شہرت میں آپ کی حوصلہ افزائی کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔''[۹]

صفدر آہ:

''کل آپ کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اتنا اچھا 'خسرو نمبر' بمبئی سے نکال سکیں گے۔ رسالے کی ادارت میں آپ کا نامِ نامی اصولاً اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ لیکن اس رسالے کا معیار میرے اندازے سے بھی کہیں زیادہ بلند ہے۔''[۱۰]

مشفق خواجہ:

'''ذکر اِیڈ نبرا' میرے لیے نئے سال کا خوب صورت تحفہ ہے۔ ایک تو نسیم ایزا کیل کی اصل نظمیں دامن کشِ دل ہوئیں اور دوسرے آپ کے تراجم کی نغمگی نے مسحور کیا۔ شاعری کا ترجمہ اور پھر وہ بھی منظوم، بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل مرحلے سے آپ بڑی خوش اسلوبی سے گزرے ہیں۔ میں نے پہلے اصل نظم پڑھی اور پھر آپ کا ترجمہ۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اصل نظم کون سی ہے اور ترجمہ کون سا؟ یہ کسی بھی ترجمے کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اصل کے محاسن کو اپنے دامن میں سمیٹ لے۔''[۱۱]

راقم کے نام لکھے گئے چَھے خطوط میں جہاں لسانی اور ادبی معاملات کے ضمن میں راہ نمائی ملی وہاں راقم نے اُن کے مذاقِ طبیعت اور افتادِ مزاج کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب سراپا انکسار، وضع دار، رواداری برتنے والے اور اختلافِ رائے کرنے والے کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اختلاف رائے کا جواب ادب اور احترام کا دامن چھوڑے بغیر...... متانت، سلیقے، حد درجہ احتیاط اور تہذیب سے دیتے ہیں۔

۲۹/جنوری ۲۰۱۸ء کو میرے نام لکھے گئے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

''انسان ہمیشہ علم کے مقابلے میں چھوٹا ہی رہتا ہے۔ علم کی بلندیوں تک پہنچنا انسان

کے لئے ممکن نہیں۔ آپ کی تصانیف بہت ہی سنجیدہ موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج کل سنجیدہ موضوعات سے لوگ دور بھاگتے ہیں اور جب قریب آتے ہیں تو سرقے کا بازار لگا دیتے ہیں۔ دوسروں کی بیساکھی کے سہارے چلنا گھاٹے کا سودا ہے۔'' [۱۲]

۲۹ / مارچ ۲۰۱۸ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''یہ چند سطریں آپ کے سوال کی وضاحت کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ علمی بحثوں میں اختلاف پائے جانے کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔'' [۱۳]

پروفیسر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ (سابق صدر، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)

ڈاکٹر دلوی صاحب کی کتاب ''دو زبانیں، دو ادب'' پر رائے دیتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ کو ۱۶/ اکتوبر ۲۰۰۸ء میں لکھے گئے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''عبدالستار دلوی صاحب کی کتاب پر تبصرے کے دوران آپ نے 'ہندوستانی' کے بارے میں بہت اچھی بات کہی ہے جس سے میں متفق ہوں۔ 'ہندوستانی' کا قلع قمع ہو چکا ہے لیکن دلوی صاحب اور اُن جیسے لوگ اب بھی اس کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ یہاں کے عصری تناظر میں زبان یا تو اُردو ہے یا ہندی۔ 'ہندوستانی' نام کی کوئی زبان اب اپنا وجود نہیں رکھتی۔'' [۱۴]

ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب اقتباسِ بالا کی بابت یکم اپریل ۲۰۱۸ء میں مجھے لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

''علمی معاملات میں اختلافِ رائے ہوسکتا ہے، انکار نہیں کیا جا سکتا اور رایوں میں اختلاف کا احترام ضروری ہے۔ لیکن اختلافِ رائے میں احترام کے ساتھ ساتھ اندازِ تحریر مہذب ہونا چاہیے۔ میرے دوست ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، جنھوں نے ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ کے نام خط لکھا ہے، اس میں انا زیادہ ہے اور توازن کی حد درجہ کمی ہے۔'' [۱۵]

۷/ نومبر ۲۰۱۸ء کو میرے نام ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

''چند ماہ قبل ٹیلی فون پر آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور 'گاندھیائی نظریۂ ہندوستانی' سے متعلق میں نے اظہارِ خیال کیا تھا۔ 'ہندوستانی' کے بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن میرے خیال میں اُردو اور ہندی کے قومی زبان بننے کے حوالے

سے یہ ایک سیاسی حل بھی تھا اور اس کی اپنی ایک معنویت ہے۔ کسی کو اگر اختلاف ہو تو اختلاف رائے مہذب طریقے سے کیا جاسکتا ہے تضحیک آمیز لہجے میں نہیں۔'' [۱۶]

'ہندوستانی' کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟

اس میں کوئی شک نہیں (بلکہ ہماری ڈیڑھ سو سالہ سیاسی اور ملّی تاریخ شاہد ہے) کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی تمام قومی اور سیاسی جدوجہد کے دوران اردو اور صرف اردو کو ہی بین العلاقائی اور بین الصوبائی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس نے سب کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرویا۔ محبت اور یگانگت کا سبق سکھایا۔ سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد، تحریکِ دیو بند، تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ ندوۃ العلماء، تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور تحریکِ اتحادِ عالمِ اسلامی، ان سب اسلامی تحریکوں میں ذریعۂ اظہار اردو ہی بنی رہی۔ مسلمانوں نے پشاور و کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور سندھ بلوچستان سے لے کر بنگال اور آسام تک اپنے قول و فعل سے اردو کی اس عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا ہے۔ اُردو ہندی تنازع کی شدت کے پیشِ نظر مہاتما گاندھی نے اس مسئلے کے سیاسی حل کے طور پر جب 'ہندوستانی' کا نام پیش کیا تو کچھ مسلم عمائدین بھی حکمت عملی بدلتے ہوئے اس حل کو قبول کرنے کی بابت سوچنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نام اس لیے بھی قابلِ قبول ہے کہ اس لفظ سے تمام ملک کی وسعت کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ اردو 'ہندوستانی' بن کر ملک کی عام زبان ہوگئی تو لسانی تنازع ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ 'ہندوستانی' کی یہ موسیقی ہلکے سُروں میں جاری رہی اگرچہ بہت سے عوامل کی وجہ سے اسے قبولِ عام نصیب نہ ہوسکا۔ جن عمائدین نے 'ہندوستانی' کا نعرہ نیک نیّتی سے لگایا، میرے نزدیک وہ تحسین کے لائق ہیں۔

'معارف' (اعظم گڑھ) کے بانی مدیر اور جانشینِ شبلی مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ساری زندگی اُردو کے حق میں لکھتے ہوئے گزاری مگر ایک حل کے طور پر 'ہندوستانی' کو قبول کرنے کے لیے وہ بھی تیار ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک 'معارف' (اعظم گڑھ) میں سیّد صاحب کے قلم سے 'ہندوستانی' کی بازگشت گونجتی رہی۔ ''ہندوستان میں ہندوستانی'' کے موضوع پر سیّد صاحب نے علی گڑھ میں ایک خطبہ دیا۔ بہ حیثیت مدیر، اس خطبے کی روداد 'معارف' کے شذرات میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی طلب اور اصرار پر ایڈیٹر 'معارف' [سید سلیمان ندوی] نے ۲۰ر مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم یونی ورسٹی کی انجمن اُردوئے معلیٰ میں

''ہندوستان میں ہندوستانی'' پر ایک خطبہ پڑھا۔ جلسہ کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی نے فرمائی۔ اس خطبہ میں ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ہمیں اپنی اس زبان کی اشاعت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آئندہ اس کو اردو کے بجائے ''ہندوستانی'' کے نام سے پکاریں۔ اُردو ایک نئی اصطلاح ہے جس کی عمر سوڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں اور جس میں کسی قسم کی وطنی وقومی جذبہ کی جھلک نہیں اور نہ تمام ملک کی وسعت کے تعلق کا اس لفظ سے اظہار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ''ہندوستانی'' جو اس کا صحیح ترین نام ہے، ان تمام جذبات اور خیالات کو حاوی ہے۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کا ''ہندوستانی'' نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے۔ خطیب [سیّد سلیمان ندوی] نے تاریخی حوالوں سے اس کو ثابت کیا کہ یہ قطعی غلط ہے اور کم از کم دسویں صدی کی تاریخوں میں انگریزوں کے اثر سے بہت پہلے اس زبان کا یہ نام پڑ چکا تھا۔'' [۱۷]

''علی گڑھ میں اُردو اجلاس'' کے عنوان سے سیّد صاحب لکھتے ہیں:

'''ہندوستانی' زبان کی ترقی و تحفظ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ۲۴-۲۵/ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں اُردو کانفرنس کے دو عام اجلاس اور ایک خاص مشاورتی جلسہ منعقد ہوا۔ بنگال، بہار، مدراس اور پنجاب کے متعدد اور صوبہ ہائے متحدہ کے اکثر اہلِ قلم و اہلِ ادب و اہل الرائے موجود تھے۔ 'ہندوستانی زبان' کو پورے ملک میں پھیلانے، بڑھانے اور ترقی دینے کی تجویزوں پر غور کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ انجمن ترقی اُردو کا مرکز دِلّی قرار دیا جائے اور سارے صوبوں اور دیسی ریاستوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں اور کوشش کی جائے کہ ہر صوبہ کے سرکاری دفتروں اور درس گاہوں میں 'ہندوستانی' کو وہ حیثیت دی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ دہلی میں ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا جائے۔'' [۱۸]

''ہندوستانی'' کے موضوع پر 'معارف' کے شذرات میں لکھتے ہیں:

'''ہندوستانی' کا لفظ دھیرے دھیرے ہندوستان کی ادبی فضا کو جیتتا چلا جاتا ہے۔

۱۹؍ جون کو بیز واڑہ (مدارس) میں مسلم یوتھ کانفرنس کی صدارتی تقریر میں مولوی عبدالحق نے فرمایا، 'اُردو یعنی ہندوستانی' ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے'۔ کانفرنس نے تجویز منظور کی کہ ایسے استادوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو جنوبی ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی تعلیم دے سکیں۔ 'ہمایوں' لاہور کے شریک مدیر اگست کے پرچہ میں لکھتے ہیں: 'اُردو کے بجائے ہندوستانی کا نام استعمال کرنے کے حامیوں کی یہ دلیل قابلِ توجہ ہے کہ جب ہم خود ہندوستانی کہلاتے ہیں کہ تو کیا وجہ ہے کہ اپنی زبان کے لیے اس لفظ کے استعمال کو عار سمجھیں۔ مسلمانوں کو حق نہیں ہے کہ وہ اسے ایک ایسے نام (یعنی ہندوستانی) سے محروم کرنے پر اصرار کریں جن سے اس کے ہندوستانیوں کا سرمایہ مشترک ہونے کا پتا چلتا ہو۔' ہمارے نزدیک 'ہمایوں' کا اس راہ میں یہ پہلا قدم ہندوستانی کے طرف داروں کے لیے 'فال ہمایوں' ہے۔''[۱۹]

''اُردو اور ہندی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ سب کو معلوم ہے کہ خاکسار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پُر زور حمایت کی تھی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک رہے اور جس کی صورت یہ تھی کہ ہمارے اُردو اور ہندی کے اہلِ قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے اور دونوں کوشش کرتے کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں مگر افسوس کہ یہ میری تحریک سیاسی وجوہ اور ذہنی تنگ نظری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔''[۲۰]

''ہندی اور ہندوستانی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اُردو ہندی کا قصّہ تو ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چکا۔ اب ہندی اور ہندوستانی کا قصہ چل رہا ہے۔ 'معارف' کے پرانے پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ میں نے سمجھوتے کے طور پر ہمیشہ ہی 'ہندوستانی' کی تائید کی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ 'ہندوستانی' کی تحریک چلانے والا اگر میں اکیلا نہیں تو اس کے چلانے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔''[۲۱]

'ہندوستانی' کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی کا نقطۂ نظر

ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب کا 'ہندوستانی' کے بارے میں تقریباً وہی نقطۂ نظر ہے جو ماضی میں سید سلیمان ندوی کا رہا ہے۔ ڈاکٹر دلوی صاحب ۲۹؍ مارچ ۲۰۱۸ء کو راقم کے نام اپنے ایک خط میں 'ہندوستانی' کی بابت اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ سے ٹیلی فون پر 'ہندوستانی' کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی۔ برصغیر کی آزادی سے قبل ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے اُردو، ہندی اور 'ہندوستانی' کے حوالے سے یہ مسئلہ قومی سطح پر زیرِ بحث تھا۔ ہندی والے ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتے تھے اور اُردو والے اُردو کے حق میں تھے۔ سیاسی اعتبار سے یہ ایک نزاعی مسئلہ تھا۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور کئی دیگر لیڈران 'ہندوستانی' کے حق میں تھے۔ 'ہندوستانی' کی یہ تجویز مہاتما گاندھی کی تھی۔ اگرچہ 'ہندوستانی' اور اُردو میں تاریخی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے تاہم 'ہندوستانی' سے اہلِ ہندی کو کد تھی۔ مہاتما گاندھی 'ہندوستانی' کے تعلق سے غیر سنسکرت آمیز ہندی اور غیر عربی فارسی آمیز اُردو کے مقابلے میں اپنا الگ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ اُردو اور ہندی دونوں 'ہندوستانی' کو پالنے والی بھاشائیں ہیں۔ انھوں نے ہندی اور اُردو دونوں کو قبول کیا تھا۔ وہ ان دونوں کی نفی نہیں کرتے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ 'ہندوستانی' اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ گاندھی جی نے اپنے 'ہندوستانی' نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا حالؔی کی دو نظموں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ایک 'مناجاتِ بیوہ' اور دوسری 'چپ کی داد'۔ وہ کہتے تھے کہ یہی تو ہندوستانی ہے۔ وہ اقبالؔ کے ترانۂ ہندی: سارے جہاں سے اچھا...... کو بھی ہندوستانی کا نمونہ کہتے تھے۔ 'ہندوستانی' کے حوالے سے گاندھی جی کا منشا 'ہندوستانی' کے زیرِ سایہ اُردو اور ہندی دونوں کو فروغ دینا تھا تاکہ ہندوستان کی لسانی یک جہتی قائم رہے۔

میں، بنیادی طور پر اُردو اور 'ہندوستانی' کو ایک ہی زبان سمجھتا ہوں۔ خود اُردو کا عاشق وشیدائی ہوں۔ اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ اُردو ہی کی خدمت میں گزارا ہے، تاہم میں ہر ہندوستانی زبان کے بارے میں اور ان زبانوں کی ترقی کے لئے محبت اور احترام کا جذبہ رکھتا ہوں اور چوں کہ اُردو اور ہندی کو بقول گاندھی جی 'ہندوستانی'

کو پالنے والی بھاشائیں سمجھتا ہوں لہٰذا میں آزادی سے پہلے کے اس مناقشے کو ایک سیاسی حل کے طور پر پسند کرتا ہوں۔ گاندھی جی کی 'ہندوستانی' کی تجویز اگرچہ سیاسی اعتبار سے کامیاب نہیں ہوسکی تاہم میں آزادی کے بعد کے نئے ہندوستان کے لئے صحیح سمجھتا ہوں۔ آج کی 'ہندوستانی' فلمیں جنھیں ہندی فلمیں کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ اُردو 'ہندوستانی' فلمیں ہی ہوتی ہیں جنھیں دنیا بھر میں لوگ دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ غالباً گاندھی جی کی نظر میں اسی طرح کی 'ہندوستانی' مقصود تھی۔ یہ ایک ایسا علمی مسئلہ ہے جس پر علمی اعتبار سے غور وفکر کی ضرورت ہے۔

میں بمبئی کے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کا بانی ڈائریکٹر رہا ہوں اور میں نے اس سینٹر کے بنانے میں گاندھی جی کے مطمحِ نظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے 'ہندوستانی' کے وسیع معنوں میں اُردو اور ہندی کو ساتھ ساتھ فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ چند سطریں آپ کے سوال کی وضاحت کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ علمی بحثوں میں اختلاف پائے جانے کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔'' [۲۲]

یکم اپریل ۲۰۱۸ء کو اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی بابت لکھتے ہیں:

''میں نے اس سے قبل گاندھی جی کے نظریۂ 'ہندوستانی' کے بارے میں اپنے خیالات لکھ بھیجے تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات محلِ نظر رہنی چاہیے کہ گاندھی جی کے نظریۂ 'ہندوستانی' کے تحت اُردو اور ہندی دونوں کا تحفظ شامل رہا ہے۔ وہ ہندوستانی سیاست کے وسیع النظر رہنما تھے۔ جہاں تک اُردو اور ہندی کا سوال ہے، پروفیسر مسعود حسین خاں کے خیالات آپ ملحوظِ نظر رکھیں، اُردو ہندی کے مسئلے پر میری اور مسعود حسین صاحب کی رائیں بھی مدنظر رکھیں تو اس سے بھی ہمارا لسانی نقطۂ نظر واضح ہوگا۔ غالباً یہ خطوط میں اس سے قبل آپ کو بھیج چکا ہوں۔ بہر حال علمی معاملات میں اختلافِ رائے ہوسکتا ہے، انکار نہیں کیا جاسکتا اور رایوں میں اختلاف کا احترام ضروری ہے۔ لیکن اختلافِ رائے میں احترام کے ساتھ ساتھ اندازِ تحریر مہذب ہونا چاہیے۔ میرے دوست ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ، جنھوں نے ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ کے نام خط لکھا ہے، اس میں انا زیادہ ہے اور توازن کی حد درجہ کمی ہے۔

میں رشید حسن خان صاحب اور پروفیسر مسعود حسین خان کے چند غیر مطبوعہ خطوط
بھی بھیج رہا ہوں۔ان خطوط کا تعلق مذکورہ 'ہندوستانی' کے بارے میں نہیں ہے بلکہ
یہ مختلف نوعیت کے ہیں۔امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔''[۲۳]

۷رنومبر ۲۰۱۸ء کو لکھے گئے خط میں 'گاندھیائی نظریۂ ہندوستانی' سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ذولسانی ہونے کی ضرورت اور لسانی یک جہتی کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ زبانوں کو وصل کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ فصل کا۔اُن کے نزدیک زبانوں کے وصل کا ایک اہم ذریعہ ترجمہ نگاری ہے:

''چند ماہ قبل ٹیلی فون پر آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور 'گاندھیائی نظریۂ ہندوستانی' سے متعلق میں نے اظہارِ خیال کیا تھا۔'ہندوستانی' کے بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن میرے خیال میں اُردو اور ہندی کے قومی زبان بننے کے حوالے سے یہ ایک سیاسی حل بھی تھا اور اس کی اپنی ایک معنویت ہے۔کسی کو اگر اختلاف ہو تو اختلاف رائے مہذب طریقے سے کیا جاسکتا ہے تضحیک آمیز لہجے میں نہیں۔
ہماری ہندوستانی اور پاکستانی زبانیں اکثر 'ہند آریائی' خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں جنوبی ہندوستان کی زبانیں دراوڑی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اتنی ہی ثروت مند ہیں جتنی یورپ کی زبانیں۔ ہم فرانسیسی، ہسپانوی اور جرمن زبانوں کے سیکھنے کے لئے تو ہمیشہ تیار رہتے ہیں لیکن اپنے پاس پڑوس کی زبانوں سے دور رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کثیر لسانی معاشرے میں ہم کو کسی حد تک ذُولسانی ہونے کی ضرورت ہے تا کہ برصغیر کی زبانوں میں ایک یک جہتی پیدا ہو۔
میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ زبانوں کو وصل کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ فصل کا۔ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جن زبانوں سے میری تھوڑی بہت بھی واقفیت ہے اُن کے اُردو میں ترجمے کروں۔ اِس سے ہمارا ادب ثروت مند ہو جاتا ہے۔ میں نے کلاسیکی مراٹھی اور جدید مراٹھی شاعری کے بھی کچھ ترجمے کیے جس کا اثر مراٹھی معاشرے پر بہت اچھا ہوا۔اسی طرح میں نے چند مراٹھی ناولوں اور کہانیوں کے بھی اُردو میں ترجمے کیے۔آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے مراٹھی کے ایک شاہکار

ڈرامے کا ترجمہ 'خاموش! عدالت جاری ہے' کے نام سے کیا ہے جوان شاء اللہ بہت جلد سامنے آئے گا۔

میں سنسکرت زبان سے واقف نہیں ہوں لیکن مشہور سنسکرت شاعر بھرتری ہری کے شلوکوں کے انگریزی ترجمے سامنے رکھ کر اور سنسکرت کے سکالروں کے ساتھ بیٹھ کر اصل سنسکرت شلوک پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اُن کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ شاید یہ کتاب آپ کی نظر سے گزری ہو جس کا نام ہے 'اقبال کا ایک ممدوح: بھرتری ہری' جس میں بھرتری ہری کے دوسو (۲۰۰) شلوکوں کے ترجمے ہیں اور میں نے بھرتری ہری کی شاعری کے اقبال کی شاعری پر اثرات کی بھی نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اصل زبان نہ جاننے کے باوجود، دوسری زبانوں کے حوالے سے ترجمے کو معیوب نہیں سمجھتا۔ اصل زبان سے اگر ترجمے کیے جائیں تو یہ ایک مستحسن عمل ہوگا۔ پروفیسر عزیز احمد نے 'Divine Comedy' کا ترجمہ 'طربیۂ خداوندی' لاطینی سے نہیں بلکہ شاید انگریزی ہی سے کیا ہے۔ روسی زبان کے بہت سارے تراجم انگریزی سے اُردو میں ہوئے ہیں اور کچھ روسی سے براہِ راست اُردو میں۔

میرا خیال ہے یہ خط طویل ہو گیا ہے اس لئے میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ سب بخیر ہوں گے۔ آج رات یہاں پر 'دیوالی' کے دیے جل رہے ہیں اور ہر طرف روشنی ہے۔ ترجمے دیوالی کے دیوں کی طرح روشنی پھیلانے کا کام کرتے ہیں۔ شاید آپ اس سے اتفاق کریں۔'' [۲۴]

حفیظ الرحمٰن احسن کی مرتب کردہ کتاب ''مشاہیرِ ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین'' کا مقدمہ، دسمبر ۲۰۱۸ء میں، ڈاکٹر دلوی صاحب نے لکھا۔ زیادہ تر خطوط کا مزاج چوں کہ لسانی ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے اُردو لسانیات کے تناظر میں بڑی اہم باتیں لکھیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں وسیع تر سیاق میں اپنے لسانی معاشرے کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ زبان کے معیار کو یک لسانی ماحول اور ذولسانی یا کثیر لسانی ماحول میں دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ زبان یا زبانیں سماجیاتی ضروریات کی مظہر ہیں اور اس لیے ان کا سماجی لسانیات سے گہرا رشتہ بھی ہے:

''شخصی بولی (Idiolect)، بولی (Dilect) اور معیاری زبان (Language) کے

تصورات ایک نہیں بلکہ الگ الگ ہیں، لیکن ان میں ایک گہرا رشتہ بھی ہے۔ جب ہم معیاری زبان کی گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں وسیع تر سیاق میں اپنے لسانی معاشرے کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ زبانیں اور بطور خاص کثیر لسانی یا کثیر تہذیبی ماحول کی زبانیں آسانی سے پاس پڑوس کی زبانوں کے اثرات غیر شعوری طور پر اپنا لیتی ہیں۔ زبان کے معیار کو یک لسانی ماحول اور ذولسانی یا کثیر لسانی ماحول میں دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ معیاری زبان کو بُت بنانا صحیح نہیں ہوگا۔ زبان میں لوچ کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ زبان میں معیار کو میں ایک تخمینی لیبل سمجھتا ہوں اور اس میں بہت زیادہ سختی برتنا کثیر لسانی اور کثیر تہذیبی ماحول کے لئے خطرناک رجحان کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اسی طرح صوتیات اور تجز صوتیات، جن کا تعلق عام صوتیات سے ہے، جب تک ان کی باقاعدہ تربیت نہ ہو تب تک ان کے مسائل کو سمجھنا مشکل ہے۔ تلفظ اور معیاری تلفظ کے مسائل کا بھی صوتیات ہی سے رشتہ قائم ہے۔ البتہ اُردو کے مسائل کو صوتیات کے مسائل سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے، اس لئے کہ املاء کا مسئلہ آوازوں کی تحریری علامتوں سے ہے، اس کا تعلق تجزیاتی یا توضیحی لسانیات سے نہیں ہے۔

زبان یا زبانیں سماجیاتی ضروریات کی مظہر ہیں اور اس لئے ان کا سماجی لسانیات سے گہرا رشتہ بھی ہے۔ اس موضوع پر اُردو میں، میں نے علمی اعتبار سے کچھ کام کیا ہے۔ زبانیں ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتی رہتی ہیں۔ زبانیں اور تہذیبیں کبھی خالص (Pure) نہیں ہوتیں۔ یوروپ کی زبانوں نے لاطینی اور یونانی زبانوں کے الفاظ جس طرح اپنے اندر جذب کیے ہیں اسی طرح عربی اور فارسی کے الفاظ بھی اس چابکدستی سے اپنا لیے ہیں کہ بسا اوقات اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ الفاظ کسی غیر زبان سے مستعار ہیں۔ جہاں تک ہندوستانی زبانوں کا تعلق ہے، اپنے تاریخی و تہذیبی پس منظر کی وجہ سے اُردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ مراٹھی اور گجراتی زبانوں پر ان زبانوں کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں، مراٹھی اور گجراتی زبانیں بولنے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہو

گا۔ البتہ مستعار الفاظ کی ہیئت اور معنی بھی بدل جاتے ہیں۔''[۲۵]

کچھ ماہرینِ لسانیات اور فاضل اساتذہ 'ہندوستانی' کے بارے میں پروفیسر دلوی صاحب کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ضروری نہیں کہ اس سلسلے میں پروفیسر دلوی صاحب کے ساتھ لفظ بہ لفظ اور بہ تمام وکمال اتفاق کیا جائے۔ اس میدان میں اختلاف، اتفاق سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلافِ فکر ونظر، غور وفکر کی نئی راہیں سُجھاتا ہے جب کہ کامل اتفاق ان راہوں کو مسدود کر دیتا ہے۔ بلا شبہ تحقیق کی شاہراہ پر اختلاف بھی شک وشبہ کی مانند بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ لسانی اور علمی معاملات میں اختلاف تو ضرور رہیں گے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب لوگوں نے یا تو پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے اصل بات یہ نہیں کہ اختلاف ہے یا نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سنجیدگی سے سمجھنا، اتفاق واختلاف میں حد درجہ توازن اور اعتدال اختیار کرنا ناگزیر ہے وگرنہ ان لسانی معاملات اور دیگر علمی مسائل کو سمجھنے میں دِقت پیش آ سکتی ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ۝ سورہ الروم:۲۲۔
(اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لیے)۔

۲۔ مرزا خلیل احمد بیگ، پروفیسر، مکتوب بنام پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ مشمولہ صحیفہ مکاتیب نمبر حصہ دوم (لاہور۔ مجلس ترقی ادب جنوری-جون ۲۰۱۷ شمارہ ۲۲۸-۲۲۹) ص ۳۵۰۔

۳۔ رشید حسن خان: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: دہلی (انڈیا): ۴؍جولائی ۱۹۹۵ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۴۔ ....ایضاً.......................:۲۷؍جولائی ۱۹۹۵ء:.......................ایضاً........................

۵۔ مسعود حسین خان، پروفیسر: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: علی گڑھ (انڈیا): ۹؍نومبر ۱۹۹۱ء: مملوکہ غازی علم الدین۔

۶۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ (سابق صدر، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔ انڈیا)۔

۷۔ مسعود حسین خان، پروفیسر: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: علی گڑھ (انڈیا): ۱۷؍اکتوبر ۲۰۰۷ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۸۔ ڈاکٹر رفیق زکریا: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: ممبئی (انڈیا): ۴؍فروری ۱۹۹۱ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۹۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: اعظم گڑھ (انڈیا): ۴؍مارچ ۱۹۸۱ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۱۰۔ صفدر آہ: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: ورجیش وری (انڈیا): ۳؍جولائی ۱۹۷۶ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۱۱۔ مشفق خواجہ: مکتوب بنام عبدالستار دلوی، پروفیسر: کراچی (پاکستان): ۸؍اپریل ۱۹۹۹ء: مملوکہ غازی علم الدین، پروفیسر۔

۱۲۔ عبدالستار دلوی، پروفیسر: مکتوب بنام غازی علم الدین: ممبئی (انڈیا): ۲۹؍جنوری ۲۰۱۸ء: مملوکہ مکتوب الیہ

۱۳۔ ....ایضاً......................:۲۹؍مارچ ۲۰۱۸ء:........................ایضاً........................

۱۴۔ مرزا خلیل احمد بیگ، پروفیسر، مکتوب بنام پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ مشمولہ صحیفہ مکاتیب نمبر حصہ دوم (لاہور۔ مجلس ترقی ادب جنوری- جون ۲۰۱۷ء شمارہ ۲۲۸-۲۲۹) ص ۳۵۰۔

۱۵۔ عبدالستار دلوی، پروفیسر: مکتوب بنام غازی علم الدین: ممبئی (انڈیا): یکم اپریل ۲۰۱۸ء: مملوکہ مکتوب الیہ۔

۱۶۔ ....ایضاً......................:۷؍نومبر ۲۰۱۸ء:........................ایضاً........................

۱۷۔ سید سلیمان ندوی، شذرات، مشمولہ ''معارف'' (دارالمصنّفین اعظم گڑھ) بابت اپریل ۱۹۳۳ء بحوالہ 'معارف' شذرات نمبر خصوصی شمارہ (حصہ اوّل) جلد ۱۹۷ عدد ۶، ص ۷۶-۷۷۔

۱۸۔ ....ایضاً......................ص ۸۷۔

۱۹۔ ....ایضاً......................ص ۸۸-۸۹۔

۲۰۔ ....ایضاً......................ص ۹۸۔

۲۱۔ ....ایضاً......................ص ۱۰۸۔

۲۲۔ عبدالستار دولوی، پروفیسر: مکتوب بنام غازی علم الدین: ممبئی (انڈیا): ۲۹؍مارچ ۲۰۱۸ء: مملوکہ مکتوب الیہ۔

۲۳۔ ....ایضاً......................: یکم اپریل ۲۰۱۸ء:........................ایضاً........................

۲۴۔ ....ایضاً......................:۷؍نومبر ۲۰۱۸ء:........................ایضاً........................

۲۵۔ عبدالستار دلوی پروفیسر، مقدمہ مشمولہ مشاہیرِ ادب کے خطوط بنام غازی علم الدین (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۹ء) ص ۷۔

میرے خیال میں یہ کتاب اس اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اردو کی معیار بندی کی میزان فراہم کرتی ہے اور قواعد و ماخذ کے اعتبار سے زبان کے درست استعمال پر اصرار کرتی ہے۔ جہاں زبانوں کے ارتقا کے لیے ان میں آنے والی تبدیلیاں فطری ہوتی ہیں، وہاں معیاری زبان کے استعمال پر زور دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں قوتوں کے متوازن عمل ہی سے زبانیں فروغ اور ارتقا کا راستہ طے کرتی ہیں۔ ان مضامین کی زبان نہ صرف آسان اور عام فہم ہے بلکہ ادبیت کی حامل بھی ہے۔ کہیں کہیں تو ایسے اقتباس ملتے ہیں جو ذہن کے پردے پر ایک متحرک اور رنگ رنگیلی تصویر بنا دیتے ہیں۔

اس کتاب میں املا، تلفظ، تراکیب اور محل استعمال کی جتنی اغلاط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر اس کتاب کو کسی نصاب کا حصہ بنا دیا جائے تو اردو کی معیار بندی کا یہ مشکل مرحلہ، جس سے ہماری قوم کئی دہائیوں سے نبرد آزما ہے، چند برسوں میں حل ہو جائے گا۔ میں اسے ایک طرح سے فرض کفایہ سمجھتی ہوں جو پروفیسر غازی علم الدین نے اردو کے تمام اساتذہ اور علما کی طرف سے سر انجام دیا ہے اور اس کاوش پر وہ نہ صرف داد و تحسین، بلکہ ہم سب کے شکریے کے بھی مستحق ہیں اور کم از کم میں یہ وعدہ ضرور کرتی ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اسے اپنی جامعہ کے زبان سے متعلق نصابات کا حصہ بنانے کی ضرور سفارش کروں گی۔

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
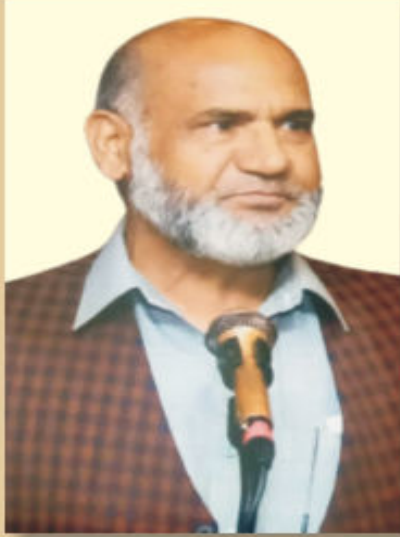
نام	غازی علم الدین
پیدائش	یکم جنوری ۱۹۵۹ء
فارغ التحصیل	اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور
مصروفیت	تدریس (کلیاتی و جامعاتی سطح پر)
	پرنسپل (ریٹائرڈ)
تحریر و تخلیق کا میدان	لسانیات، تحقیق، تنقید اور ادارت
پتا	مکان نمبر ۲۰۳، سیکٹر ایف ون، میرپور، آزاد کشمیر
رابطہ	0345-9722331
برقی پتا	prof.ghaziilmuddin@gmail.com

تصانیف:

- میثاقِ عمرانی — نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
- لسانی مطالعے — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
- تنقیدی و تجزیاتی زاویے — بزمِ تخلیقِ ادب، کراچی
- تخلیقی زاویے — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- لسانی زاویے — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- اُردو کا مقدمہ — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- میزانِ اِنتقادِ و فکر — مثال پبلشرز، فیصل آباد

Misaal Publishers
misaal.publishers
+92-300-6668284
misaalpb@gmail.com